تحریک احیائے اسلام کے
آٹھ درخشندہ ستارے

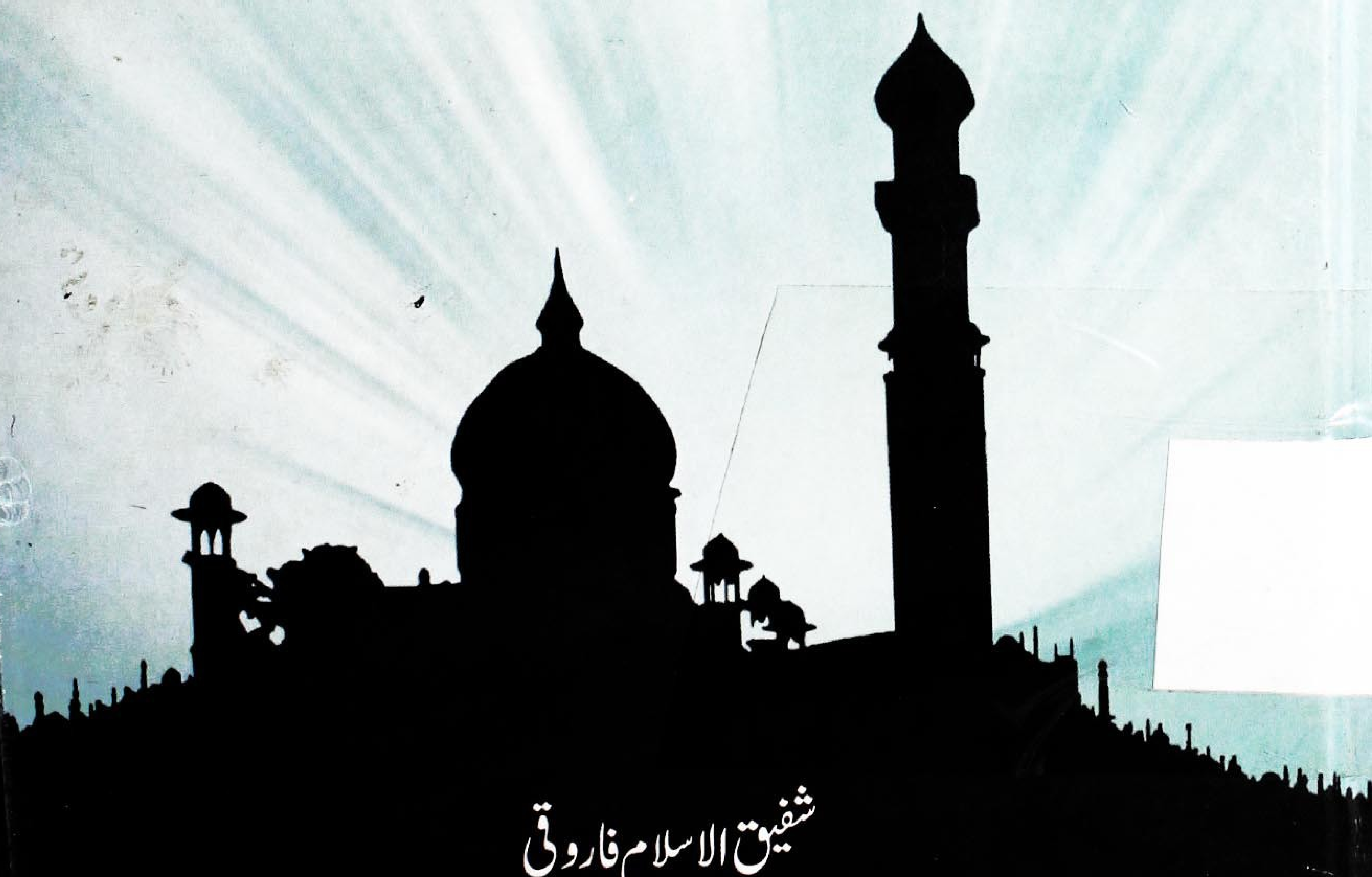

شفیق الاسلام فاروقی

Marfat.com

Marfat.com

تحریک احیائے اسلام کے

آٹھ درخشندہ ستارے

شفیق الاسلام فاروقی

ادارہ سحر پبلی کیشنز
منصورہ۔ ملتان روڈ لاہور
فون 042-35435667,0321-4708024

Marfat.com

297.9924
21 ف
ش
110477

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تحریک احیائے اسلام کے آٹھ درخشندہ ستارے

تالیف : شفیق الاسلام فاروقی

ناشر : عباس اختر اعوان

منتظم اذان سحر پبلی کیشنز، منصورہ۔ ملتان روڈ لاہور

اشاعت اول : ذی قعد 1432ء۔ ستمبر 2011ء

مطبع : رانا پرنٹرز، لاہور

قیمت : 360 روپے

ملنے کے پتے:

- ......دی بک ڈسٹری بیوٹرز، کراچی، 021-2787137
- ......مسٹر بکس، سپر مارکیٹ، اسلام آباد فون 051-2278843,2278845
- ......ابوالحسین، کتاب مرکز، گارڈن کالج روڈ، راولپنڈی 0333-5174525
- ......علی بک شاپ، کمیٹی چوک راولپنڈی 5530352
- ......احمد بک کارپوریشن، کمیٹی چوک راولپنڈی
- ......اولڈ بک کارنر پیرس پلازہ کمرشل مارکیٹ' راولپنڈی 4421666
- ......مکتبہ تبلیغ اسلام، الاکرام بلڈنگ راولپنڈی 5962137
- ......النور اسلامک بکس۔ سنگاپور پلازہ۔ صدر۔ راولپنڈی 5794605
- ......ادارہ تطہیر افکار، جی ٹی روڈ، پشاور۔ 091-262407

Marfat.com

فہرست

...... پیش لفظ 6
۱ سید جمال الدین افغانیؒ (از قلم: نکی آر کیڈیا) 41
...... سید صاحب کے اپنی حیات فانی اور بعد میں حیرت انگیز اثرات 52
۲ محمد عبدہٗ (از قلم یونی حداد) 57
...... آپ کی زندگی 58
...... آپ کی ابتدائی زندگی اور امت مسلمہ کے مسائل 62
...... مصر کے مسائل کے حل میں محمد عبدہٗ کا نکتۂ نظر 64
...... قرآن کریم عوام کے دلوں کی آواز ہے 76
...... شعبہ تعلیم میں کردار 80
...... اصلاحات کے بارے میں جناب عبدہٗ کی فکر 86
...... شعبہ سیاست 89
...... حقوق نسواں 94
...... آپ کی وفات 102
۳ جناب حسن البنا شہیدؒ (ڈیوڈ کامنز) 103
...... تحریک کا آغاز کیسے ہوا؟ 104
...... اندرون مصر یورپی کارستانیوں کی تاریخ 105
...... بیسویں صدی کا پہلا ربع، مصری زندگی کا معاشرتی بگاڑ 109

Marfat.com

...... جناب حسن البنا شہیدؒ کی زندگی کے بارے میں حرف آخر 143

۴ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (از قلم سید ولی نصر) 147

...... سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شخصیت اور آپ کی جماعت اسلامی کے اثرات 152
...... مولانا مودودیؒ کی زندگی، تعلیم اور تحریک احیائے اسلام 152
...... مولانا مودودیؒ کی فکر اسلامی اور نظریات کا جائزہ 165
...... جماعت اسلامی کا قیام 172
...... جماعت اسلامی کا ڈھانچہ 174
...... جماعت اسلامی کی تاریخ اور اس کا سیاست میں دخل 176
...... جماعت اسلامی کے ڈھانچے میں تبدیلی اور تسلسل 186

۵ آیت اللہ روح اللہ خمینی (از قلم: باقر معین) 188

...... امام خمینی کی تعلیم 191
...... انسان کامل کی تلاش میں 194
...... تصوف اور امام خمینی 197
...... سیاست میں دلچسپی 204
...... امام خمینی بطور حکمران 222

۶ سید قطب شہیدؒ (از قلم: چارلس ٹرپ) 230

...... سید قطبؒ کی زندگی کا کردار اور تحریریں 232
...... سید قطب شہیدؒ کی تصانیف کا اثرات 256
...... حرف آخر 261

۷ موسیٰ الصدر (از قلم: آگسٹس رچرڈ نورٹن) 264

Marfat.com

...... شیعیت تاریخ کی بنیادیں 268
...... شہادت امام حسینؑ 271
...... اسلامی ممالک اور شیعہ تحریکیں 273
...... شیعیت میں سیاسی نظریہ کی تجدید 273
...... موسیٰ الصدر کی شخصیت 277
...... موسیٰ الصدر کا انداز سیاست 282
...... امام الغائب 290
۸ ڈاکٹر استاذ علی شریعتیؒ (از قلم: علی رہنما) 294
...... خاندانی پس منظر 295
...... ڈاکٹر علی شریعتی کا بچپن اور نوجوانی 298
...... علی شریعتی کی سیاسی وراثت 304
...... یونیورسٹی کا زمانہ 307
...... ایام پیرس 308
...... وطن واپسی 320
...... پہلا دور، غیر واضح فکر اور مایوسی 321
...... دوسرا دور، ایک نئی اسلامی راہ عمل 323
...... تیسرا دور، اصول محاذ آرائی... 332
...... چوتھا مرحلہ: خاموشی اور قید و بند 337
...... پانچواں مرحلہ، آپکی تنہائی اور حکومت کا رویہ 339
...... ہجرت اور وفات 344

Marfat.com

پیش لفظ

شفیق الاسلام فاروقی

میں امریکہ کچھ دن کیلئے اپنے بیٹے کے پاس جو یہاں میڈیکل ڈاکٹر ہے اور اب بمعہ اہل وعیال یہاں آباد ہو گیا ہے، آیا ہوا تھا اور ایک بک سٹال پر میری نظر ایک ضخیم انگریزی کتاب Pioneers of Islamic Revivalism پر پڑ گئی جسے میں نے اپنے علمی اور سیاسی ذوق کے مطابق پایا اور خرید لیا۔ یہ کتاب بڑے محقق اور دانشور جناب علی رہنما کی انتہائی علمی کاوش ہے جسے نیویارک کے ایک پبلشنگ ادارے نے شائع کیا ہے اور نیویارک کے علاوہ ملائیشیا، لندن، لبنان، مصر، بحرین، اُردن، کویت، قطر، سعودی عرب وغیرہ کے بھی بعض پبلشنگ اداروں نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

دورِ حاضر کی احیائے اسلام کی مالک جن چیدہ شخصیتوں کا جناب علی رہنما نے انتخاب کیا ہے، ان کے نام اور ان کے حالات زندگی اور فکر مرتب کرنے والوں کے نام ذیل میں دیئے جا رہے ہیں:

۱)	جناب سید جمال الدین افغانیؒ	Nikki R. Keddia (خاتون)
۲)	شیخ محمد عبدہؒ (مصری)	Yuonne Haddad (خاتون)
۳)	سید مودودیؒ (پاکستان)	Syed Vali Reza Nasr
۴)	حسن البناء شہیدؒ (مصر)	David Commins
۵)	علامہ خمینیؒ (ایران)	Baqer Moin

Marfat.com

٦) سید قطب شہیدؒ (مصر) Charles Tripp

٧) موسیٰ الصدرؒ (لبنان) Angus Richard Norton

٨) علی شریعتیؒ (ایران) Ali Rahnema

علی رہنما شیعی مذہب کے معلوم ہوتے ہیں مگر شیعہ/سنی کی تفریق کے بغیر آپ نے خود اپنے اور مغربی سکالرز کے تعاون سے دورِ حاضر میں مغربی تہذیب اور مغربیت کے خاتمہ اور ''احیائے اسلام'' پر روشنی ڈالی ہے اور اسکے ساتھ کتاب کے پیش لفظ میں اٹھارہویں، انیسویں او ربیسویں صدی عیسوی کے نصف یعنی دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ تک زوالِ اُمتِ مسلمہ کے اسباب کی نشاندہی کے ساتھ انیسویں صدی میں تحریک ''احیائے اسلام'' کی دو عظیم شخصیتوں سید جلال الدین افغانی '' اور مصری عظیم شخصیت شیخ محمد عبدہ '' کا یک جا ہو کر تحریک کے لئے فضا ہموار کرنا معلوم ہوتا ہے، اپنی جگہ یہ معلومات مجھے تحریک احیائے اسلام کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی پہلی مرتبہ حاصل ہوئی ہیں۔

البتہ میرے لئے یہ امر حیران کن ہے کہ یہ پیش لفظ جو ٦٧ صفحات پر مشتمل ١٦ پیراگراف کا ہے، اسکے ہر صفحہ میں اغلاط کی بھرمار ہے، جبکہ یہ زیرنظر کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو ٢٠٠٥ء میں دس کے قریب ممالک سے شائع ہوا ہے، حالانکہ پہلے ایڈیشن میں بھی کوئی اغلاط نہیں ہونی چاہئیں تھیں، لیکن بفرض محال اگر پہلے ایڈیشن میں چند اغلاط واقع ہوگئی تھیں تو دوسرا ایڈیشن اغلاط سے پاک ہونا چاہئے تھا لیکن چہ جائیکہ چند اغلاط، ٦٧ صفحات کے پیش لفظ کے ہر صفحہ میں اغلاط کی اتنی بھرمار ہے کہ میرے مطالعہ میں، بین الاقوامی سطح پر انگریزی زبان میں شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب آئی ہے جس پر میں نے اپنے ٩ جون کے ذاتی خط میں پبلشر اور مصنف دونوں کو پوری پروف ریڈنگ کر کے اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔

ایک جگہ پر پیش لفظ میں آپ نے اُمت مسلمہ کے زوال کے ذیل کے چار بنیادی اسباب بیان کئے ہیں:

١) اسلامی اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمان حکومتوں کا اپنی حکومتوں میں

Marfat.com

اسلام کے سماجی، اقتصادی اور دینی احکامات کی تعمیل میں غفلت۔

۲) اس معاملہ میں مسلمان علماء کا حکمرانوں کو توجہ دلانے کی بجائے خاموشی اختیار کرنا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ تعاون کرنا۔

۳) حکمران طبقات اور ان کے خاندانوں کی بدعنوانیاں اور بدکرداریاں۔

۴) آخری طبقہ کا غیر مسلم اور سامراجی طاقتوں کے ساتھ تعاون اور اپنی بقاء کا انحصار۔

پیش لفظ کے ایک باب میں برصغیر ہند میں انگریزوں کی آمد، فتوحات، جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں غدر کے نام سے اسلامی حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوئی۔ اس ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں مختلف مسلمان طبقہ ہائے فکر جن میں بعض انگریزوں اور انگریز حکومت کے اسلام کی روشنی میں سخت حامی ہیں، بعض سخت خلاف، بعض درمیانی راہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ باب میرے نزدیک انتہائی اہم ہے جو آج کے حالات پر منطبق نظر آتا ہے جس کا میں ذیل میں تفصیل سے ذکر کروں گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ۱۶۰۰ء میں برطانوی ملکہ ایلزبتھ اول کے عہد میں ایک سرکاری حکم کے تحت غیر ملکی تجارت کی حیثیت میں قائم ہوئی تھی، جب کہ برصغیر میں یہ دور مغلیہ حکومت کا دور تھا اور شہنشاہ جہانگیر کا ۲۷-۱۶۰۵ کا سنہری دورِ حکومت تھا اور مغلیہ حکمران بین الاقوامی تجارت بالخصوص یورپیوں کے ساتھ تجارت کے بڑے دلدادہ تھے، جو اس سرزمین پر برطانوی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کو ایک دوسرے کی حریف تجارتی کمپنیوں کو لائی اور ان دونوں کے درمیان اپنی بالادستی کے لئے باہمی جنگ وجدل کا سلسلہ بھی جاری رہا، جس میں بالآخر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی جنگی مہارت اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ سیاسی حکمت عملی میں برتری کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ صرف کامیاب تجارت کا سلسلہ قائم کیا بلکہ بندرگاہوں میں اپنے جنگی سازوسامان کے ساتھ ڈیرے ڈال دیئے اور دولت کے پجاری مغل حکومت کے گورنروں اور عہدیداروں کے ساتھ اُن کی جگہ لینے کے لئے تعلقات قائم کئے کہ ان کی سربراہی میں ان کی اولاد ان کی وارث ہوگی۔

Marfat.com

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مغلیہ حکومت (۱۶۵۸، ۱۷۰۷) کے آخری کامیاب حکمران تھے، جن کی نصف صدی کی حکومت اندرونی بغاوتوں، بالخصوص مرہٹوں کی بغاوت ختم کرنے میں گزری۔ آپ کی خدمات کے بعد ہر مغلیہ حکومت خلفشار کا شکار ہوگئی، ہر صوبہ کا گورنر، صوبیدار ماسواء برائے نام مرکزی حکومت کے تابع ہونے کے اپنے صوبہ کا آزاد اور خود مختار حاکمیت کا دعویدار ہوگیا۔ بالخصوص بنگال، اودھ، حیدرآباد دکن اور میسور جن کے حاکم مسلمان تھے، اور برصغیر کے بڑے صوبوں میں ان کا شمار تھا، ان کا دہلی کی مرکزی حکومت سے رشتہ بالکل منقطع ہوگیا اور ان صوبوں کے گورنر اپنے اپنے صوبوں میں خود مختار ہوگئے، لیکن ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حاکمیت کی صلاحیتوں سے محروم تھے اور اپنے گرد ایسے خوشامدیوں کے ٹولے جمع کیے جو ان سے بڑھ کر دولت کے حریص، علم وحکمت سے عاری تھے، اس کے علاوہ کوئی ایسی فوجی طاقت اپنی حاکمیت قائم وجاری رکھنے کیلئے تیار نہ کی جسکے سپہ سالار کی وفاداری شک وشبہ سے بالاتر ہو۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۸۵۷ء کے ڈیڑھ صدی کے عرصہ تک علماء کرام کا طبقہ ہی بالکل ناپید ہے، جو دہلی کی مرکزی حکومت کو اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دلاتا۔ یہی وہ دور ہے جس میں محمد شاہ رنگیلا جیسے حکمران بھی دہلی کی حکومت پر جلوہ گر ہو کر عیش وعشرت کی داستانیں مرتب کر گئے۔ آخری حکمران بہادر شاہ ظفر کی مجلسیں اپنے دور کے نامور شعراء سے آباد رہتی تھیں، لیکن حکومت کی ڈوبتی کشتی کو نہ صرف بچانے والا کوئی عالم اور صاحبِ حکمت سامنے آتا ہے، بلکہ اغیار کے ہاتھوں کشتی ڈبونے میں عجلت اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

اس کتاب کے مصنف جناب علی رہنما نے نام لئے بغیر میر جعفر کی غداری سے ۱۷۵۷ء میں بنگال میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ کی شکست، ایسٹ انڈیا کمپنی کے رابرٹ کلائیو کا بنگال کی حکومت سنبھالنے کے واقعہ سے لے کر پوری ایک صدی بعد ۱۸۵۷ء میں مغلیہ حکومت کے آخری حکمران ابوظفر بہادر شاہ کی شکست اور اس دوران مختلف طبقات کے علماء کرام کا انگریزی حکومت کے بارے میں اپنے اپنے افکار اور عملی جدوجہد بیان کی ہے۔ ذیل میں انہیں بیان کیا جاتا ہے۔ اس ڈیڑھ صدی کے طویل عرصہ میں عالم اسلام میں کہیں بھی مجموعی طور پر

Marfat.com

احیائے اسلام کی تحریک کا دور دور بھی وجود نظر نہیں آتا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، جنوبی ہند میں حیدر آباد (دکن) اور میسور دو بڑے صوبے تھے، جن کے گورنر مسلمان تھے، میسور کا دارالحکومت سرنگا پٹم کی بندرگاہ تھی، پلاسی کی جنگ میں کامیابی کے بعد انگریزوں کا نشانہ میسور کی ریاست تھی، جسے انگریزوں کی اپنی حریف یورپی طاقت فرانس کی حمایت حاصل تھی۔ جب کہ اس ریاست پر قبضہ کئے بغیر انگریز برصغیر میں اپنے قدم آگے نہیں بڑھا سکتے تھے، جب کہ حیدر آباد (دکن) جو رقبہ کے لحاظ سے زیادہ بڑی ریاست تھی، اسے صوبہ کہا جائے یا ریاست، اس کے صوبیدار کو نظام کا لقب دیا گیا تھا لیکن یہ ایسی ریاست تھی جو چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی اور اس کی براہِ راست جنوبی ہند کی کسی سمندری بندرگاہ تک رسائی نہ تھی لیکن ان دونوں صوبوں یعنی میسور اور حیدر آباد دکن کا باہمی طور پر کوئی تصادم نہ تھا، ماسوائے اس کے کہ انگریز سرنگا پٹم کی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کے لئے میسور کی ریاست کے نواب حیدر علی سے برسرِ پیکار تھے، جسے فرانس کے نامور بادشاہ نپولین بوناپارٹ کی جنگی اسلحہ کی مدد حاصل تھی۔

چنانچہ برطانیہ نے میسور کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے نظام حیدر آباد (دکن) کو یہ دانہ ڈالا کہ اگر وہ حیدر علی کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دے، تو برطانیہ حیدر آباد (دکن) کی ریاست پر اس کا اور اس کے خاندان کا قبضہ ہمیشہ کے لئے تسلیم کر لے گا۔ یہ وہ دور تھا کہ سلطنت مغلیہ کے یہ صوبائی گورنر اپنے اپنے صوبوں پر اپنے خاندانوں کی وراثتی حکومت قائم رکھنے کی خاطر باہر سے آنے والے اغیار کی تابعداری اور وفاداری میں ایسے غرق ہوئے کہ وہ صرف نام کے مسلمان رہ گئے، پھر ان کے مشیر بھی ایسے ہی تھے، جو ان کو یہ مشورہ دینے کی جرأت سے محروم تھے کہ کفار اور اغیار کی کسی صورت میں بھی مدد کرنا کھلی اسلام دشمنی ہے۔ بہر حال حیدر آباد دکن کی فوجی امداد کے باوجود نواب حیدر علی نے انگریزوں کو اپنے خلاف دونوں جنگوں میں شکست دی، اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو سلطان بھی بڑا بہادر اور خوددار تھا، اس نے بھی انگریزوں کو میسور کی تیسری جنگ میں حیدر آباد دکن کی مدد کے باوجود شکست دی۔ لیکن ۱۷۹۹ء کی آخری اور چوتھی جنگ میں جب انگریزوں نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا، ٹیپو سلطان کے مشیر میر صادق بنگال

Marfat.com

کے غدار میر جعفر کی مثال دہراتے ہوئے ٹیپو سلطان کی شکست کا باعث بنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صادق کی غداری نظام حیدر آباد دکن کی سازش کا نتیجہ تھی، لیکن ٹیپو سلطان کی شکست نے تمام برصغیر پر انگریز حکمرانی کے دروازے کھول دیئے۔ ریاست میسور بھی براہِ راست انگریزی عمل داری میں آ گئی۔ نظام حیدر آباد (دکن) کا خاندان ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان تک انگریزوں کے یارِ وفادار کے طور پر ریاست کا حکمران رہا۔

یہ تھے برصغیر ہند پر انگریزوں کی یورپی نو آبادیاتی، پختہ، باشعور طاقت کے تمام برصغیر کی حکمرانی سنبھالنے تک کے واقعات۔ جن میں بنگال میں ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں حکومت مغلیہ کے گورنر سراج الدولہ کے میر جعفر کی غداری، ریاست میسور کے گورنر نواب حیدر علی اور بعد ازاں اس کے نامور بیٹے ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے خلاف چار جنگیں، لیکن حیدر آباد دکن کے گورنر نظام حیدر آباد کا اپنے مسلمان بھائی کی ریاست میسور کے گورنر کے خلاف ایک کافر، ہزاروں میل دور ملک کی فوجی مدد سمیت ہر طرح کی مدد کرنا تمام برصغیر پر حکمرانی کا باعث بنا۔ جبکہ اول الذکر ریاست کا مؤخر الذکر کے ساتھ نہ کوئی تنازعہ تھا اور نہ کوئی مطالبہ، ماسوائے اس کے کہ مؤخر الذکر دشمن کافر ملک کی کسی قسم کی مدد سے ہاتھ اُٹھا لے اور اپنے ہاں کسی طرح کی جگہ نہ دے، ورنہ عزت اور خود مختاری کی بجائے ذلت کے ساتھ ہمہ وقت سجدہ ریزی مقدر بن جائے گی اور بالآخر یہی ہوا کہ ۱۷۵۷ء میں اوّلاً میر جعفر کی غداری کی وجہ سے اگلے ۴۲ سال کے عرصہ میں بظاہر سلطنت مغلیہ کے گورنر کی حیثیت میں لیکن فی الحقیقت حکمت و تدبر اور آزادی کی سوچ و فکر سے عاری ایک غلامانہ فکر کے حامل ایک حاکم کا بظاہر مسلمان ہونے کا دعویدار لیکن فی الحقیقت ایک منافق کا کردار، جس کی وجہ سے ہزاروں میل سے آئی ہوئی ایک ایسی قوم کو جس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ برصغیر کی سرزمین پر قدم نہ رکھا تھا، بلکہ اپنی چالبازیوں سے تمام برصغیر پر اپنی حکومت کے دروازے کھول لیئے، جہاں ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شکست اور شہادت نے اس قوم کو جنوبی ہند کی بڑی ریاست میسور کا حکمران بنا دیا، وہاں پڑوسی ریاست کے حاکم نظام حیدر آباد (دکن) نے یارِ وفادار کہلانے کے شوق میں اس قوم کو تمام برصغیر کی حکمرانی کا بہ آسانی موقع

Marfat.com

بخشا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی غدر کے نام سے چند ہزار ہندو مسلمانوں کی مشترکہ بغاوت جو چودہ ماہ جاری رہی اور ۱۸۵۸ء میں تاج برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ خود برصغیر کی حکومت سنبھال لی۔ مغل حکمران ابوظفر بہادر شاہ کے بیٹوں کو قتل اور خود بہادر شاہ کو حکومت سے محروم کر کے رنگون میں قید کر دیا، اور دہلی کو برطانوی برصغیر کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اس دور میں یہ قوم رُوس کو اپنی حریف طاقت سمجھتی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کے پڑوسی ملک افغانستان پر بھی قبضہ کر لے، جسکے لئے ایک بڑی فوجی طاقت کی ضرورت تھی۔ جب یہ قوم افغانستان کو پس ماندہ ملک خیال کر کے اس حُسنِ ظن کا شکار تھی کہ اس ملک سے کسی راست اقدام کی ضرورت نہیں، چنانچہ اس نے اِس حُسنِ ظن کا شکار ہو کر اپنی ۱۷ ہزار انگریز فوج ۱۸۳۸ء میں بظاہر پس ماندہ لیکن فی الحقیقت ایک ایسی آزاد منش قوم کے درمیان بھیج دی، جہاں اس وقت میرے خیال میں کوئی بادشاہت ہی کیوں نہ ہو اور یہ فوج اس بادشاہ سے کوئی معاہدہ کر کے افغانستان گئی ہو۔ اگر اس وقت کوئی بادشاہت ہوتی اور کسی معاہدہ کے تحت اس سرزمین پر اُتری ہوتی، تو اس کا وہ حشر نہ ہوتا جسے بین الاقوامی تاریخ کا قابل ذکر اہم ترین واقعہ قرار دیا جائیگا جسکی کوئی نظیر نہیں۔ یہ ۱۷ ہزار فوج جو اس ملک میں اپنے رسم و رواج کے مطابق وہاں کئی ماہ مقیم رہی، وہاں اس قوم کو کوئی میر جعفر تو در کنار، جس نے بطور ایک غدار ایک کافر کے چند صد افراد کے آگے اپنی بڑی فوج کے ہتھیار ڈلوا دیئے، یہاں اس قوم کو ایک مخبر بھی نہ ملا، جو اس بڑی فوج کے کسی سربراہ یا عہدیدار کو خبر دیتا کہ تمہارے ساتھ کیا عظیم سانحہ پیش آنے والا ہے۔ وہ کون آزادی کے دلدادہ لوگ تھے، جنہوں نے صرف چار دن کے اندر پوری ۱۷ ہزار فوج کا ایسا قتل عام کیا، جسکی نظیر نہیں ملتی۔ اور ڈاکٹر مارٹن کے نام سے صرف ایک انگریز زندہ چھوڑا کہ وہ انڈیا جا کر اپنے وائسرائے کو اطلاع دیدے کہ اس واحد شخص کو اطلاع دینے کیلئے زندہ بھیجا گیا ہے۔

انگریز فوج کا افغان قوم کے ہاتھوں یہ حشر ضمناً، برسبیل تذکرہ کیا گیا ہے، جب کہ اصل مقصد ۱۸۵۷ء کے بعد تا حال انڈیا اور دیگر اسلامی ممالک میں مختلف نظریہ ہائے فکر اور احیائے اسلام کی تحریکوں کا ذکر کرنا مقصود ہے جس میں اوّلاً انڈیا میں مسلمانوں میں مختلف نظریات کا بیان کیا جانا ہے۔

دراصل برصغیر ہند میں مسلمانوں کی حکومت شہاب الدین غوری کے دور سے مغلیہ

Marfat.com

سلطنت کے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت ۱۱۹۲ء تا ۱۷۰۷ء، پانچ صدیوں، کے عرصہ پر محیط ہے جبکہ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ خاندان میں مرحوم کے ورثاء میں کوئی ایسا مضبوط کردار کا مالک نہ رہا، جو بنگال، حیدرآباد دکن، میسور، اودھ، پنجاب جیسے بڑے صوبوں کے صوبیداروں پر دہلی میں مرکزی حکومت کے ماتحت اپنا رُعب و دبدبہ قائم رکھ سکے، یہ صوبیدار بظاہر مرکزی حکومت کا وفادار ہونے کے دعویدار تھے، لیکن دراصل باغی نہ کہلانے کا داغ لگانے سے گریز کرتے ہوئے اپنے صوبوں کے خودمختار حکمران بن گئے اور اپنے صوبوں پر اپنی حکمرانی قائم رکھنے کی خاطر محض نام کے مسلمان اور پوری طرح اسلام اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے ہزاروں میل دور سے آئی ہوئی اس تجارت پیشہ کمپنی کے آلۂ کار بن گئے جس کے پاس ان کے خلاف لڑنے کے لئے کوئی بڑی فوج تھی اور نہ نام نہاد مسلمان حکمرانوں کو یہ زیب دیتا تھا کہ وہ اپنی حکمرانی کا سودا اتنی سستی قیمت پر کریں، جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں۔

یہ تھا اس نوآبادیاتی قوم کا ۱۷۵۷ء تا ۱۹۴۷ء تک برصغیر پر حکومت کا سنہری دور، جس میں اس قوم نے نہ صرف اپنی حکومت کا رُعب و دبدبہ قائم کیا، بلکہ خود مسلمانوں اور ان کے اہل علم افراد کے درمیان مختلف بحث و مباحث کے دروازے کھول دیئے لیکن پیشتر اس کے کہ ان کا ذکر کیا جائے، شہاب الدین غوری کے دور سے اورنگ زیب عالمگیر کے دور تک مسلمان بادشاہوں کی بادشاہتوں کی تاریخ ہے، جنہوں نے بحثیت دین اسلام کو اپنی بادشاہت سے خارج رکھا۔ ماسوائے اس کے کہ اپنی بادشاہتوں کو اپنی فوج کے بل بوتے پر اور قوت کے انحصار پر قائم رکھا اور یہ فوج جس کے افراد پیشہ ور فوجی ہوں، جب کہ معاشرہ کو ہر قسم کے علوم وفنون سے ایسی بری طرح سے محروم رکھا۔ چنانچہ بالآخر ہزارہا میل دور سے آکر چند ہزار افراد کی قوم کروڑوں افراد کی حکمران بن گئی۔

پانچ صد سالہ حکمرانی کی تاریخ یقیناً منصف مزاج اور برصغیر کی خوشحالی کی تاریخ ہے، لیکن یہ تمام دور علوم وفنون اور سائنسی میدان میں ایجادات کی تعلیم جاری کرنے سے بری طرح خالی ہے، دینی علم جو ایک وسیع علمی ادارہ کی شکل اختیار کرسکتا تھا، جس سے اعلیٰ پایہ کے علماء، فقہا اور فضلاء فارغ التحصیل ہوکر بہت بڑی تعداد میں مملکت کے کونہ کونہ میں علم پھیلا سکتے تھے، یہ

Marfat.com

میدان بھی اس سے خالی ہے۔ البتہ جگہ جگہ علمی خانوادے ضرور ہیں اور دینی علم بھی دیگر بلند اور اونچے خاندانوں کے ماسوائے انہی خانوادوں کی وراثت ہے، جب کہ کسی ایک بڑے سے بڑے خانوادے نے دینی علم کو کہیں بھی ایک بڑے علمی ادارے کی شکل نہیں دی جس سے عوام الناس میں سے سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان فارغ التحصیل ہو کر عوام الناس میں برصغیر کے کونے کونے میں غیر مسلموں میں بالخصوص ہندوؤں کے اچھوت طبقے میں اسلام کو پھیلاتے۔ البتہ انہی دینی گھرانوں سے پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں بعض بڑے پاک صفت صوفیاء اور اولیاء کرام سے کئی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی پاکیزہ زندگی کی وجہ سے اُن کا انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان صوفیا اور اولیائے کرام کی زندگیوں اور نصیحتوں نے یقیناً بہت سے افراد کو متاثر کیا ہوگا اور وہ مسلمان ہوئے ہوں گے لیکن اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کے ورثاء نے ان کی وفات کے بعد خود اپنے آپ کو ان کے رنگ میں ڈھالنے اور عوام الناس میں دینی تعلیم کو فروغ دینے اور اسلام کی دعوت کی بجائے ان کی قبروں کو پیر پرستی کی بدعت کے مراکز بنا دیا اور خود گدی نشین بن کر ہر سال عُرس اور چڑھاووں کو رسومات کو فروغ دیا۔ آج ان پاکیزہ صوفیاء اور اولیائے کرام کے مزاروں کے وہ گدی نشین بڑی بڑی اراضی کے مالک ہیں، جو کسی آزاد ملک کے قابل احترام شہری ہونے کی بجائے پہلے انگریزوں کے وفادار اور وظیفہ خوار تھے، اب ان کے بعد ان سے بڑے اسلام دشمن اور صیہونیت کے غلام امریکہ کے وفادار اور وظیفہ خوار ہیں۔

برصغیر کی پانچ صد سالہ مسلمانوں کی حکومت کا ایک اور عجیب اور المناک پہلو یہ ہے کہ جب انگریزوں نے مغل شہنشاہ جہانگیر، اور بعد ازاں شاہجہان کے دور میں اپنے تجارتی روابط بڑھائے، ان بادشاہوں کی طرف سے انگریزوں کی حکومت سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ اگر ہمارے یہ بادشاہ اس قوم سے اپنے سفارتی تعلقات قائم کرتے تو نہ صرف اس قوم کے مزاج اور مقاصد کے مواقع ملتے، بلکہ اپنے ملک میں سائنس اور ایجادات کو فروغ دینے کے مواقع بھی حاصل ہوتے۔

ایک قابل غور وفکر یہ بات ہے کہ اس قوم کے افراد کی مادری زبان انگریزی تھی، جب

Marfat.com

کہ ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔شاہجہاں کے دور میں جب یہ قوم ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی کے طور پر برصغیر میں آئی، تو بحثیت ایک تجارتی کمپنی اس کی حریف فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی تھی، یہ دونوں کمپنیاں بطور ایک حریف جدید اسلحہ سے بھی مسلح تھیں، لہٰذا برصغیر کی سرزمین پر ایک دوسرے کے درمیان ''ریاست کے اندر ریاست'' State within State جنگی جھڑپیں بھی ہوئیں، جس میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو پوری طرح کامیابی حاصل ہوئی جب کہ مغل شہنشاہ یورپینوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تجارتی تعلقات قائم کرنے اور بڑھانے کے بے حد شوقین تھے، چنانچہ فرانسیسیوں کا مار کھانے کے بعد اب مغل بادشاہوں کے تعلقات بڑھ گئے، لیکن مغل بادشاہوں کی دوصد سالہ حکومت سمیت اس سے قبل دیگر تین صد سالہ مسلمان بادشاہوں کی حکومتوں کا بڑا المیہ یہ ہے کہ حکومت نے عوام میں تعلیم عام نہ کرنے کی مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا، اس کے باوجود کہ ان میں سے اکثر متقی، منصف مزاج وصاحب عدل اور منکسر المزاج بھی تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی عوام میں تعلیم عام کرنے کی خاطر کسی ایک دارالعلوم قائم کرتا، جس میں اسلامی تہذیب وثقافت کے مطابق دینی، شرعی، اقتصادی، تجارتی اور دیگر علوم ہوتے، جسے مغربی ثقافت نے یونیورسٹی کا نام دیا ہے، اس کے قیام سے ہر سال ہزاروں نوجوان اسلامی تعلیمات سے فیض یاب ہوکر نہ صرف برصغیر کو ایک اسلامی ملک بنانے کا باعث بنتے، بلکہ یورپ سمیت باقی دنیا کو بھی اسلام سے آراستہ کرنے کا باعث ہوتے، کہ یہ ملک ہر طرح کے وسائل اور ہر طرح کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ اس پانچ صد سالہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اگر ایک دارالعلوم بھی قائم ہوجاتا تو اس کی تقلید میں کئی ایسے دارالعلوم قائم ہوسکتے تھے، جن کے قیام سے ہر سال ہزاروں نوجوان ہر طرح کی اسلامی تعلیمات سے آراستہ ہوکر نہ صرف برصغیر کے کونے کونے میں اسلامی تعلیمات پھیلاتے جس وجہ سے صرف ایک نام نہاد مسلمان کی غداری نے تمام برصغیر کے مسلمانوں کو چند ہزار افراد پر مشتمل ہزاروں میل دور سے آئی ہوئی قوم کی غلامی میں دے دیا اور ایک شخص کی غداری نے آہستہ آہستہ ایسے مزید غدار پیدا کیے جن کے سامنے وقتی مفادات تھے۔

Marfat.com

پانچ صد سالہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا نام بھی قابل ذکر ہے جس کا دورِ حکومت اپنے والد نصیر الدین ہمایوں کی وفات کے بعد ۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء نصف صدی پر محیط ہے، یہ بادشاہ نام کا مسلمان، تعلیم سے کورا، اپنے گرد تین خوشامدی ہندو مشیروں، ٹوڈرمل، بیربل اور راجہ مان سنگھ اور دو بے دین برادر عالموں ابو الفضل اور فیضی کی مجلس میں گھرا ہوا تھا۔ جن کے مشورے سے اس کے دربار میں حاضری دینے والوں کو ہدایت تھی کہ وہ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کے نام پر سجدہ کیا کریں۔ اس پانچ صد سالہ تاریخ میں کسی عالم دین یا معروف کسی اہل تصوف کا کوئی ذکر نہیں ملتا، جس نے کسی بادشاہ کی کسی داخلی پالیسی سے کوئی اختلاف کیا ہو، ماسوائے شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے، جنہوں نے اکبر بادشاہ کے حضور سجدہ کرنے کے خلاف فتویٰ جاری کیا، کہ سجدہ چاہے کسی نام سے بھی ہو، حرام ہے۔ جب کہ خود بادشاہ کی زندگی اسلام سے ذرا تعلق نہیں رکھتی، اس کی ایک بیوی بھی ہندو مشرکہ ہے، یہ دونوں باتیں بادشاہ کا اپنے آپ کو سجدہ کرانا اور ایک مشرک عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا سراسر اسلامی شریعت کی رو سے حرام ہیں، جس پر بادشاہ کو خوشامدی درباریوں نے حضرت شیخ کے خلاف بھڑکایا۔ بادشاہ نے انہیں اپنے دربار میں بلایا اور سجدہ تعظیمی کا حکم دیا جس کو آپ نے بری طرح ٹھکرا دیا، جس پر اکبر نے آپ کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دیا، تا آنکہ غالباً اکبر کی وفات کے بعد اس کے جانشین جہانگیر جو آپ کی تعلیمات سے متاثر تھا، نے رہائی کا حکم دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک ہزار سال بعد پورے ہونے کے بعد اسلامی معاشرہ بالخصوص برصغیر میں جو بدعات اور اسلام کے نام پر غیر اسلامی رسومات فروغ پا گئی تھیں، آپ پہلی پاکیزہ شخصیت ہیں، جنہوں نے ان بدعات کے خلاف خدائے واحد کی توحید پرستی کا بیڑا اٹھایا۔ اور اسی وجہ سے آپ کو مجدد الف ثانی کا لقب دیا گیا۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ آپ کی شخصیت سے بڑے متاثر ہیں، جو آپ کی اس نظم سے ظاہر ہے:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر　　وہ خاک کہ زیرِ فلک مطلعِ انوار
اُس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے　　اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار

Marfat.com

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں لیکن نہیں رسوا

آپ کی شخصیت پر میرے ادارے حرا پبلی کیشنز نے ''سلاطین مغلیہ اور مجدد الف ثانیؒ کی تحریک احیائے اسلام'' ایک کتاب شائع کی، جسے ابصار عالم مرحوم نے تصنیف کیا تھا، آج بھی میرے ذاتی پتہ پر دستیاب ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ آپ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا، اس دوران آپ نے جس استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا، اس دوران اگرچہ آپ پر زبردست دورِ استبداد اور آزمائش آیا اور آپ نے جس استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا، اس نے آپ کے مخالفین کی نظروں میں بھی آپ کا مقام بلند کر دیا۔ ایک مصلح کی حیثیت سے آپ نے شاہی دربار میں بلا خوف وخطر کلمۂ حق بلند کیا، آپ نے بیک وقت کئی محاذوں پر جنگ لڑی، جو ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ کیونکہ تن تنہا مطلق العنان بادشاہت میں حق کی تحریک چلانا کتنا مشکل کام ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر خاص فضل تھا، اور برصغیر ہند میں اسلام کو زندہ رکھنا تھا کہ آپ سے شہزادے اور جرنیل بھی متاثر ہوئے، سپاہی اور مزدور بھی، غیر مسلموں کو آپؒ نے اسلام میں داخل کیا اور پیدائشی مسلمانوں کو باعمل اور باکردار مسلمان بنایا۔

آپ نے ایک طرح سے چومکھی لڑائی لڑی۔ ایک جانب دینِ الٰہی کو چیلنج کیا، اور مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اُسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا، دوسری جانب عام مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات، رسوماتِ جاہلیہ اور شرک کے مقابلہ میں قرآنِ کریم کی روشنی میں توحید پر مبنی دینِ اسلام پیش کیا، تیسری جانب تصوف کی دنیا میں غلو اور افراط وتفریط کو محسوس کرتے ہوئے اس کی اصلاح کی کوشش کی اور نہایت حکمت، تدبر اور محبت کے ساتھ ان کی اصلاح کی راہ نکالی۔

خواجہ جہاں کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور

Marfat.com

وہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی مکمل اتباع کی جائے۔ شیخ تھانیسری ؒ کے نام ایک طویل مکتوب میں لکھتے ہیں کہ فرائض کی ادائیگی نوافل پر مقدم ہے۔ فرائض سے غفلت برت کر نوافل کے ذریعہ کبھی مقصود حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی خط میں آپ نے مؤطا امام مالک ؒ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ہے۔

آپ ؒ کی تالیفات میں سب سے زیادہ شہرت آپ کے مکتوبات کو ہے، جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ آپ مجدد اور مجتہد تھے، چنانچہ آپ کا ہر مکتوب اپنی جگہ ایک مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تصوف کے بارے میں اپنے دور کے تین بزرگوں کے نام تین مکاتیب کے حوالہ جات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اصل تصوف کیا ہے اور گدی نشینوں کا تصوف کیا ہے؟ یہ تھا برصغیر ہند میں مسلمان بادشاہوں کی پانچ صد سالہ تاریخ کا مختصراً بیان کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ماسوائے اپنی حکومت کو اچھے انداز میں چلانے کے لئے اپنی ہاں میں ہاں ملانے والے خوشامدی ٹولے کے علاوہ کوئی صاحب بصیرت وحکمت مشیر کی ضرورت نہیں سمجھتا جو اسے یہ مشورہ دے کہ اپنی مملکت میں ہر طرح کی تعلیم عام کرے، بیرون مملکت غیر ممالک میں وفود بھیج کر اپنے مشاہدات سے اُسے آگاہ کرے، کہ رفتارِ حالات کیا ہے، جس کا بالآخر اولاً میر جعفر بعد ازاں میر صادق کی غداریوں کی وجہ سے بالآخر ہمیشہ کے لئے برصغیر پر مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوا اور چند ہزار افراد کے بل بوتے پر ہزاروں میل دور سے آئی ہوئی قوم کی غلامی کا باعث ہوا۔

شیخ چتری کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مدت دراز تک علم ومعرفت، حال ووجد کی موسلا دھار بارش مجھ پر ہوتی رہی ہے، راہِ سلوک اور تصوف میں جو کچھ بھی ملا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ملا۔ اب میری حالت یہ ہے کہ سوائے اس کے کوئی آرزو نہیں رہی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مردہ سنت کو زندہ کروں، رہا حال ووجد کا تو میں نے اس سے بے نیاز ہو کر اسے ارباب ذوق پر چھوڑ دیا ہے۔''

یہ ہے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مختصر ذکر کہ اصل تحریکِ احیائے اسلام کے بانی آپکی ذات ہے، اگر آپ سولھویں صدی عیسوی میں اکبر بادشاہ کے دینِ الٰہی کی راہ نہ

Marfat.com

کاٹ دیتے، تو برصغیر میں اسلام اور اسلامی روایات نہ صرف بری طرح پامال ہو چکی ہوتیں، بلکہ انکو دوبارہ زندہ کرنا ناممکن ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات مجدد الف ثانی ہے۔

برصغیر میں انگریز قوم کے قدم جانا، اپنی اپنی سوچ فکر کے مطابق بعض علمی شخصیات اور ان کے نظریات کا اداروں کی شکل میں اُبھرنے کا باعث ہوا۔ جس سے بادشاہوں کا پانچ صد سالہ دور محروم ہے، اس لحاظ سے ایک انتہائی اور ضروری پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے، اس دور کے آغاز میں جو شخصیات اُبھر کر سامنے آئیں، اوّلاً انکے نام ذیل میں دیئے جاتے ہیں، بعد میں ان کی فکر کا ذکر کیا جائیگا:

۱) سرسید احمد خان
۲) شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی
۳) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۴۴ـ۱۸۳۳ء
۵) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ 1905ـ۱۸۲۸ء
۶) مولانا احمد رضا خان بریلویؒ ۱۹۲۱ءـ۱۸۵۶ء
۷) مکتبۂ اہل حدیث یا وہابی

اب اس کے بعد فرداً فرداً ہر شخصیت کے افکار بیان کیے جاتے ہیں۔

۱) سرسید احمد خان

آپ ۱۸۵۷ء کے غدر سے قبل ہی برٹش ایسٹ انڈیا کی ملازمت میں بجنور میں سول جج تھے، جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ نے مذہبی طور پر اسلامی شریعت کی بالادستی کو خیر باد کہہ کر مغربی نظریات کو قبول کر لیا تھا اور اسلام کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ لیکن غدر کے واقعہ نے انگریزوں کے ہاتھوں ہزاروں مسلمانوں اور نئے حکمرانوں کے درمیان باہمی مفاہمت اختیار کرنے کی پالیسی کو ترجیح دی، جو نئے حکمرانوں کے لئے خوش آئند بات تھی۔ لیکن جہاں آپ نے باہمی مفاہمت اختیار کرنے کی پالیسی کو ترجیح دی، وہاں اپنے آپ کو نئے حکمرانوں کی نظروں میں دوسرے درجہ کا شہری خیال کرنا بھی قبول نہ تھا۔ اس لحاظ سے آپ نے ان کے ساتھ کسی طرح کے سیاسی ٹکراؤ کی بجائے روایتی اسلام کو خیر باد کہہ کر "ریفارمسٹ"

Marfat.com

Reformist اور Moderanist کی اصطلاحات اپنائیں۔ اُدھر سے ۱۸۳۱ء کے بعد برصغیر میں اسلام کے خلاف عیسائی مشنریوں کی یلغار شروع ہوگئی تھی جن کو برصغیر میں انگریز عیسائی قوم کی حکومت کی پوری حمایت وسرپرستی حاصل تھی، جن کی بحث کا سارا تکرار اس بات پر تھا کہ اسلام ہر طرح سے موجودہ دور کے تقاضے پورا کرنے کا اہل نہیں، جس میں نے اب سائنس اور ایجادی ذہن ہے اور نہ انسانیت کی ترقی کے لئے کوئی ترغیبی فکر، یہ پس ماندگی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اس دو طرفہ کش مکش کا مقابلہ کرنے کے لئے سر سید احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں صوبجات متحدہ (یوپی) میں علی گڑھ کے مقام پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے بڑے پیمانے پر پہلے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی جس کے قیام سے اُن کا مقصد اور اُمید یہ تھی کہ یہاں سے جو طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلیں، ان میں موجودہ دور کے تقاضے پورا کرنے کی خود اعتمادی ہو، وہ حکومتی ملازمتوں میں باوقار ملازم ہوں اور سیاست اور قانون کے اداروں میں ایک سلجھے ہوئے سیاستدان اور اچھے قانون دان۔ آپ مغربی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے، آپ نے سنی مذہب فکر کو اندھی تقلید کا نام دے کر اس کی تکذیب کی اور ''اجتہاد'' کے نام سے ایک نئی فکر کو پروان چڑھانے کی کوشش کی، جس میں ''سنگساری'' کی سزا کو وحشیانہ قرار دے کر اس کی مذمت کی۔

اس لحاظ سے سر سید احمد خان مسلمانوں کے ہمدرد ضرور تھے اور آپ کا علی گڑھ اینگلو اورینٹل کالج کا قیام برصغیر ہند کے مسلمانوں کو انگریزی زبان پر عبور پانے کی خاطر مغربی تہذیب کے قریب لانے کی طرف ایک راست اقدام بھی قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے بعد لاہور میں اسلامیہ کالج کا قیام اور پشاور میں سر عبدالقیوم خان جنہیں سر سید ثانی کہا جاتا ہے، کا اسلامیہ کالج جیسا بڑا کالج قائم کرنا، برصغیر ہند کے مسلمانوں میں مغربی تہذیب وثقافت متعارف کروانے کے لئے وہ اقدامات ہیں جنہیں نظر انداز کیا جانا ممکن نہیں، لیکن ان تعلیمی اداروں سے زیادہ تر ایسے طلباء فارغ التحصیل ہوئے جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے باوجود بالخصوص انگریزی ادب اور قانون کے شعبوں میں اپنا اسلامی تشخص اپنایا اور دوقومی نظریہ اپنایا، جس کی برصغیر ہند میں بڑی ضرورت تھی۔

Marfat.com

سرسید احمد خان کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو برصغیر کے مسلمانوں میں اتنی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ کالج ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بن گیا اور اس کے فارغ التحصیل طلباء بڑے فخر سے اپنے نام کے ساتھ ''علیگ'' لکھنے لگے، جیسا کہ انگلینڈ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل "Oxon" اور کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل "Catab"، علی گڑھ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور کے فارغ التحصیل طلباء نے میری رائے میں قیام پاکستان کے عمل میں جو اہم کردار ادا کیا، اس کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، مسلمان بادشاہوں کی پانچ صد سالہ حکومتوں کے دوران بھی مسلمان اور ہندو کی تفریق موجود تھی، لیکن ہندوؤں کی تفریق جو اونچی جاتی اور نچلی جاتی کی بنیاد پر تھی، نہ صرف مسلمان بادشاہوں نے بلکہ مسلمان عوام نے ہندوؤں کی اس داخلی تفریق کو مٹانے کی بجائے خود اپنے اندر بھی اس تفریق کو فروغ دیا۔ ہندوؤں کی تفریق میں یہ چار طبقے تھے، براہمن، کشتری، ویش اور شودر۔

براہمنوں کا طبقہ محض پوجا پاٹ کی رسومات ادا کرنے اور سنسکرت زبان میں چار ویدوں رِگ وید، سام وید، یجر وید اور اُتر وید کی تعلیمات حاصل کرنے کے لئے مخصوص تھا۔ ان چار ویدوں کی تعلیمات کیا ہیں؟ کس زمانے میں یہ مرتب ہوئے، کون لوگ ان کے مخاطب تھے، اور خطاب کرنے والے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہب، جس کو مذہب کا نام دینا ہی ہر طرح سے نامناسب ہے، اس میں براہمن نام سے اس کا مذہبی طبقہ صدیاں در صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے دور کے لوگوں کو ان ویدوں کی تعلیمات سے آگاہ کرتا، بلکہ خود بھی ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتا، چنانچہ یہ مذہب تو طبقاتی تقسیم کا ایک نسل پرست مذہب ہے، جو ہر طرح کی اخلاقی، سماجی تعلیمات سے عاری ہے، ممکن ہے ان ویدوں میں توحید کی تعلیم ہو، خطاب کرنے والے توحید پرست ہوں، اور اپنے دور کے عوام کو توحید کی تعلیم دی ہو، جب کہ ان کا مرکز برصغیر کا بالائی حصہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں بت پرستی کے مندر معدوم ہیں، ماسوائے ہڑپہ کے جو پنجاب کے ضلع ساہیوال میں ہے اور اس کے کھنڈرات تو واضح طور پر بت پرستی کے آثار

Marfat.com

ہیں، تاہم ان کھنڈرات میں نہ سنسکرت زبان کا کوئی وجود نظر آتا ہے نہ وید نام سے سنسکرت زبان میں کوئی کتاب۔ البتہ یہ کھنڈرات ضرور اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہزاروں سال قبل جو ڈھائی تین ہزار سال قبل از مسیح بھی ہوسکتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کی طرح یہاں بھی کہنے کو مذہب مگر بت پرستی کی وجہ سے گمراہ، جہاں اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو گمراہی سے نکالنے کے لئے اپنا کوئی پیغمبر بھیجا ہو، لیکن اس شہر نے اس کی تکذیب اور استہزاء کیا ہو اور بالآخر اس شہر پر عذاب الٰہی نازل ہوا، جس کی نوعیت اور تفصیل سے نہ صرف تاریخ خالی ہے، بلکہ خود ہڑپہ شہر کے کھنڈرات بھی انگریزوں کی آمد سے قبل مؤرخوں کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔

سنسکرت زبان جو اب مردہ زبان ہو چکی ہے، اور چاروں مذہبی وید جو اس زبان میں ہیں، برہمن طبقہ کو چاہئے تھا کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی آزادی حاصل کرنے کے بعد قوم یہود کی ریاست اسرائیل میں عبرانی Hebrew زبان کو زندہ کرنے اور سرکاری زبان قرار دینے کی طرح زبان ہندی کے ساتھ سنسکرت زبان سے بھی کم از کم مسلمانوں اور ہندو دونوں قوموں کے علمی طبقہ کو آشنا کراتے تاکہ وہ یہ زبان سیکھ کر ویدوں کی تعلیمات سے بھی آشنا ہوسکیں۔ لیکن ایسا نہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چاروں وید اونچی جاتی بالخصوص براہمنوں کے نسل پرست ذہن کے خلاف ہیں جب کہ ان کا دور بھی اس سے کئی صدیاں قبل کا ہے جس نے بالخصوص مسلمان بادشاہوں کے دور میں بالخصوص زور پکڑا۔

جہاں تک اس مذہب کی رامائن اور مہا بھارت دو کتابوں کا معاملہ ہے، یہ دونوں کتابیں کسی طرح بھی مذہبی کتابیں نہیں، بلکہ اپنے اپنے دور کے دو ہندو راجہ خاندانوں کی افسانوی شکل میں دو کتابیں ہیں جس میں رامائن کا دور مہا بھارت کے دور سے قبل کا ہے۔ تاریخوں کا تعین تو نہیں کیا جاسکتا، البتہ دونوں واقعات کئی صدیاں قبل مسیح ہیں۔ رامائن کے بارے میں یہ تعین کرنا بھی مشکل ہے آیا کہ واقعہ رو پذیر بھی ہوا ہے یا محض افسانہ ہے کہ رامائن کے کردار رام چندر اور اس کے دو بھائی لکشمن اور شتروگھن اور رام چندر کی بیوی سیتا ہیں۔ جبکہ رام چندر کی حکومت اپنے والد کے بعد انڈیا کے صوبہ یوپی میں کہیں ہے، جس کا دارالحکومت بھی یقینی طور پر معلوم نہیں۔ تاہم لنکا

Marfat.com

کا راجہ راون رام چندر کی حکومت پر کوئی حملہ کیے بغیر سیتا کو اپنے ساتھ بھگا کر لے جاتا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں ہوسکا، آیا کہ یہ لنکا موجودہ سری لنکا ہے یا اس زمانہ میں کوئی اور لنکا تھی، لیکن ہندو قوم موجودہ لنکا کو ہی راون کی لنکا قرار دیتی ہے، جس کو تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ بہر حال رام چندر اپنے دو بھائیوں اور لاؤ لشکر سمیت راون سے اپنی اغوا شدہ بیوی کو برآمد کرنے کے لئے نکل پڑتا ہے، کسی جگہ جس کا ہندو تاریخ میں ذکر نہیں ملتا، راون کو شکست دے کر اور قتل کر کے اپنی بیوی سیتا کو حاصل کر لیتا ہے۔

یہ ہے رامائن، نا معلوم ہندو قوم بالخصوص اونچی جاتی کے براہمن کس بنیاد پر اسے مذہبی کتاب قرار دیتے ہیں، جو ایک افسانوی واقعہ ہے اور اس میں ایک راجہ کی بیوی کو بھگا لے جانا ایک عرصہ اُسے اپنی نفس پرستی کا شکار بنانا تو خود اس امر کا اظہار ہے کہ اس قوم کے اونچے طبقہ میں بھی عزتِ نفس نام کی کوئی چیز نہیں۔

جہاں تک مہا بھارت کا معاملہ ہے، یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ کب اور کیوں اسے براہمن پنڈتوں نے جنگ مہا بھارت کا نام دیا، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ ہندو اِزم کے نام سے ہندومت کو کسی طور پر مذہب کا نام نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ بطور مذہب یہ ذرا بھی کوئی مذہب نہیں بلکہ معاشرہ کی چار طبقاتی تقسیم کا نام ہے۔ براہمن، کشتری، ویش اور شودر (اچھوت)

برہمن طبقہ پوجا پاٹ کرنے اور دوسرے طبقوں پر اپنی بالا دستی منوانے کا خاص ماہر ہے کہ پوجا پاٹ اور دیگر مذاہب میں بھی کسی کی عبادت کرنے والے اور کرانے والا طبقہ ہی عوام میں اپنی بالا دستی منوانے والا ہوتا ہے، جب کہ یہ طبقہ خود غیر لڑاکا ہوتا ہے جب کہ لڑاکا قومیں اور قوتیں مذہبی طبقوں میں سے نہیں ہوتیں، البتہ قوموں کے حکمران جو لڑاکا افراد ہوتے ہیں، اپنی حکومت میں مذہبی طبقوں کے مشوروں کے ضرور محتاج ہوتے ہیں، اگر یہ مشیر دور اندیش، دانشور، حقائق سے باخبر ہوں اور حکمران بھی ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوں، تو حکومت مضبوط ہوتی ہے، اگر یہ مشیر مذہب کے نام پر خوشامدی، نا اہل اور حقائق سے بے خبر ہوں تو حکمران اُن کو لے ڈوبتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ اس براہمن طبقہ نے کب دو خاندانوں کی باہمی جنگ کو مہا بھارت کا نام دیا، کیونکہ بھارت یا اب انڈیا، بھارت نام سے کبھی ایک ملک نہیں رہا۔ یہ جنگ کورد پانڈو دو کشتری

Marfat.com

خاندانوں کے درمیان ہوئی، لیکن ان کی راجدھانی یا دارالحکومت کا تاریخ میں کوئی ذکر نہیں، البتہ یہ جنگ چند صدیاں قبل از مسیح مشرقی پنجاب میں کورکیشتر (موجودہ تھانیسر) کے مقام پر ہوئی، یہ مقام جی ٹی روڈ پر لاہور اور دہلی کے درمیان لاہور سے کوئی سوا دو سو میل دور ہے۔ اس سے آگے دہلی کوئی ایک صد میل دور ہے۔ مشہور جنگی مقام پانی پت جی ٹی روڈ پر تھانیسر سے ۷۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، جب کہ کرنال کا مقام یہاں سے کوئی ۲۵ میل دور ہے۔

معلوم نہیں، کہ تقسیم ہند کے بعد انڈیا نے اسے پرانا نام کوروکیشتر ہی دے دیا ہو، ہندو مذہب میں سورج گرہن یا سورج کو گرہن لگنا اس روز کوروکیشتر کے مقام پر ایک تالاب میں غوطہ (ڈبکی) لگانا اپنی زندگی بھر کے گناہوں (پاپوں) سے پاکیزہ (پوتر) کرنا ہے۔ چنانچہ جب بھی سورج گرہن ہوتا ہے تو انڈیا بھر سے لاکھوں آئے ہوئے ہندو برہنہ ہو کر گدلے پانی سے تالاب میں ڈبکی یا غوطہ لگا کر پوتر/پاک ہو جاتے ہیں، یہ ایسا گندہ منظر ہوتا ہے جس میں ہندو مرد اور عورتیں سبھی شامل ہوتے ہیں کہ بغیر برہنہ اور ننگے ہوئے ڈبکی لگانا ممکن نہیں۔ معلوم نہیں سورج گرہن کے روز اس مقام پر جہاں دو کشتری خاندانوں کورو اور پانڈوں کے درمیان جنگ ہوئی، براہمن طبقہ نے کب اس واقعہ کے بعد اس مقام کے ایک چھوٹے سے تالاب میں ڈبکی لگانے کا عمل شروع کیا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ یہ جنگ کورو پانڈو دو کشتری راجاؤں کے درمیان جنگ ہوئی، کس راجدھانی کی خاطر یہ جنگ ہوئی، یہ معلوم نہیں کہ بھارت میں ہندو قوم کی تاریخ کا کوئی وجود نہیں۔ ماسوائے رامائن اور مہابھارت کی جنگ اور کرشن جی مہاراج کی بھگوت گیتا کے۔

مہابھارت کی یہ جنگ کوئی ایسی بڑی جنگ نہیں کہلائی جاسکتی کہ اس دور میں چند ہزار کی جنگ بھی بہت بڑی جنگ کہلاتی تھی، ایک طرف پانڈو خاندان کے پانچ بھائی یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل، سہدیو اور دوسری طرف کورو خاندان دریودھن اور اس کے ایک صد ایک بھائی، ان دونوں کرشن جی مہاراج انڈیا میں موجودہ متھرا کے ایک اعلیٰ سوچ وفکر کے مالک راجہ تھے۔ جب ان دونوں خاندانوں میں چپقلش بڑھ گئی اور ان دونوں کی فوجیں کوروکیشتر کے مقام پر جنگ کے لئے تیار ہو گئیں تو کرشن جی مہاراج متھرا سے چل کر کوروکیشتر کے مقام پر آئے، پانڈو خاندان

Marfat.com

بحیثیت گدی، جس کا نام معلوم نہیں، وراثت کا حقدار تھا، جبکہ کورو خاندان جس کا سربراہ دریودھن تھا، جنگ سے قبل آپ نے ایک رتھ پر کھڑے ہو کر حق اور انصاف کے حق میں تقریر کی جسے بھگوت گیتا کہا جاتا ہے۔

اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تقریر ایک پوری کتاب بن جائے۔ یہ بات صحیح ہے کہ آپ نے جنگ سے بچنے اور حق وانصاف کے حق میں ضرورت تقریر کی ہو، لیکن بعدازاں کب یہ تقریر پوری، ایک کتابی شکل اختیار کر گئی، جو ایک ناصحانہ انداز کی ہے، ہندولٹریچر میں یہ واحد کتاب کہی جاسکتی ہے۔ بہرحال کورو یہ جنگ ہار گئے، دریودھن مارا گیا، پانڈو خاندان کے یہ دو نام بھیم اور ارجن ہندوؤں میں ابدیت پیدا کر گئے، بھیم اپنی گندر اندازی اور ارجن اپنی تیراندازی کی وجہ سے یدھشتر جو سب سے بڑا تھا، خاندان کا بڑا ہونے کی وجہ سے حکومت کا حقدار تھا۔ اس کا نام قابل ذکر نہیں نظر آتا، البتہ پہلے دونوں نام ہندو معاشرہ میں بڑے معروف ہیں۔

برہمن طبقہ کی ہندو معاشرہ پر اپنی مضبوط ذہنی گرفت کی وجہ سے حکمران افراد ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، جیسا کہ تقسیم سے قبل یہ ہندو برہمن پنڈت جواہر لال نہرو، کی مضبوط گرفت تھی، جس میں دوسری اہم شخصیتیں ثانوی حیثیت اختیار کر گئیں۔

صوبہ جات متحدہ/ یونائیٹڈ پراونسز مختصراً یو پی جو بالائی انڈیا کا اہم ترین صوبہ ہے، متحدہ انڈیا کی لیڈرشپ زیادہ تر یہیں سے اُبھرتی ہے، جب کہ برصغیر میں مسلمانوں کی پانچ صد سالہ حکومت کا محور بھی دہلی بوجہ دارالحکومت اور صوبہ یوپی جس میں مسلمانوں کا علم دوست اور علمی طبقہ رہائش پذیر رہا ہے، جب کہ موجودہ پاکستان جو پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان یہ چاروں صوبے ماسوائے اس کے کہ اکثریتی آبادی کے لحاظ سے یہ مسلمان ہیں لیکن علم کی روشنی سے کم وبیش خالی نظر آتے ہیں۔

اوّلاً برصغیر ہند میں مسلمانوں کی آمد کا ذکر کروں گا، اس کے دو حصے ہیں: ایک حصہ اسلام کی پہلی صدی میں محمد بن قاسم صوبہ سندھ کی پورٹ قاسم سے لے کر بعدازاں ساحل مالابار کی بندرگاہ سُورت اور تمام برصغیر کا ساحلی علاقہ جہاں عرب تاجر بحری تجارت کے ذریعہ برصغیر کے تمام ساحلی علاقہ مالابار، سیلون (سری لنکا) بنگلہ دیش، اراکان (برما) تھائی لینڈ، ملایا، انڈونیشیا، فلپائن تک پھیل کر بنگلہ

Marfat.com

دیش، ملایا اور انڈونیشیا کے ممالک کی تمام آبادیوں کو مسلمان بنا دیتے ہیں، جب کہ ساحل مالابار، سیلون، برما، تھائی لینڈ، فلپائن اپنے دورِ آغاز میں یقیناً ایک قابل احترام لوگ ہوں گے، لیکن آج کے دور میں ایک سے بڑھ کر ہر جگہ غیر مسلم متعصب حکومتوں اور آبادیوں کی وجہ سے مظلومیت کا شکار ہیں، برما کے صوبہ اراکان کے کافی تعداد میں مسلمان کراچی میں پناہ گزین ہیں، جب کہ اُن کی اپنی ایک تنظیم بھی ہے، جسے وہاں کے اسلام دوست حلقوں کی ہمدردی اور حمایت بھی حاصل ہے، جب کہ جب سے پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے، ایک سے بڑھ کر ہر پاکستانی، اغیار غیر مسلم حکومتوں کی آلۂ کار رہی ہے، ان سے کسی قسم کی ہمدردی کی توقع فضول ہے۔

مالابار کا ساحلی علاقہ جو انڈیا کے موجودہ صوبہ گجرات کا حصہ ہے، کوئی مذہب نہ رکھنے کے باوجود نسلی تعصب کا شکار ہے، اور نسلی تعصب کے شکار اس صوبہ کے مسلمانوں کو جو موثر تاجر طبقہ بالخصوص میمن برادری ہے، وقتاً فوقتاً انڈیا کی اسلام دشمن ہندو جماعتیں اپنے تشدد کا ٹارگٹ بناتی رہتی ہیں۔

یہ تھا اسلام کی پہلی صدی سے لے کر موجودہ دور تک کے برصغیر کے مسلمانوں کا مختصراً تاریخی بیان۔ البتہ تمام صوبہ سندھ کی آبادی کا قبول اسلام، بتدریج وقتاً فوقتاً اپنے اپنے زمانے کے اولیاء کرام کا مرہون منت ہے کہ صوبہ کی تمام آبادی نے اسلام تو قبول کرلیا اور مسلمان ہو گئے، لیکن ان اولیاء اور صوفیائے کرام نے کوئی ایسے علمی ادارے قائم نہ کئے جو یہاں کے عوام الناس کو اسلام کی پوری تعلیمات سے فیض یاب کرتے، البتہ اپنے ورثاء کیلئے اپنے مقابر بطور گدیاں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی وارث اپنے لئے مخدوم کا لقب استعمال کرتا ہے، کوئی شاہ کا اور کوئی قریشی کا اور ہر سال اپنے بزرگوں کے یوم وفات کے روز عرس کی تقریبات منا کر مریدوں کے حلقہ میں اپنا اثر و رسوخ مزید مستحکم کرتا ہے، جس میں اسلامی تعلیمات نام کو نہیں ہوتیں۔

اب آیئے پاکستان کے دوسرے صوبوں کی طرف، جس میں رقبہ کے لحاظ سے بلوچستان کا صوبہ باقی تمام صوبوں کے برابر ہے، موجودہ آبادی کے لحاظ سے تمام پاکستان کی آبادی کوئی سترہ اٹھارہ کروڑ کہی جاتی ہے، بلوچستان کی غالباً ایک کروڑ یا اس سے بھی کم جو تمام مسلمان ہے، اس میں بھی صرف دو ہی طبقے ہیں جو اپنے آپ کو بلوچ کہلاتے ہیں، ایک طبقہ ایک دوسرے کی حریف

Marfat.com

سردار شاہی ہے، دوسرا ان کے ماتحت ان کے اپنے اپنے علاقوں کے بلوچ عوام جن میں علم کی روشنی نام کو نہیں، قیام پاکستان سے قبل اس صوبہ کو پاکستان کا صوبہ بننے کے بارے میں کوئی خاص تنازعہ سننے میں نہیں آتا، لیکن قیام پاکستان کے بعد نااہل اور مغرور قسم کے حکمرانوں اور اسلام آباد میں بیٹھ کر خود غرض اور خوشامد پرست نوکر شاہی نے ان قبائلی سرداروں کی جاہلیت کی باہمی رقابتوں کو خوب اُچھالا، جن میں ایک طرف وہ افراد اُبھرے جنہوں نے پاکستان سے علیحدگی کا نعرہ لگایا اور نعروں کے ساتھ اپنی تحریکوں کو علیحدگی پسندی کا نام دے کر اسلام دشمن ممالک کو اور ان کی ایجنسیوں کو پاک سرزمین پر قدم رکھنے کی بناء پر ایسے افراد کو اپنا آلۂ کار بنانے کے مواقع میسر مہیا کیے جو ایک آزاد بالخصوص اسلامی ملک کے شہری کی فکر سے ذرا تعلق نہ رکھتے ہوں، یہ محض اس وجہ سے کہ صوبہ کے عوام علم کی روشنی سے بُری طرح محروم ہیں، حالانکہ یہ پاکستان کا وہ واحد صوبہ ہے جو رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے، بلکہ قدرتی معدنیات کے لحاظ سے سب سے زیادہ مالا مال ہے۔ صرف ایک مقام سوئی ہی کی مثال لے لیجیے کہ جس نے تمام ملک کو انتہائی ارزاں نرخوں پر گیس کی سپلائی مہیا کر کے ملک کو ایک بڑے بحران سے محفوظ رکھا ہوا ہے، جب کہ ہمارا پڑوسی اور ہمارا سب سے بڑا دشمن ملک اس قدرتی نعمت سے محروم ہونے کی وجہ سے کس عظیم بحران کا شکار ہے۔ عوام کی بات چھوڑیئے، کہ ان کا ان باتوں سے کیا سروکار......؟ ہماری سب سے بڑی دشمن اور خود غرض نوکر شاہی کے ساتھ ہمارے خود غرض لالچی اور کرپٹ سیاستدان ہیں جو اس نعمت پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر گزار ہونے کی بجائے ملک کو اقتصادی اور معاشی بحران سے دوچار کرنا اور اربوں ڈالر غیر ملکی بنکوں میں جمع کرنا، اپنی ناپائیدار زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں، ایک صاحب جو کچھ عرصہ قبل مسٹر 10% کے نام سے بدنام تھے، آج وہ ملک کی صدارت کی کرسی پر براجمان ہیں۔ جب کہ ہمارا میڈیا بھی بڑی لجاجت سے ان کے بارے میں ہر لحہ کی خبریں ریلیز کرنے میں پیش پیش ہے۔ آج جناب صدر بمعہ اپنے لاؤ لشکر فلاں ملک کے غیر ملکی دورے پر روانہ ہورہے ہیں، آج اُس ملک کے صدر/وزیر اعظم نے آپ کا بڑا گرم جوشی سے استقبال کیا، باہمی امور بالخصوص دہشت گردی کے خاتمہ کے بارے میں ''ون ٹو ون'' ملاقات ہوئی۔ میزبان ملک کے صدر/وزیر اعظم

Marfat.com

نے دہشت گردی کے خاتمہ کے بارے میں اپنی پوری امداد کا نہ صرف یقین دلایا، بلکہ اب تک مہمان صدر نے اس بارے میں جو فوجی اقدامات کئے ہیں، ان کی بڑی تعریف کی۔ مزید برآں ان فوجی اقدامات کے نتیجہ میں جو پچیس تیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے ہیں ان کی واپسی اور دوبارہ آباد کرنے کے بارے میں کئی ارب ڈالر کی مدد کے وعدے بھی کئے، بعض وعدے اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ جب تک آخری دہشت گر مارے جانے کا یقین نہیں آتا، یہ مالی امداد نہیں دی جائے گی۔

یہ ہے ہمارے میڈیا کا لحہ بہ لحہ بین الاقوامی سیاست کے بارے میں صدر مملکت کی دوسرے ممالک کے عمائدین کے ساتھ ہنستے مسکراتے ملاقاتیں دکھانا اور عوام کو یقین دلانا کہ ''سب کچھ اچھا ہے اور غیر ممالک میں پاکستان کا مقام کتنا بلند ہے۔''

اب آیئے مالاکنڈ اور بعدازاں وزیرستان کے فوجی آپریشنز کی طرف!

اگر یہ چند صد یاں چند ہزار دہشت گردوں کے خلاف فوجی آپریشن تھا، تو یہ آپریشن ایک میجر یا زیادہ سے زیادہ ایک لیفٹیننٹ کرنل کی کمان میں لڑایا جا کر چند دنوں یا چند ہفتوں میں دبایا جا سکتا تھا۔ پھر آپریشن شروع کرنے سے قبل وفاقی حکومت کا یہ فرض تھا کہ وہ ایک طرف پارلیمنٹ میں اپنا مؤقف پیش کرے اور دوسری طرف میڈیا میں فریق مخالف کو جس کو کبھی طالبان، کبھی دہشت گرد، کبھی شدت پسند، کبھی پاکستان دشمن ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ان کے کسی لیڈر یا ترجمان کو اپنا مؤقف پیش کرنے کا موقعہ دیا جاتا، کیونکہ وہ کوئی مفاد پرست پیشہ ور دہشت گرد، کوئی مالی مفاد حاصل کرنے کے خواہش مند دہشت گرد نہیں ہیں، بلکہ پاکستان کے انتہائی دوست اور اس کے دشمن کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جب کہ جمہوریت کے نام پر پاکستان پر مسلط حکومت کے اتحاد ثلاثہ کا جو ٹولہ ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی نظریۂ اسلام کا حامی نہیں، ان میں سب سے بڑی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی ہے، جو لادین جمہوریت کی حامی امریکی سرپرستی میں حکومت کرنا اپنا منشور قرار دیتی ہے، اس جماعت نے نہ صرف صوبہ سندھ میں پاکستان پارلیمنٹ میں اکثریتی نشستیں حاصل کیں، اس کے بعد دوسرے بڑے صوبہ پنجاب میں دوسرے نمبر پر نشستیں حاصل کیں، جب کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں برائے نام، لہٰذا یہ جماعت اس پوزیشن

Marfat.com

میں نہیں تھی، کہ واحد اکثریتی جماعت کی حیثیت میں مرکزی حکومت قائم کر سکے، خود اپنے اندر جماعت کا ہر کامیاب رکن وزیر یا وزیر مملکت بننے کا دعویدار تھا، ورنہ کوئی فارورڈ بلاک بنانے کا کریکٹر، جب اس چیئر مین نے جو اپنی اہلیہ کے قتل کے بعد ہی اوّلاً اپنی پارٹی کی صدارت کا اور بعدازاں محض اقتدار پرست ہونے کی وجہ سے جس کی فکر و سوچ میں کوئی نظریہ نام کو نہ ہو، بلکہ اس کے برعکس اپنی کرپشن کی وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہو، وہ ملک بھر کی حکومت کی صدارت کا عہدہ سنبھال لے، اس کے عہد حکومت میں اللہ تعالیٰ ہی اس ملک کا محافظ و نگہبان ہے، کہ اس کی مشیت سے اس کا قیام عمل میں آیا تھا، جب کہ وہ خود اقتدار پرست، زیادہ سے زیادہ ہر طریقہ سے دولت لوٹنے، ملک دشمن اغیار کے ایجنٹ ہونے اور انتہائی بزدل اور عیش و عشرت کے مزے لوٹنے کی دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ ایسے میں اس کے جو وزیر اور مشیر اس کی پارٹی کے ہوں گے، ان کی صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک واحد اکثریتی جماعت نہ ہونے کی وجہ سے اس بدنام زمانہ شخص نے جن دیگر جماعتوں کی مدد سے مرکز میں مخلوط حکومت تشکیل دی، ان کی سوچ و فکر اس کے خلاف نہ ہونے میں کیا شک وشبہ رہ جاتا ہے۔ مخلوط حکومت کی یہ دو جماعتیں ہمہ وقت کرسی صدارت سے ایسے ایسے مضحکہ خیز مطالبات منوانے میں پیش پیش رہتی ہیں جنہیں نہ عوام کی روزمرہ کی عام زندگی میں مشکلات اور مصائب کا احساس ہے اور نہ انہوں نے اس کی کبھی ضرورت سمجھی ہے۔ یہ مخلوط حکومت اپنا اقتدار قائم رکھنے کی خاطر اس بدترین کرپٹ نوکر شاہی کی گرفت میں ہے، جس نے پاکستان کو دنیا بھر کی کرپشن کا اول ملک قرار دیا ہے، جن کی دولت اتنی بے انتہاء ہے کہ ٹی وی چینلز نے متعدد بار اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کے کرپٹ سیاستدان اور نوکر شاہی اگر اپنی غیر ملکی دولت پاکستان میں واپس لے آئیں تو اس ملک کو غیر ملکی قرضوں کی ذرا ضرورت نہیں رہتی۔

یہ ہے پاکستان کی صورت حال کا مختصراً نقشہ جس پر ہمارا میڈیا جواب خود بھی بری طرح کرپٹ ہو چکا ہے، عوامی مسائل کو میڈیا سے خارج کر کے نام نہاد فوجی آپریشنز کی ضرورت، اس کی گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے آرمی چیف، تمام کور کمانڈروں اور بحریہ اور فضائیہ کے سربراہوں،

Marfat.com

وزیراعظم اور صدر صاحب کا غیر ملکی سربراہوں کو "آخری دہشت گرد" کے ختم کرنے کی یقین دہانی کرانا، پُرامن علاقوں پر جاسوس بمباروں کی بمباریوں کی تائید اور متاثرین کی دوبارہ آبادکاری کے مضحکہ خیز اعلانات، جب کہ جس کی وجہ سے پاکستان زیادہ سے زیادہ تباہی کی طرف قدم رکھ رہا ہے، وہ اس پر مطمئن نہیں جب کہ اس کے معمولی عہدیداروں کی ہر روز اسلام آباد آمد اور Do More کے تقاضے، یہ صورتحال آیا کہ کسی بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے یا تباہی کا، آئندہ کچھ عرصہ میں صورت حال سامنے آجائے گی، جبکہ امریکہ، بھارت اور اسرائیل کے پاکستان دشمن اتحاد ثلاثہ نے ہمارے اہم مسئلہ کشمیر کو اغیار کے آلۂ کار اقتدار پرست حکمرانوں کو یکسر بھول جانے اور بھلا دینے کے عمل میں مصروف رکھا ہوا ہے، جب کہ یہ مسئلہ بھی آئندہ چند ماہ میں پاکستان میں رونما ہونے والے کسی بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے، جس کی رو سے موجودہ حکمران بہہ جائیں گے یا پاکستان مزید تباہی کی طرف قدم رکھے گا۔

البتہ حالات یہی ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی بڑی تبدیلی ضرور رونما ہونیوالی ہے، کہ مالاکنڈ اور سوات سے نہ صرف ۲۰/۲۵ لاکھ کا بے گھر ہونا بلکہ اس تعداد میں مزید اضافہ ہونا، ایسی بڑی تبدیلی کا باعث ہوسکتا ہے، جنکی دوبارہ اپنے برباد شدہ گھروں میں بحالی کا سوچنا دور کی بات ہے، البتہ ان متاثرین کو جو جنگجو اور دلیر بھی ہیں، خیموں میں تکالیف ومصائب کی زندگی گزارنے کی بجائے کسی ایسے عمل پر اُبھار سکتی ہے جو ان لاکھوں بے گھر افراد کو حکومت کے خلاف ہر کارروائی پر اُبھار دے۔

بات تھی صوبہ سندھ میں پہلی صدی ہجری میں اسلام کی آمد کے بعد رقبہ کے لحاظ سے ملک کے سب سے بڑے، آبادی کے لحاظ سے بہت کم، معدنیات کے لحاظ سے مالا مال جس میں صرف گیس کے ذخائر کے معمولی استعمال نے جہاں ملک کو ایک بڑے بحران سے محفوظ رکھا ہے وہاں مرکز میں کرپٹ سیاستدانوں اور نوکر شاہی کو بے تحاشا دولت لوٹنے کے مواقع بخشے ہیں، لیکن اس سے بڑھ کر چھوٹی سی آبادی کو بھی تعلیم سے محروم رکھنا، وفاقی حکومتوں اور صوبہ کا سرداری نظام وہ جُرم ہے کہ جس نے تمام پاکستان کے وفاق کو اپنے قدرتی وسائل کو بروئے کار لانے اور ان سے استفادہ کرنے کی بجائے کرپٹ سیاستدانوں اور نوکر شاہی کو یہ مواقع بخشے کہ اغیار اور صیہونیت کے

Marfat.com

آلۂ کار بن کر ترقیاتی منصوبوں کے نام پر ایسے ناقابل بیان سودی قرضوں میں جکڑیں جو عالمی صیہونیت کا دنیا بھر میں سب سے زیادہ پسندیدہ کھیل ہے اور اسی میں پاکستان بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔

اب اس کے بعد آیئے ملک کے رقبہ اور آبادی دونوں لحاظ سے سب سے کم صوبہ سرحد کی طرف۔ برصغیر میں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اپنی حکمرانی قائم کرنے کے بعد اپنی دوراندیش حکمت عملی سے کام لیا اور صوبہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصہ کو آباد علاقہ قرار دے کر انہیں چھ ضلعوں میں ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان میں تقسیم کیا، اور ہر ضلع ماتحت تحصیلوں کے ساتھ انتظامی طور پر ڈپٹی کمشنروں کی تحویل میں دے دیا، اور دوسرا حصہ پشاور سے لے کر ڈیرہ اسماعیل خان تک جو افغانستان اور آباد ضلعوں کے درمیان تمام تر خشک پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور اس کے عوام مختلف قبائل کے نام سے صوبہ کے ہر ضلع کے ساتھ ملحق اور فطرتاً جنگجو ہیں، اُسے فاٹا (Frontier and Tribal Areas (FATA کا نام دے کر جہاں ایک طرف اپنے رسم و رواج کے مطابق جس میں انگریزوں نے سول انتظامیہ کو بے دخل کر کے جرگہ سسٹم کو رواج دیا گیا اُس علاقہ کو بھی جہاں، ایک طرف سول انتظامیہ کو بے دخل کیا گیا، وہاں ہر ضلع کے ملحقہ علاقہ کو ایک پولیٹیکل ایجنٹ اور ہر تحصیل کو ایک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا کہ وہ جہاں ان قبائلی سرداروں کو انگریزی حکومت کے خلاف نہ اُبھرنے دیں، وہاں اُن کو انگریزی حکومت مالی امداد بھی دیتی رہے، یہ تھی انگریزی حکومت کی دوراندیش حکمت عملی، کہ برصغیر میں اس صوبہ میں انگریزوں کے خلاف کوئی شورش برپا نہ ہوئی، جب کہ شمال میں سوات، دیر، چترال میں ریاستیں قائم کی گئیں۔ سوات کی ریاست کے حاکم کو والی سوات کا نام دیا گیا جو اسلامی تعلیمات سے آشنا ہونے کے ساتھ ریاست میں شریعت کا نفاذ چاہتا تھا، انگریزی حکومت نے اس سے کوئی تعارض نہیں کیا، دیر کی ریاست کے حاکم نواب دیر اور چترال کے حاکم مہتر خیال کے نام دیئے گئے، ریاست دیر اور چترال میں اگرچہ عوام اسلام کے شیدائی تھے، مگر دونوں ریاستیں شریعت اسلامی نافذ کرنے میں زیادہ رکاوٹ نہ تھیں، لہٰذا ان دونوں ریاستوں میں انگریزی قوانین ہی نافذ العمل رہے۔ جبکہ ریاست سوات میں موجودہ فوجی آپریشن جسے بڑھا

Marfat.com

کردیر کو بھی شامل کر دیا گیا، ملک پر مسلط امریکی جارحیت کی پرستار جمہوریت کے نام لیواؤں نے کہ سوات کے بعض دینی رہنما اسلام آباد میں اپنی طرز کی شریعت نافذ کرنا چاہتے تھے، جس کی وجہ سے وفاقی حکومت کو بڑا فوجی آپریشن کا فیصلہ کرنا پڑا حالانکہ معاملہ صرف اتنا تھا کہ سوات جہاں پہلے سے فقہ حنفی کے مطابق شریعت کے احکام نافذ العمل تھے اور امریکہ کی غلامی میں وفاق میں دین اسلام سے بے بہرہ نام نہاد اتحاد ثلاثہ کی مخلوط حکومت سوات سے شریعت کی حکومت کا خاتمہ چاہتی تھی، اپنے اس مکر پر پردہ ڈالنے کیلئے اوّلاً سوات امن معاہدہ کے نام سے جس میں یہ طے پایا تھا کہ سوات میں حسبِ سابق شرعی قوانین نافذ العمل رہیں گے، یہ معاہدہ طے پانے کے بعد اوّلاً امریکہ بہادر نے اس معاہدہ کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا، بعدازاں وفاق اور حکومت میں اتحاد ثلاثہ کے بیانات میڈیا میں آنے شروع ہوئے کہ امن معاہدہ میں شامل سوات کی دینی جماعتیں اپنی طرز کا شریعتی نظام اسلام آباد میں بھی نافذ کرنا چاہتی ہیں، جو محض معاہدہ امن سے فرار کی راہ اختیار کر کے سوات میں فوجی آپریشن کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس کے بعد میڈیا میں ایک اور ڈرامہ رچایا گیا کہ سوات امن معاہدہ کی جماعت نے ایک شرعی عدالت کے ذریعہ ایک شخص کو سنگسار کر کے اس کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کی۔ جس کی وجہ سے وفاقی حکومت مجبور ہوگئی کہ وہ سوات مالاکنڈ میں فوجی آپریشن شروع کرے جسکی تائید صوبہ میں قائم ولی خان خاندان کی عوامی نیشنل پارٹی نے بھرپور حمایت کر کے اتنے بڑے پیمانے پر اپنی تمام فوجی اور فضائی قوت استعمال کی کہ اسکے نتیجہ میں سرکاری میڈیا کی اطلاعات کے مطابق ۳۰/۳۵ لاکھ افراد بے گھر ہو چکے ہیں۔ لیکن حکومت اور آرمی چیف اور آئی ایس پی آر کے سربراہ جنرل اور امریکہ کے مقرر کردہ مشیر داخلہ کے یہی اعلانات دن رات میں سامنے آتے رہے ہیں کہ حکومت آخری دہشت گرد شدت پسند کا خاتمہ کر کے دم لیگی۔

اسی اثناء میں ایک اور دینی مکتبہ فکر کی طرف سے شوشہ چھوڑا گیا ہے کہ سوات مالاکنڈ کے دینی علماء نہ صرف مزارات کی بے حرمتی کرتے تھے بلکہ ان کو ڈھا رہے تھے، یہ وہ مذہبی دوکاندار ہیں جنہوں نے اولیاء کرام کی قبور کو قبر پرستی، پیر پرستی، اور ان کی یاد میں سالانہ عرس کی تقاریب منعقد کرتے ہوئے اپنی علیحدہ دوکانداری چمکائی ہے۔ جبکہ ان سے اختلاف کرنے والے کو جواں

Marfat.com

کی طرح فقہ حنفی کے حامل ہیں، ماسوائے اس کے کہ ان کا اختلاف قبر پرستی، پیر پرستی اور سالانہ عرسوں کے بارے میں ہو، وہ نہ بزرگوں کے وقار کو بڑھانے کے حامل ہیں اور نہ پختہ قبر کے خلاف، سب ہی حضرت علی ہجویریؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے علاوہ تمام معروف اولیائے کرام کے اتنے ہی معتقد ہیں جتنے یہ مذہبی دوکاندار دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اختلاف کی بنیادی وجہ اولاً اشترا کی ایمپائر کے زوال کے بعد افغانستان پر امریکی جارحیت، بعد ازاں امریکہ کا اپنے ناپاک عزائم کے حصول کے لئے پاکستان کی کرپٹ انتظامیہ اور اس کے ذریعہ پاک فوج کا اپنے ہی عوام کو دہشت گرد/ شدت پسند قرار دے کے نہ ختم ہونے والے فوجی آپریشنز ہیں، جس میں یہ مذہبی دوکانداران کے ساتھ شامل ہیں، یہ وہ دوکاندار ہیں جو بغداد و غزنی کو تباہ کر ڈالنے والے امریکہ کے خلاف آواز اُٹھانے کو تیار نہیں، جس نے پاکستان کو پاکستانی کرپٹ انتظامیہ اور نام نہاد جمہوریت کے ذریعہ تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے، لیکن جن عناصر نے بزعم خود، اپنے آپ کو واحد عالمی سپر پاور قرار دیا تھا، اس کے خلاف بظاہر کوئی فوجی قوت نہ ہونے کے باوجود محض تائیدِ ایزدی کے بھروسہ پر مدافعت کا فیصلہ کیا، ان کو دہشت گرد، شدت پسند، انتہاء پسند، طالب جو بھی نام دیا جائے، سپر پاور کے غرور کو خاک میں ملا رکھا ہے۔ جہاں تک کرپٹ انتظامیہ کا معاملہ ہے کرپٹ ہمیشہ کرپٹ رہا ہے، جو محض اپنا چندروزہ دنیاوی مفاد سامنے رکھتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ طبقہ بظاہر یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والا عملاً کھلا منکر ہوتا ہے۔ اس طبقہ کو ماضی کا سبق یاد دلانا بے سود ہے۔ یہ امریکہ ہی ہے جس کو صدر ایوب نے اپنا دوست قرار دیا تھا، لیکن بالآخر ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' مرتب کر کے پاکستان کے سیاستدانوں اور دانشوروں کو بتایا کہ امریکہ ہمارا دوست نہیں بلکہ ہمیں اپنا غلام اور آلۂ کار قرار دیتا ہے۔ جب کہ آرمی چیف کی مکمل سربراہی اور ہدایات کی تعمیل میں کور کمانڈروں کی زیرِ نگرانی یہ طویل فوجی آپریشنز اور ہر دوسرے چوتھے روز جاسوس طیاروں کی بمباریوں سے بیسیوں بے گناہ بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور عورتوں کی ہلاکت کے ساتھ نام نہاد صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف کے یہ دل دوز اعلانات کہ آخری دہشت گرد کے خاتمہ تک جس کا امریکہ کا

Marfat.com

افغانستان سے نکل جانے تک تصور کرنا بے سود ہے، پاکستان کی وہ بدترین کرپٹ جمہوریت اور بیوروکریسی ہے، جو ایک بار پھر باشعور اور اسلام و پاکستان دوست طبقہ کو یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ یہ تمام صورتحال جسکے نتیجہ میں ۳۰، ۳۵ لاکھ امن پسند اور بے شمار معزز گھرانے بے گھر ہو چکے ہیں، آیا کسی خیر کے انقلاب کا پیش خیمہ ہیں کہ یہ ملک مشیت ایزدی سے قائم ہوا تھا، اور شر کی تمام تر سازشوں اور اپنوں کی تمام تر کمزوریوں اور غدارانہ طرزِ عمل کے باوجود ان شاء اللہ قائم و دائم رہے گا۔

اب آیئے، آبادی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے پنجاب کی طرف...... قیام پاکستان سے قبل یہ صوبہ محکومانہ ذہنیت کے ساتھ بڑی اور چھوٹی زمیندار، اقتدار پرست برادریوں میں منقسم تھا، جب کہ قیام پاکستان کے بعد جہاں صنعتکاری کو کافی ترقی ہوئی ہے، وہاں برادریوں کی بنیادوں پر دولت برائے اقتدار اور اقتدار برائے دولت کے حصار میں بری طرح گھر گیا ہے، لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ہوسِ اقتدار میں محبوس برادریوں کی بنیاد پر اس طبقہ نے جس بری طرح سے مسلم لیگ کا نام استعمال کیا ہے اس وجہ سے مسلم لیگ کوئی نظریاتی جماعت نہیں رہی، بلکہ اقتدار کی جنگ لڑنے والی دو برادریوں کی باہمی چپقلش، ہر آمر کسی برادری کو اقتدار سے محروم کر کے اپنی آمریت مسلط کرتا ہے، چنانچہ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ اپنی آمریت کو نافذ العمل رکھنے کے لئے اس کے گرد ایک خوشامدی ٹولہ ہو، جو اس کے ہر جائز و ناجائز حکمنامہ اور خواہش پر آمنا و صدقنا کہے جو اسے اقتدار سے محروم ہونے والے مسلم لیگ گروہ سے دستیاب ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اقتدار سے محروم ہو جانے والا ٹولہ اپوزیشن بن جاتا ہے اور اسی میں ایک خوشامدی ٹولہ آمر کا خوشامدی مسلم لیگ ٹولہ بن جاتا ہے کہ یہ نام استعمال کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کسی زمانہ میں دولتانہ مسلم لیگ اور ممدوٹ مسلم لیگ تھیں اور پرویز مشرف کے دور میں اس کا حامی ٹولہ مسلم لیگ ''ق'' اور محروم ٹولہ مسلم لیگ ''ن''۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک صوبہ پنجاب کے برادریوں کی بنیاد پر حصولِ اقتدار کے بھوکوں نے قیام پاکستان کی باعث جماعت مسلم لیگ کو نقصان پہنچایا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پیپلز پارٹی، الطاف حسین کی ایم کیو ایم، صوبہ سرحد کی ولی خان کی اے این پی جو

Marfat.com

سب کی سب پاکستان دشمن اور اغیار کی آلہ کار جماعتیں مرکز میں متحد ہو کر عوام کی خواہشات کے برعکس حکومت پر مسلط ہیں، جن کے مشیر داخلہ اور وزیر خزانہ بھی اغیار کے مقرر کردہ ہیں۔

حکمران ایک طرف آزاد منش اور اسلام کے ۳۰، ۳۵ لاکھ صحیح پیروکاروں کو اپنے فوجی آپریشنز کے ذریعہ بے گھر کر کے اپنے خلاف نفرتوں کا جو طوفان لے آئے ہیں، وہ ایسا نہیں ہے جو اقتدار کے ان حریصوں کو اپنے اندھیرے مستقبل سے بچا سکے، ان میں سے ایک تہائی سے زیادہ ان کے اور ان کے سرپرستوں کے خلاف اُٹھ کر وہ طوفان لائیں گے کہ یہ دونوں اس میں پوری طرح بہہ جائیں گے۔ کمی صرف ایک لیڈر کی ہے، نامعلوم مشیت ایزدی کب اور کیسے یہ اعزاز بخشتی، کیا یہ مشیت ایزدی کا کمال نہیں کہ افغانستان میں ملاّ عمر کی شخصیت جس نے نہ کسی بڑی درسگاہ سے علمی فضیلت حاصل کی، نہ کسی چھوٹی یا بڑی فوجی ٹریننگ حاصل کی، آج نہ صرف پاکستان کے اپنے کندھوں پر سجانے والے فوجی ستارے والے آرمی چیف بلکہ اپنے آپ کو واحد عالمی سپر پاور کے دعویداروں کے بڑے اور چھوٹے ہر طرح کے جرنیلوں کے خلاف سب سے بڑا چیلنج ہے۔ جب کہ ان جرنیلوں کو جرنیل کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں مسلح افواج کا کمانڈر ہوتے ہوئے میر جعفر کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ ہے وہ صورت حال، جس سے اس وقت پاکستان گزر رہا ہے، جس کا قیام مشیت ایزدی سے اسلام کا قلعہ بننے کی شکل میں وجود میں آیا تھا، لیکن قیام کے بعد روزِ اول سے تاحال اس کے حکمران طبقہ اور ان کے خاندانوں کی بدعنوانیوں اور بدکرداریوں نے جن کا غیر مسلم اور سامراجی طاقتوں کے ساتھ تعاون اور بقا کا انحصار ہے، اسے عین تباہی کے گڑھے پر لا کھڑا کیا ہے، لیکن اس صورت حال کے باوجود عالم اسلام جس کی ۵۷ حکمران اکائیاں ہیں، یہی وہ واحد اسلامی ملک ہے جس کے تعاون سے کہنے کو پس ماندہ لیکن اسلام کے شیدائی افغانوں نے اشتراکی روسی ایمپائر کا شیرازہ تتر بتر کیا اور اب بھی یہی وہ ملک ہے جو حکمران طبقہ کی اور اس کی فوج کی تمام تر بدعنوانیوں کے باوجود افغان قوم کی پشت پر مغرور و متکبر نام نہاد واحد سپر پاور امریکہ کے خلاف سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کے عوام نے بدعنوان حکمرانوں کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دی، جب کہ

Marfat.com

دہشت گردی اور دیگر بے معنی اصطلاحات کے استعمال کے ساتھ نو سال سے واحد سپر پاور کو ایسی نہ ختم ہونے والی جنگ میں اُلجھا رکھا ہے کہ وہ ایران پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ جب کہ خود اس کے اپنے جرنیل جنگ بند کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد میں دوبارہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کا انڈیا کا مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد سرسید احمد خان کے بعد دیگر دینی اور مذہبی جماعتوں کا بیان کروں گا جنہوں نے برصغیر میں دینی مدارس کے قیام کو اوّلین ترجیح دی، جو اس ملک میں مسلمان بادشاہوں کی پانچ صد سالہ حکمرانی میں ناپید رہا ہے، لیکن اس سے قبل ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزوں کا برصغیر کا اقتدار سنبھالنے کے بعد اسے ''دارالحرب'' قرار دیا تھا اور یہ فتویٰ جاری کردیا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو کافر حکومت کے خلاف جہاد کی جنگ لڑنی ہوگی۔ اس فتویٰ کی تعمیل میں آپ کے ایک نامور مرید سید احمد آف رائے بریلی (بریلوی) نے ۱۸۳۱ء میں باقاعدہ جہاد کا اعلان کردیا، لیکن پیشتر اس کے کہ آپ انگریزوں کے خلاف جہاد کی جنگ لڑتے، پنجاب میں کافروں کی ایک دوسری حکومت سکھوں کی حکومت کے خلاف جہاد لڑنا پڑا اور آپ اپنے دیگر مریدوں کے ساتھ شہید ہوگئے اور اس کے ساتھ شاہ عبدالعزیز اور آپ کی تحریک ختم ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد دو علمی مکتبۂ فکر اپنی وسعت کے ساتھ میدانِ عمل میں آگئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان دو بڑے دینی مراکز نے برصغیر کی چھوٹی بڑی ہر بستی میں دینی مدارس کا ایسا جال پھیلا دیا جس سے مغرب کانپ اُٹھا ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دو مکتبہ فکر کے مؤسسین مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا احمد رضا خان بریلوی ہیں، ان میں دو اوّل الذکر علماء نے دیوبند میں دیوبندی مکتبۂ فکر کے عظیم مدرسہ کی بنیاد رکھی، جب کہ بریلی کے مقام پر مولانا احمد رضا خان کے مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی، جب کہ ان دونوں مراکز سے ایسی شخصیتیں فارغ التحصیل ہوئیں جو نہ صرف خود بڑی نامور ہیں، بلکہ خود انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے برصغیر ہند (پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش) میں بتدریج اپنے اپنے مسلک اور فکر کے مطابق گذشتہ ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں ہزار دو ہزار دارالعلوم قائم کرکے روایتی طور پر مسلمانوں جیسے نام رکھ کر پیدائشی طور پر مسلمان

Marfat.com

لیکن واضح طور پر اسلام اور اس کی تعلیمات سے عملاً عاری مسلمانوں کی بجائے بڑے بڑے جید علماء کرام اور لکھوکھا، علم اور عمل دونوں طرح کی روشنیوں سے مالا مال مسلمانوں کی نسلیں پیدا کر کے ہر طرح سے مادی اور عسکری برتر مغربی قوتوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے جبکہ اس کمی کو پورا کیا ہے جو نہ صرف برصغیر کی پانچ صد سالہ مسلمان حکومتوں نے عالم اسلام کو ورثہ میں دی تھی، بلکہ خلافت عثمانیہ نے بھی اپنی پانچ صد سالہ شاندار تاریخ میں جہاں تُرک مسلمانوں کی جرأت و بہادری کا لوہا منوایا، وہاں ان کو اور اپنے ماتحت مسلمان ممالک کو اسلامی دینی اور مذہبی تعلیمات سے عملاً محروم رکھ کر کمال اتاترک جیسے کھلے بے دین اور اسلام کے مرتد شخص کو محض اسلامی نام کے بل بوتہ پر پوری طرح اپنی خدائی کے ساتھ تُرک قوم پر حکمرانی کا موقعہ بخشا، کہ ملکی دستور کے مطابق ایک صدی کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہاں اسلام کا نام لینا جُرم رہا۔ (یہ سطور ترکی کے موجودہ جمہوری اسلامی انقلاب سے پہلے کی ہے، کیونکہ اس انقلاب کے بعد ترکی میں کمال ازم بتدریج رخصت ہو رہا ہے اور اسلام کی برکات عام ہو رہی ہیں۔) لیکن اسے اللہ تعالیٰ کا کامل احسان قرار دیا جانا مناسب ہوگا کہ بعض بلاوجہ مذہبی اختلافات کے باوجود برصغیر میں ہزار ہا مذہبی دار العلوم کا وجود بلکہ اس سے بڑھ کر بعض نام نہاد علماء کا منافقت کے ساتھ مالی مفادات کا حصول، کفار کی مادی و عسکری برتری کے مقابلہ میں ایسی مضبوط ریڑھ کی ہڈی ہیں کہ بفضل خدا رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر دنیا بھر میں بالخصوص عالم مغرب میں جبر و اکراہ کا تو اسلام میں کہیں وجود نہیں، لیکن مغربی حکمرانوں کے ظلم و تشدد کے باوجود خود ان کے ہم رنگ و ہم نسل غیر مسلم ہر روز اتنی بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں جس کا شمار ممکن نہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف امریکہ میں ۲۰ ہزار کے قریب امریکہ ہر سال اسلام قبول کر رہے ہیں۔

اس مضمون کی تحریر سے میرا مقصد مختصراً عظیم محقق اور دانشور جناب علی رہنما کی انگریزی کتاب Pioneers of islamic Revival کے حوالہ سے چند چیدہ چیدہ عظیم شخصیات بلاتفریق دو بڑے اسلامی مذاہب سنی اور شیعہ کی احیائے اسلام کی تحریکوں کی تاریخ ہے جو ذیل میں مجھ جیسے ایک غیر معروف صاحب قلم کی کاوش ہے، اس تحریک کی اولین شخصیت سید جلال الدین افغانی ہیں۔

Marfat.com

سید جلال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ کتاب میں آپ پر مضمون ایک مغربی خاتون نکّی۔ کے۔ کیڈی Nikki K. Keddie کا مرہون منت ہے۔ یہ خاتون ایران اور مڈل ایسٹ کے بارے میں ایک نامور محقق سکالر ہیں اور متعدد انعامات حاصل کئے ہیں۔ ایک سو سے زائد مضامین کے علاوہ آپ مندرجہ ذیل انگریزی تصنیفات کی مصنفہ ہیں:

(۱) سید جلال الدین افغانیؒ: مغربی سامراج کے جواب میں ایک اسلامی سیاسی شخصیت، ایران کے قاچار خاندان سے رضا شاہ پہلوی تک۔

(۲) ایرانی انقلاب کی بنیادیں اور اس کے نتائج:

مصنفہ کی سید جلال الدین افغانیؒ پر تصنیف کے حوالہ سے سیدؒ کی تحریک احیائے اسلام پر آپ کی شخصیت ذیل میں پیش ہے۔

آپ کا سال پیدائش ۳۹/۱۸۳۸ء ہے اور وفات کا سال ۱۸۹۷ء ہے، اس لحاظ سے آپ نے ۵۹ سال عمر پائی۔ آپ کی جائے پیدائش اور ابتدائی پرورش کے بارے میں آپ نے خود جو دعویٰ کیا ہے، اسے عموماً تسلیم نہیں کیا گیا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں آپ ایک ایران میں ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے، وہاں آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی ایران ہی میں ہوئی، یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ نے اپنے بارے میں اپنے برادرزاد کو مکاتیب لکھے اور اس نے آپ کی صحیح جائے پیدائش اور بچپن کی زندگی پر کتاب تصنیف کی۔ اس حوالے سے آپ کے دیگر کئی خطوط کے ساتھ کئی دیگر کتب اور مسودہ جات منصۂ شہود پر آئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں آپ کی ابتدائی تعلیم ایران میں ہوئی، وہاں آپ عراق میں شیعی مسلک کے مقدس مقامات پر بھی جاتے رہے اور شیعی مسلک کے علماء سے شیعی فلسفہ پر عبور حاصل کیا۔ جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں شیعیت کے شیخی فکر کے مراکز تھے۔

عالم عرب اور خلاف عثمانیہ کی مملکتوں میں جہاں یونانی فلسفہ ناپید تھا، ایران میں اس کی بھرمار تھی اور ایران کے علماء نے اپنے مذہبی سکولوں میں افلاطون، ارسطو اور دیگر یونانی فلسفیوں کے علاوہ ابو سینا کے فلسفہ کو نظامِ علم میں شامل کر رکھا تھا۔

Marfat.com

سید جمال الدین افغانی کی پیدائش کا وہ دور ہے جب اُمت مسلمہ اور عالم اسلام جہاں اپنے زوال کی انتہاء کو پہنچ چکے ہیں، وہاں یورپین ممالک کی مغربی نوآبادیاتی طاقتوں برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کا بتدریج مسلم ممالک پر اقتدار مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے، اس کی دو بڑی وجوہات یہ ہیں جن کا پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے، اوّلاً یہ کہ ان نوآبادیاتی طاقتوں کی مادی اور عسکری برتری ثانیاً مسلم ممالک کے عوام میں مذہبی تعلیم کے علاوہ کسی طرح کی تعلیم کا عظیم فقدان، جس نے بلاخوف عوامی گرفت اور آخرت کی جواب دہی سے عاری بعض موقع پرست خودغرض مادہ پرست اشخاص کو ان نوآبادیوں طاقتوں کا آلۂ کار بن کر مسلم ممالک کے عوام میں غیر محسوس غلامی کا پھندا گلے میں ڈالنے کا موقع بخشا۔ انہوں نے کسی قسم کی تعلیم، بالخصوص قرآن وسنت کی تعلیم کے فقدان سے ایسی بحثوں کے دروازے کھولے جنہوں نے مخلص قیادت کو اُوپر آنے کی بجائے خود اسلامی احکامات پر عمل کرنا تو کیا، خود نعوذ باللہ قرآن کریم کو وحیِ الٰہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے داعی برصغیر پر برطانوی سامراج کی حاکمیت کے حامی اور اپنی انگریزی تصنیف ''دی سپرٹ آف اسلام'' "The Spirit of Islam" کے مصنف مسٹر امیر علی ہیں، جنہوں نے اپنی شخصیت کو مقبول بنانے کیلئے اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ لگانے کا سہارا لیا ہے کہ سید کا خاندانی ربط بالآخر حضور اکرم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے، چنانچہ آپ سید امیر علی کے نام سے معروف ہیں اور ان کی گمراہ کن فکر کے مطابق قرآن کریم وحیِ الٰہی ہونے کی بجائے کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیا گیا ہے، اس حوالہ سے اس شخص نے اپنی تصنیف میں کیا کیا گمراہ کن دلائل دیئے ہوں گے، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، کہ اس بارے میں بڑے بڑے نامور مغربی مستشرقین ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں اور بیسیوں ایسے سکالر بھی عالم مغرب ہی کی پیداوار ہیں، جنہوں نے کھلے دل سے مطالعہ کیا اور نتیجتاً نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ انگریزی زبان کے علاوہ اپنی اپنی یورپین زبانوں میں تراجم کیئے۔

مسٹر امیر علی ۱۹۲۸ء۔ ۱۸۴۹ جن کے آباؤ اجداد ایران سے نادر شاہ بادشاہ کے لشکر کے ساتھ انڈیا نقل مکانی کی، اوّلاً اپنے آپ کو مسلمانوں کا ہمدرد ہونے کی حیثیت میں ایک سیاسی جماعت

Marfat.com

"نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کی، اس جماعت کے نام سے بھی "اسلام" خارج کیا۔ بعدازاں ایک اور جماعت سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جو بعدازاں مسلم لیگ میں مدغم ہوگئی۔

اسی دور کی برطانوی سامراج اور مغربی تہذیب کی دل دادہ برصغیر میں دوسری بڑی شخصیت سرسید احمد خان ہیں جن کی شخصیت اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کا تفصیل سے ذکر پیشتر ازیں کیا جاچکا ہے، اور ان کے ساتھ برصغیر میں ۱۸۵۷ء میں غدر کے نام سے اسلامی عناصر کی انگریزی سامراج کی قوت سے متاثر ہونے کے باوجود سید امیر علیؒ کے خلافِ اسلام، مذہبی عقائد کو جھٹلاتے ہوئے برصغیر میں مسلم اور غیر مسلم کا تشخص برقرار رکھ کر مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، وہاں اہل سنت والجماعت کے حنفی مسلک کے دو مکتبہ ہائے فکر نے علیحدہ علیحدہ دینی مراکز کی بنیاد رکھی۔ ایک نے دیوبند کے مقام پر اور دوسرے نے بریلی کے مقام پر، ان تینوں کا پیشتر ازیں تفصیل سے ذکر کیا جاچکا ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی کے نصف تک یہ وہ دور ہے جس میں تمام دنیا میں انگریز قوم کا کوئی حریف نہیں۔ جب کہ یہ قوم جس پر خود سب سے بڑی اسلام دشمن صیہونیت کا تسلط ہے، عالمی سطح پر کسی سطح پر اُمت مسلمہ میں کوئی چیلنج کرنے والا نہیں، کیونکہ اگر کسی اسلامی ملک میں اس قوم اور اس سامراج کے خلاف کوئی عناصر ہیں تو ان کی جدوجہد صرف ایک ملک تک محدود ہے، جب کہ ضرورت ہے کہ عالمی سطح پر اس کے خلاف نظریاتی طور پر ایک ایسی تحریک اُبھرے جس کے نتیجہ میں ہر آنے والی مسلم نسل اس کی جگہ لے کر نہ صرف انگریز قوم بلکہ اس پر مسلط عالمی صیہونیت کی بالادستی کو ملیامیٹ کرتی جائے۔

Marfat.com

1

سید جمال الدین افغانیؒ

Nikki R. Keddia (خاتون)

مشیت ایزدی سے اس نظریاتی ضرورت کو سید جمال الدین افغانی کی شخصیت ہی پورا کرتی نظر آتی ہے، جن کا سال پیدائش ۳۹/۱۸۳۸ء اور جائے پیدائش ایران کی کسی گمنام جگہ میں ہے۔ لیکن مقام تعجب ہے کہ ابھی آپ کی عمر صرف 19 سال تھی، کہ جب انگریز ۱۸۵۷ء میں اپنے خلاف آخری مختصر جنگ آزادی کو ناکام بنا رہے تھے، اس عمر میں سید صاحب کا انڈیا آنا اور انگریز قوم کے خلاف آپ کی جدوجہد، جو ریکارڈ پر موجود پہلی تقریر ہے وہ صرف آپ کی ۲۲ سال کی عمر میں ہے اور اس قوم کے خلاف آپ کی جدوجہد مرتے دم تک ہے۔ جو ان صفحات میں قارئین مطالعہ فرمائیں گے۔ جس میں کتاب کے مصنف علی رہنما نے کتاب کے علیحدہ علیحدہ دو جگہوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک کا عنوان "حدود سے ماورا پین اسلام ازم" ہے جو کتاب کے پیش لفظ سے ماخوذ ہے اور دوسرا آپ کی حیات پر خاتون کے مضمون سے ماخوذ ہے، لہٰذا اسی حساب سے دونوں کو علیحدہ علیحدہ پیش کیا جائے گا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ غدر کے نام سے انڈیا کے آزادی کے دل دادہ چند ہزار مسلمانوں نے کئی کروڑ مسلمانوں کی بے حسی اور ان عوام میں کسی مؤثر لیڈر شپ کے فقدان کی وجہ سے ناکام جنگ لڑی۔ آپ کا ردِ عمل اس نوعمری میں انڈیا کی مسلم لیڈر شپ کے خلاف تھا، اس کی

Marfat.com

بڑی وجہ یہ تھی کہ انڈیا کی مسلم لیڈر شپ اب تمام اُمت مسلمہ کا ایک وجود ہونے کی بجائے صرف انڈیا کے مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، جب کہ آپ ایران سے انڈیا آئے تھے، اور یہاں آ کر اندازہ کیا کہ اس ملک کی لیڈر شپ اس اسلام دشمن مکار قوم کا کیا مقابلہ کرے گی، کہ اگر کسی شخصیت میں لیڈر شپ کی خلوص کے ساتھ کچھ صلاحیتیں ہیں تو وہ نو آبادیاتی استعمار سے مرعوب ہونے کے ساتھ من حیث القوم اُمت مسلمہ سے قطع کرنا ہے، جسے دوسرے معنوں میں وطن پرستی یا قوم پرستی کہا جا سکتا ہے، جس کی سید جمال الدین افغانی نے اپنے قول و عمل تردید کرتے ہوئے پین اسلام ازم کے نام سے تحریک احیائے اسلام کا آغاز کیا اور جسے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اسلام اور قرآن کریم اور خاتم النبیین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی روشنی میں اپنے اس لافانی شعر میں سمویا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

چنانچہ برطانوی امپریلزم کے خلاف عالمگیر سطح پر آپ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اسلامی بین الاقوامیت یا پین اسلام ازم کی بناء ڈالی اور اس کو مقبول بنانے کے لئے اپنی فکر کے مطابق تمام اسلامی ممالک میں گئے، جب کہ اس دور میں کوئی ویزا کی پابندی تو نہ تھی، لیکن اگر کسی حکومت کے خلاف کسی نے کوئی بات کی، تو اس حکومت نے اس کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ چنانچہ آپ کے ساتھ زندگی بھر ایسا سلوک ہوتا رہا۔ البتہ آپ کی زندگی مختلف مراحل کی آئینہ دار ہے، جب کہ آخری دور دنیا میں اسلام کی بالادستی منوانا ہے۔ شروع میں آپ عام طور پر مغرب کی اصلاحات کے معترف نظر آتے ہیں بعد ازاں آپ اسلام کا یورپ میں مضبوط دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ ۱۸۸۲ء میں پیرس میں ہیں کہ ایک فرانسیسی جرنلسٹ ارنسٹ رنیان Earnest Ranan نے پیرس کے ایک میگزین میں آرٹیکل لکھا کہ اسلام سائنس کے خلاف ہے۔ جس کے جواب میں سید صاحب نے لکھا کہ عالم مغرب جو عیسائی مذہب کا پیروکار ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام کئی صدیاں بعد آیا۔ کیا اسلام کی آمد سے قبل عالم مغرب میں سائنس کا وجود

Marfat.com

ہے؟ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مذاہب کی بنیاد اخلاقیات اور اخلاقی اقدار ہے، لیکن اپنے پیروکاروں کو سائنس اور ایجادات سے نہیں روکتے، اگر اسلام کی آمد سے قبل یورپ سائنس سے خالی تھا تو وہ سائنسی علم کی کمی تھی نہ کہ مذہبی رکاوٹ۔

اس دور میں آپ برطانیہ دُشمن ہونے کے باوجود سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے برطانوی سیاسی خاندان کے لیڈر رینڈولف چرچل Randolph Churchill سے بھی ملاقات کرتے نظر آتے ہیں جس کا کسی دور کے مسلمان سیاسی رہنما تصور تک نہیں کرسکتے۔ اس لحاظ سے وہ پہلے عالمی اسلامی مفکر ہیں جن کے ذہن میں اُمت مسلمہ کی وحدانیت ہے اور اسے پین اِسلام ازم کا نام دیا گیا ہے۔

انگلینڈ میں رینڈلف چرچل سے ملاقات کے بعد ایران سے انڈیا، پھر سرزمین حجاز، اس کے بعد شیعی مقدس مقامات (عراق) اس کے بعد پھر ایران، ایران سے افغانستان، یہاں سے اوّلاً بمبئی، پھر قاہرہ اور یہاں سے استنبول (ترکیہ) لیکن ۱۸۷۱ء میں حکومت ترکیہ نے ان کے بعض بیانات کی وجہ سے ترکیہ بدر کردیا، جہاں سے آپ ایک بار پھر قاہرہ، حیدرآباد (انڈیا) لندن، پیرس، پھر لندن، تہران، روس، سینٹ پیٹرس برگ، میونخ (جرمنی)، بغداد، بصرہ، لندن اور بالآخر استنبول آئے، جہاں آپ نے ۱۸۹۷ء میں کینسر کے مرض سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

آپ کے یہ تمام سفر جن کا انیسویں صدی کے نصف سے صدی کے آخر تک تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اور کیا کیا صعوبتیں برداشت کیں، کچھ اغیار کے ہاتھوں، کچھ اپنے ہی ہم مذہب کے ہاتھوں، جن میں ہر طبقۂ خیالات کے افراد سے ملاقاتیں، جس کے نتیجہ میں بعض اوقات متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے شواہد بھی آپ کی زندگی میں ملتے ہیں، لیکن بعدازاں آپ اصل اسلام کی طرف لوٹ آتے ہیں، لیکن جب آپ اس طرف لوٹ کر آتے ہیں تو جس دنیاوی مفاد پرست طبقہ کے مفاد پر آپ جیسے اسلام کے دلدادہ مخلص شخص کے کردار سے زد پڑتی ہے، جہاں وہ آپ کا دشمن ہوکر ملک بدر کرتا ہے، وہاں سید صاحب اپنے مخلصانہ کردار سے اپنے پیچھے اپنے

Marfat.com

مریدوں کا ایسا مخلص مضبوط کردار کا حلقہ چھوڑ جاتے ہیں جو بین الاقوامی اسلامی وحدانیت کا داعی ہے، جسے پین اسلام ازم کا نام دیا جائے، یا تحریک احیائے اسلام...... آپ نے ۱۸۹۷ء میں وفات پائی اس حساب سے آپ کو وفات پائے کوئی ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہو چلا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں اغیار کی ریشہ دوانیوں اور اُمت میں بے تحاشا دولت کی بارش اور میڈیا میں اپنی پبلسٹی اور اسلحہ کے بل بوتہ پر مختلف الفاظ کا بہانہ لے کر کمزور مسلم ممالک کو اپنی جارحیت کا بہانہ بنا کر عالم گیر تحریک اسلامی کو مٹانے کی کوششیں کی ہیں، اس کا مٹانا تو درکنار، اب خود مغربی جارحیت اپنے آخری دنوں میں ہے، جس کا سہرا سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے سر پر ہے، اسلام ازم یا تحریک احیائے اسلام ہے اور آپ کی زندگی پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

۱۸۷۱ء میں خلافت عثمانیہ کے دور میں ترکیہ میں آپ نے ۷۰-۱۸۶۹ء میں مملکت سے بدر کئے جانے سے قبل "اصلاحات تنظیمات" کے نام سے کچھ اصلاحات جاری کرائیں۔ پھر ۱۸۷۹ء میں مصر میں اعرابی پاشا کے ذریعہ قومی تحریک چلائی، ۱۸۸۱ء میں انڈیا میں سرسید احمد خان نے انگریزوں اور برطانوی حکومت سے انڈیا کے تمام مسلمانوں کے تعاون کی تحریک شروع کی۔ آپ نے سرسید کی سخت مخالفت کی۔ ۱۸۹۱ء میں آپ نے ایران میں برطانیہ مخالف تمباکو تحریک کی حمایت کی۔

بعض سکالرز ۱۹۶۳ء میں آپ کے بارے میں ناقابل تردید دستاویزات اور تحریریں منصۂ شہود پر لائے ہیں جو اگرچہ ثابت کرتی ہیں کہ آپ ایران میں ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے اور ابتدائی پرورش کے علاوہ شیعی مسلک کی تعلیم حاصل کی، لیکن پین اسلام ازم یا تحریک احیائے اسلام کے معاملے میں آپ نے شیعہ سنی کی تفریق کو ایسے ختم کیا کہ دونوں مسالک کے اکابرین آپ کو اپنا ہم مسلک قرار دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا کہ ۷۱-۱۸۶۹ء میں ترکیہ میں مقیم رہے، تا آنکہ ۱۸۷۱ء میں

Marfat.com

ترکیہ بدر کردیئے گئے۔ اس مختصر قیام کے دوران آپ کا جن بڑی ترک شخصیتوں سے رابطہ قائم ہوا، ان میں سے ایک مغربی سیکولر ذہن کے مالک منیف Munif ہیں جو کونسل آف ایجوکیشن کے صدر تھے، اور دوسرے نئی سائنسی یونیورسٹی کے ڈائریکٹر تحسین تھے، ان دونوں اداروں کے سربراہ یہ دونوں اصحاب چونکہ مغربی سیکولر ذہن کے مالک تھے، جن کی تُرک علماء مخالفت کررہے تھے، لیکن سید صاحب نے ان دونوں اصحاب کو اسلامی رنگ میں ڈھال کر ۱۸۷۰ء میں یونیورسٹی کا قیام ممکن بنادیا، وہاں یونیورسٹی کے قیام کی تقریب بھی آپکی افتتاحی تقریر سے ہوئی۔ اس تقریر میں آپ نے مغربی اصلاحات کی تعریف بھی کی جبکہ ترک حکومت نے ۱۸۷۰ء میں ایک بلند مرتبت شخصیت جان کر عثمانی تعلیمات کونسل میں آپ کو تعلیمی مشیر مقرر کردیا، لیکن بعدازاں آپ کے حاسدین نے حکومت عثمانیہ کو آپکے خلاف کردیا، جسکے نتیجے میں آپ کو ۱۸۷۱ء میں ترکہ بدر کردیا گیا۔

ترکیہ بدر ہوکر آپ اسی سال ۱۸۷۱ء میں مصر چلے آئے اور یہاں ۱۸۷۹ء تک رہے اور یہاں سے بھی ۱۸۷۹ء میں مصر کے حکمران خدیو توفیق پاشا نے جو برطانیہ نواز تھا، آپ کو اگست ۱۸۷۹ء میں مصر بدر کردیا، یہ آپ کا ۱۹ سال کی عمر میں ایران اپنے اصل وطن سے رُخصت ہو کر کسی ملک میں سب سے طویل قیام تھا۔ اس وقت مصر شدید اقتصادی بحران سے دوچار تھا، ملک خدیو توفیق سے قبل ملک میں خدیو اسماعیل کی حکومت تھی، اور یورپین ممالک کے قرضوں کا شدید دباؤ تھا، جنہیں حکومت عوام پر زیادہ سے زیادہ ٹیکسوں اور دیگر مالیاتی عوامل کے ذریعے کم کرنا چاہتی تھی، جب کہ ضرورت تھی کہ حکومت خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو اور ان دانشوروں اور ماہرین معیشت کو ساتھ لے کر ایسی اصلاحات سے کام لے جو اس دباؤ سے نجات دلائے۔ اس سلسلہ میں قرونِ وسطیٰ کا اسلامی دورِ نظام مالیات ہی مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ جو اس دور کے صاحب علم علماء مہیا کرسکتے تھے۔ مصر اپنی آمد کے بعد آپ نے جلد ہی ایک ایسا مؤثر حلقہ قائم کرلیا، جو مغرب کی عیسائی ماڈرن ازم کے خلاف برطانیہ مخالف بھی تھا۔

۱۸۶۹ء میں ترکیہ آنے سے قبل آپ انڈیا اور دیگر نامعلوم سفروں کے بعد ۱۸۶۶ء میں افغانستان آئے، جہاں آپ افغانیوں کے لئے غیر معروف تھے اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولتے

Marfat.com

تھے، جو افغانستان کی سرکاری زبان تھی، یہاں آپ نے افغان حکمران جو بادشاہ کی بجائے امیر کہلاتے تھے، امیر اعظم خان سے تعلق قائم کیا، اور برطانیہ مخالف ہونے کی وجہ سے اُسے مشورہ دیا کہ برطانیہ کی بجائے روس کی حکومت سے تعلق قائم کرے، دستاویزی شہادتیں بھی یہی کہتی ہیں کہ آپ نے امیر اعظم خان پر کسی مذہبی یا دیگر اصلاحات پر زور نہیں دیا، لیکن ۱۸۶۸ء میں امیر شیر علی نے حکومت کا تختہ اُلٹ دیا، جو بہت زیادہ برطانیہ نواز تھا، اور سید صاحب کو برطانیہ مخالف سمجھ کر دسمبر ۱۸۶۸ء میں ملک سے نکال باہر کیا، جہاں سے آپ بمبئی، قاہرہ ہوتے ہوئے ۱۸۶۹ء میں استنبول آئے۔ آپ ۱۸۷۱ء تک ترکیہ میں رہے جہاں سے آپ ملک بدر ہو کر مصر چلے گئے، جس کا مختصر ذکر اوپر آچکا ہے اور اب تفصیلی ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۸۷۱ء میں ترکیہ بدر ہونے کے بعد مصر آپ کی آمد مصر کے معروف سیاستدان ریاض پاشا کی مرہون ہے، جنہوں نے نہ صرف آپ کو مصر بلایا، بلکہ سرکاری وظیفہ کا اہتمام بھی کیا کہ وہ باشعور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت بھی کریں۔ یوں تو اَن گنت نوجوانوں نے آپ سے فیض حاصل کیا جسے آپ کے حلقہ مریدین کہا جا سکتا ہے، لیکن محمد عبدہ بالخصوص قابل ذکر ہیں جو بعد از اں عالمی تحریک احیائے اسلام کے داعی کی شکل اختیار کر گئے، اور آپ کی شخصیت کے بعد جناب محمد عبدہ کی زندگی کے حالات بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

ایک عشرے کے قریب مصر میں قیام میں آپ نے بین الاقوامی اور عالم اسلام کی سطح پر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں سیاسی امور پر اخبارات اور جرائد میں نہ صرف مضامین شائع کرنے کی حوصلہ افزائی کی بلکہ پین اسلام ازم جسے تحریک احیائے اسلام کا نام دیا جانا مناسب ہوگا، اپنے عرصۂ قیام میں نہ صرف سیاسی شعور بیدار کیا، بلکہ اقتصادی مسائل جن کی وجوہات ٹیکس اور داخلی و خارجی اُمور کی وجہ سے ملک میں بڑھتا سیاسی بحران تھا، سید صاحب خاموشی سے دو طریقوں کو بروئے کار لائے۔ اوّلاً ایک ایسا مؤثر سیاسی طبقہ جو بڑی خاموشی سے حکومت کو تبدیل کر سکے، اس میں آپ نے عوام کو اپنے زورِ خطابت سے متاثر کیا، ثانیاً آپ نے فری میسن تحریک Free Mason کے انداز پر حکومت کا تختہ اُلٹنے والا انداز عمل میں لانا۔ لیکن آپ کے اس عمل سے خدیو

Marfat.com

اسماعیل کی حکومت کا تختہ تو اُلٹ گیا، لیکن ۱۸۷۹ء میں اس کی جگہ خدیو توفیق پاشا کے نام سے مصر کو جو حکمران میسر آیا، وہ بھی برطانیہ نواز تھا، جس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد آپ کو مصر بدر کر دیا، لیکن اپنے دورانِ قیام آپ نے مصر میں جو سیاسی اثرات و فکر قائم کئے تھے، انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف عوام میں مستقبل کے لئے نہ ختم ہونے والے جذبات پیدا کر دیئے۔ اس میں ایک وہ طبقہ پیدا ہوا، جو سیکولر ذہن کا مالک ہونے کے ساتھ مصری قوم پرستی کے نام پر برطانیہ نواز حکومتوں کے تختے اُلٹ دینا اور اقتدار پر قبضہ کرنا، اپنا مشن قرار دیتا ہے، دوسرا سراسر بین الاقوامی اسلامی اُخوت اسلام کے ساتھ صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم کرنا اپنا لائحہ عمل قرار دیتا ہے جس میں کسی سازش اور فساد و قتل و غارت گری کا دخل نہیں، جو ایک طویل عمل کا متقاضی ہے۔ چنانچہ مصر میں سیاسی عمل اس دوسرے طریقے سے ''اخوان المسلمون'' تحریک کے نام سے کر رہا ہے۔

مصر بدر ہو کر آپ ۱۸۷۹ء میں انڈیا کی مسلم ریاست حیدر آباد (دکن) چلے آئے جہاں آپ دو سال رہے، جہاں آپ نے فارسی میں متعدد مضامین تحریر کئے لیکن ایک اہم مضمون جس کا بعد ازاں عربی میں ترجمہ ہوا، اور انگریزی میں "The Refutation of the Materialist" ''مادہ پرستوں کی تردید میں'' کے عنوان سے ہے، اس مضمون میں سید صاحب بڑے اچھے پیرائے میں عوام کو مخاطب کرتے پائے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں آپ پہلی مرتبہ مذہب بالخصوص اسلام کا دفاع کرتے آتے ہیں، بالخصوص ان اصحابِ فکر کے خلاف جو کہنے کو نام لیوا مسلمان، لیکن فی الحقیقت ناپختہ اسلامی فکر کے مالک ہیں۔ لیکن بعض لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ آپ نے بلاواسطہ یہ رویہ عوام میں کیوں نہ اپنایا، حالانکہ جن صاحب نے سید صاحب کی زندگی پر جو مضمون تحریر کئے ہیں، وہ خود خیال کریں کہ نہ وہ اس ملک کے شہری ہیں اور نہ اس زبان میں جو اس ملک کی زبان سے مختلف ہے، اور پھر اس حکومت کے خلاف کس وجہ سے اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں۔

مصر بدر ہونے سے قبل آپ مختلف عوامل کا مظہر ہیں (جب کہ ہونا بھی چاہئے تھا کہ بدر ہونے سے قبل آپ کی عمر ۴۷، ۴۸ سال ہے، پھر جہاں جہاں جاتے ہیں وہ کہنے کو اسلامی، لیکن حکومتیں برطانیہ نواز ہونے کے علاوہ عدم استحکام اور مختلف بحرانوں کا شکار ہیں، جب کہ آپ

Marfat.com

برطانیہ مخالف ہونے کے باوجود علم و تحقیق کے عمل میں ہیں، آپ حیدر آباد دکن آ کر دو سال پورے سکون کے ساتھ گزار کر یہ سمجھ پاتے ہیں کہ عالم گیر سطح پر سیاسی میدان ہی نہیں بلکہ علمی میدان میں بھی اس شاطر برطانیہ کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ ایسے میں آپ عملی میدان میں عالم اسلام میں اسلامی مذہبی اقدار کو مستحکم کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور سیاسی میدان میں تمام اُمت مسلمہ کو ''جسد واحد'' قرار دے کر پین اسلام ازم کی تحریک جاری کرتے ہیں جو دوسرے معنوں میں تحریک احیائے اسلام ہی ہے۔ جس سے پہلے یورپی نوآبادیاتی طاقتیں ''تلوار کے جہاد'' کے بغیر خوف زدہ تھیں اور اپنے تحفظ کے لئے برصغیر میں جاگیرداری طبقہ پیدا کیا، جو مذہب اور مذہبی اقدار سے عاری نرامادہ پرستی اور عیش و عشرت کا شکار رہے اور برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں مشیت ایزدی سے پاکستان نام سے جو ملک وجود میں آیا، شروع روز سے یہی طبقہ اور اسکی ہوا خواہ بیوروکریسی کبھی آمریت کے پردہ میں، کبھی جمہوریت کی آڑ لے کر انتظامیہ پر حاوی ہیں، لیکن ہر طرح کی بالادستی کے باوجود اسکے خلاف تحریک احیائے اسلام بھی بڑی خاموشی سے کام کر رہی ہے۔ جس سے یورپی نوآبادیاتی طاقتوں کے بعد اپنے آپ کو واحد عالمی سپر پاور امریکہ بُری طرح خوفزدہ ہے۔

ایک دور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء تا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا ہے، جس میں تحریک احیائے اسلام کے خلاف عملاً متحارب ہونے کی بجائے اوّلاً اپنی حریف سپر پاور روس کی اشتراکی ایمپائر کا خاتمہ ہوتا ہے، جب کہ مسلم ممالک میں کرنل ناصر، عراق کے صدر صدام حسین جیسے لادین آمروں کی سرپرستی کر کے تحریک احیائے اسلام کو مٹانا مقصود ہے، اب بزعم خود ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حقیقی یا فرضی واقعہ کے نتیجہ میں قبل ازیں روسی اشتراکی ایمپائر کا خاتمہ ہو چکا تھا، پھر مصر میں کرنل ناصر کی لادین آمریت جس نے ''اخوان المسلمون'' کی تحریک احیائے اسلام کو ختم کرنا اپنا مقصد قرار دیا۔ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ سے قبل عالم عرب میں ''ناصر! ناصر!'' کا دور دورہ تھا، اس چھ روزہ جنگ نے اس کا اور اس کی آمریت کا بری طرح سے جنازہ نکال دیا۔ لیکن تحریک احیائے اسلام بہ فضل خدا بدستور زندہ اور متحرک ہے، جس کے پاس نہ کوئی اسلحہ ہے اور نہ اسلحہ کے ذریعہ اپنی فتح پر یقین رکھتی ہے، بلکہ عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور خلوص

Marfat.com

پیدا کرنا ہے جو برائیوں اور بری حکومتوں کے دور میں طویل عمل ہے، جس کا مظاہرہ اس ملک کے علاوہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی دیکھنے میں آرہا ہے۔

سید صاحب کی پین اسلام ازم کی اس تحریک نے خلافتِ عثمانیہ کے ترکیہ میں نامق کمال جیسے ترک قوم پرست کو بھی پین اسلام ازم کا حامی بنا دیا، جس سے آپ ترکیہ بدر ہونے سے قبل اُسے اپنے نظریات سے متاثر کر چکے تھے۔ اسی طرح ۱۸۷۸ء میں روس کے ہاتھوں خلافتِ عثمانیہ کی شکست، ۱۸۸۱ء میں فرانس کا تیونس پر قبضہ اور ۱۸۸۲ء میں برطانیہ کے مصر میں عمل دخل نے جہاں یہ ظاہر کر دیا کہ مغرب اور مغربی اقوام بظاہر علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن فی الحقیقت عالم اسلام اور اُمت مسلمہ کو اپنا مقبوضہ قرار دیتے ہیں۔ وہاں اُمت مسلمہ کو ایک اُمت کے طور پر پین اسلام ازم تحریک کو مضبوط کرنا ہوگا، جبکہ مصر بدر ہونے کے بعد آپ نے انڈیا میں حیدر آباد (دکن) آکر سرسید احمد خان کو ایک ریفارمر کے طور پر تسلیم نہیں کیا، بلکہ انہیں برطانیہ کا گماشتہ قرار دیتے ہوئے ان مذہبی جماعتوں کی حمایت کی جو برطانیہ مخالف تھیں، اور آپ کا حیدر آباد دکن کے قیام میں ''مادہ پرستی کی تردید میں''، مضمون بھی درحقیقت برطانیہ کے خلاف پین اسلام ازم ہی کا مرقع ہے۔

کوئی ۱۸۸۲ء میں آپ حیدر آباد دکن کو خیر باد کہہ کر لندن چلے آئے۔ لندن میں بھی آپ کا قیام مختصر رہا اور ۱۸۸۳ء میں پیرس چلے گئے جہاں آپ نے اپنے شاگرد محمد عبدہٗ سے مل کر عربی رسالہ ''العروۃ الوثقیٰ'' (مضبوط سہارا) کے نام سے جاری کیا۔ جس کو جاری رکھنے کیلئے آپ مالی مدد کر رہے تھے، جبکہ رسالہ تمام عالمِ عرب کی معروف شخصیتوں کے علاوہ ہر حلقہ میں بلاقیمت جاری تھا۔ جب کہ اسکے مضامین مصر اور سوڈان میں برطانوی مداخلت کے خلاف تھے۔ آپ نے رسالہ میں مسلم ممالک کے درمیان باہمی اتحاد کے علاوہ خلافت عثمانیہ کے سلطان عبدالحمید ثانی کی بھی حمایت کی اور اُمت مسلمہ کو جذبۂ اتحاد سے سرشار کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔

یہ رسالہ ایک سال سے زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اوّلاً یہ کہ کسی مالی منفعت کی بناء پر نہیں بلکہ نظریہ کے حامیوں کی مالی مدد جاری نہ رہی، ثانیاً یہ کہ مصر اور انڈیا میں داخلہ پر پابندی، بعض اصحاب کے خیال میں پہلی وجہ سے اور بعض اصحاب کی رائے میں دوسری وجہ سے لیکن اصل

Marfat.com

میں دونوں وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے خود برطانیہ میں عالم اسلام کے حامی برطانوی سیاستدانوں کو اپنی حمایت میں لینے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ جن میں مشہور برطانوی سیاستدان ولفرڈ بلنٹ Wilfrid Blunt کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔ ولفرڈ بلنٹ جیسے غیر جانبدار برطانوی سیاستدانوں نے عالم اسلام کے معین بے شعور سیاستدانوں کو عجیب مخمصہ میں ڈال دیا، کہ بجائے اس کے کہ وہ سید صاحب کی حمایت کرتے، انہوں نے آپ کو برطانوی حکومت کا ایجنٹ تک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ جو زیادہ زور نہ پکڑ سکا۔ اس کے بعد خلافت عثمانیہ کے سلطان عبدالحمید ثانی کی حمایت بھی شروع کی کہ آپ کی خلافت برطانیہ کے خلاف ہے اور اس ضمن میں آپ نے پیرس میں ''العروۃ الوثقیٰ'' میں مضامین بھی تحریر کیے۔ لیکن دونوں باتوں سے آپ کو کچھ حاصل نہ ہوا کہ آپ کو آپ کے روسی معتقد اخبار نویس قارقوف Karkov سے روس آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا، چنانچہ آپ براستہ ایران چند ماہ کے لئے روس گئے، لیکن جلد ہی اوّلاً بوشہر اور بعدازاں تہران منتقل ہو گئے۔ یہاں آپ کو ایران کے وزیر اشاعت کے ذریعہ شاہِ ایران کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ لیکن جلد ہی شاہ نے غالباً سخت برطانیہ مخالف ہونے کی وجہ سے ایران بدر کر دیا۔ اور ایک بار پھر آپ روس لوٹ آئے اور کوشش کی کہ مؤثر شخصیتوں کو اعتماد میں لے کر روسی حکومت کو انڈیا میں برطانوی حکومت کے خلاف جنگ پر آمادہ کریں، جو ناکام رہی۔

سید صاحب کی فطرت میں نا اُمیدی نام کو نہ تھی، آج جو لوگ ان کے دوست ہیں، کل انہی کے مخالف اور پھر ایک بار پھر آپ کے دوست۔ ۱۸۸۹ء میں شاہِ ایران روس کے دارالحکومت سینٹ پیٹرس برگ میں زار سے مل کر یورپ گئے، آپ بھی اس دوران ایران بدر ہو کر روس میں تھے اور آپ کو معلوم ہوا کہ شاہ جرمنی کے پایۂ تخت میونخ Munich میں ہے، آپ بھی پیچھے پیچھے میونخ پہنچ گئے، اور شاہ کے ساتھ سفر میں جو ان کا عملہ تھا، ان میں سے بعض کے ساتھ آپ نے تعلق قائم کر لیا، کہ شاہ نے روس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے برطانیہ کو جو مراعات دی تھیں ایران اس میں دخل نہ دے۔ چنانچہ اس عملہ نے شاہ کو سید صاحب کے حق میں ہموار کر لیا اور شاہ نے آپ کو ایران آنے کی ایک بار پھر دعوت دی۔ سید صاحب پہلے پیٹرس برگ آئے

Marfat.com

اور روسی حکومت کو یقین دلایا کہ ایران کے وزیر اعظم نے انہیں روس اور ایران کے درمیان خوشگوار تعلقات بہتر بنانے کا مشن سونپا ہے۔ گو جب آپ ایران پہنچے تو ایرانی وزیر اعظم نے اس کی تردید کی، لیکن آپ سینٹ پیٹرس برگ سے ایران آ گئے، ایران آ کر آپ نے خوب محسوس کر لیا کہ آپ حکومت پر ذرا اثر انداز نہ ہو سکیں گے، چنانچہ آپ نے اس سے بالکل ہٹ کر ان اصحاب فکر کو یکجا کیا جو ملک میں اصلاحات نافذ کر کے ملک کی بہتری کی طرف قسمت بدل سکیں گے، اور ان کو باقاعدہ طور پر ان مشوروں پر عمل پیرا کیا، جیسا کہ قبل ازیں آپ مصر میں آزما چکے تھے۔ آپ کے ان مشوروں نے تجارت پیشہ طبقے، دانشوروں اور مذہبی علماء کو حکومت کے خلاف طوفان اُٹھا کھڑا کیا، لیکن پیشتر اس کے کہ حکومت آپ کو ایران بدر کر سکے، آپ نے تہران کے جنوب میں ایک گمنام مذہبی خانقاہ میں پناہ لے لی اور یہاں سے آپ نے اپنی دعوت اور حکومت کا غیر ملکی حکومت کو مراعات دینے کا سلسلہ ختم کرنے کا مشن جاری رکھا اور ان مراعات کے خلاف آپ نے ایک پمفلٹ ایران بھر میں پھیلا دیا تھا جس سے شاہ کی حکومت بوکھلا اُٹھی اور آپ کو جبراً ایران سے عراق بدر کر دیا، لیکن اب ایران کے عوام وخواص میں سید صاحب کی شخصیت اتنی عزت کا مقام بنا چکی تھی کہ یہ کارنامہ شاہ کی حکومت کو بڑا مہنگا پڑا، کہ بادشاہ کا ایک معزز شخص سے اور پھر ایک ''سید'' سے جسے تمام دنیا کے مسلمانوں میں بڑا عزت کا مقام حاصل ہے، یہ سلوک کرے۔ اس نے ایران کے عوام میں حکومت بالخصوص شاہ کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ اُدھر سید صاحب نے بھی عراق آ کر ایران میں تجارت پیشہ اپنے مریدوں اور علماء کو بادشاہ کی طرف سے یورپی حکومت کو مراعات دینے کے خلاف خطوط لکھنے اور پمفلٹ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے لندن آ کر بھی شاہ کے خلاف یہ پروپیگنڈا جاری رکھا۔

آپ کے نزدیک مغرب اور اس کے نوآبادیاتی استحصالی نظام کے خلاف ایران کی سرزمین اور اس کا باشعور طبقہ اور علماء اس نظام کو ہلا دینے کے لئے بڑی عمدگی سے استعمال کئے جا سکتے تھے، کیونکہ ایران کے علماء وراثتاً بھی سنی ممالک کے علماء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مؤثر اور بااختیار تھے۔ چنانچہ غیر ملکی عیسائی حکومتوں کو حکومت کی طرف سے مراعات دینے کے خلاف

Marfat.com

آپ کی تحریک نے مذہبی شخصیات، قوم پرستوں اور دیگر تمام طبقوں کو متحد کر دیا، بالخصوص ۱۸۹۱ء میں جب شاہ نے تمباکو کے بارے میں ایک برطانوی کمپنی کو مراعات دیں تو ایران میں شاہ کے خلاف ایک ایسا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اگرچہ سید صاحب کا اس میں کوئی خاص کردار نہ تھا، لیکن قبل ازیں آپ نے اپنے اور اپنی پالیسیوں کے حق میں جو اثرات ایران میں چھوڑے تھے، ان کے نتیجہ میں عوام کے اس طوفان پر قابو پانے کے لئے شاہ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ آپ اسی سال عراق سے لندن آ گئے اور یہاں ''میلکم خان'' Malkam Khan نامی ملک بدر حکومت مخالف ایرانی سیاستدان سے ملاقات ہوئی۔ آپ شاہ اور حکومت ایران کی پالیسیوں کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ سلطان عبدالحمید ثانی خلیفہ حکومت عثمانیہ نے آپکو استنبول آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول کر لی۔ اور آپ استنبول چلے آئے، جہاں آپکا خوش دلی سے استقبال کیا گیا، لیکن کوئی اہم ذمہ داری سپرد نہ کی گئی۔ یہاں آپ نے غیر تُرک شیعہ علماء سے مل کر شاہ کے خلاف مہم جاری رکھی۔ یہاں آپ کی اپنے ایرانی مرید مرزا رضا کرمانی سے ملاقات ہوئی، جو ایران میں حکومتِ ایران کا پابند سلاسل رہ چکا تھا اور شاہ کا شدت سے مخالف تھا، اور اب استنبول میں تھا۔ اسے شاہ کو ہر طرح سے راستہ سے ہٹا دینے کا مشورہ دیا۔ شاہ کے قتل کے علاوہ راستے سے ہٹا دینے کے علاوہ دیگر مشورہ کارگر نہ تھا۔ سید صاحب کا مرزا رضا کرمانی کو شاہ کو راستہ سے ہٹانے کا مشورہ اگرچہ شاہ کے قتل کر دینے کا نہ تھا، جو سیاسی طور پر بھی ہو سکتا تھا، لیکن مرزا کرمانی نے ۱۸۹۶ء میں شاہ کو قتل کر دیا، شاہ کے قتل کے بعد ایرانی حکومت نے اس قتل میں سید صاحب کا ہاتھ سمجھ کر خلافت عثمانیہ سے سید صاحب کو ایرانی حکومت کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا جو خلافت عثمانیہ نے مسترد کر دیا، غالباً اس وجہ سے کہ خلافت کے پاس ایران کے بارے میں جو خفیہ معلومات تھیں، وہ افشاء نہ ہو جائیں۔ لیکن اسکے بعد آپ تا دیر حیات نہ رہے، اور ۱۸۹۷ء میں ۵۹ سال کی تجرد کی درویشانہ زندگی گزارنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ جبکہ آپکی وفات ٹھوڑی میں سرطان کی بیماری سے استنبول (ترکیہ) میں ہوئی اور یہاں ہی مدفون ہوئے۔

سید صاحب کے اپنی حیات فانی میں اور بعد ازاں حیرت انگیز اثرات

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ سید صاحب ۱۸۹۱ء میں خود سلطان عبدالحمید کی دعوت

Marfat.com

پر تر کیے آ گئے، لیکن اوّلاً تو آپ کے حوالہ کوئی ذمہ دارانہ کام سپرد نہ کیا گیا، لیکن بعدازاں تادمِ حیات پانچ سالہ زندگی خطرناک یقین کر کے کسی طرح کے اشاعتی کام، سفر، تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد کر دی گئیں، جب کہ آپ تادمِ حیات پوری طرح ہوش و حواس میں رہے۔ بعض اصحاب کی رائے ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا، لیکن سرطان کی بیماری خود ایک زہر ہے اور اس کے علاوہ بھی ہر طرح کی پابندیاں عائد تھیں، لہٰذا آپ کو زہر دیئے جانے کی روایت صحیح نہیں۔

آپ کی شہرت کا ستارہ آپ کی زندگی کے بعد چمکا، کیونکہ زندگی بھر اُمت مسلمہ کی لیڈر شپ کو متحد کرنے کی خاطر دربدر رہے، ایسے میں آپ کی زندگی لاتعداد پردوں میں چھپی رہی۔ جس میں آپ کا اینٹی امپریلزم ہونا، اسلامی ممالک کا اوّلاً مغربی استعماری حکومت سے ہر طرح سے جان چھڑا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا، ورنہ اُن کے خلاف تحریکیں چلانا، مسلم ممالک کا عسکری طور پر مضبوط ہو کر امپریلزم کے لئے چیلنج ہونا، عالم اسلام میں آپ کا یہ ایسا حیات آفرین کردار ہے جس سے وفات کے بعد ہی پردے اُٹھتے ہیں۔

جن اصحاب نظر افراد نے آپ کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے، ان کے نزدیک آپ کی جرأت، اپنے مقصد کے لئے آپ کی جان آفرین جدوجہد ایسی بے مثال ہے جس میں مادہ پرستی، اپنی موت آپ مرتی نظر آتی ہے۔ جس میں نام و نمود کا ذرا شائبہ تک نہیں اور خواتین اور ان کی پاکیزگی کا کسی میل جول کے بغیر پورا احترام ہے۔ آپ کی مقناطیسی شخصیت جسے آپ کے مرید "صاحب کرامات" کا نام دیتے ہیں، فی الواقع ایسی کراماتی ہے کہ بہ آسانی بلا کسی ترغیب و تحریص بلند مرتبت اعلیٰ حکومتی حلقوں میں اپنا مقام بنا لیتے ہیں، جو بڑی حد تک اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، لیکن یہ بھی عجیب امر ہے کہ جس خاموشی سے بلا ترغیب و تحریص اپنا مقام بناتے ہیں، اتنی تیزی سے آپ حکومتوں کے معتوب بن جاتے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں اوّلاً یہ کہ آپ کسی ملک میں جا کر سرکاری حلقوں میں پذیرائی حاصل کرتے ہیں، آپ بلاخوف و خطر حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں اور کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے، دوم یہ کہ ملک کی

Marfat.com

خارجی پالیسیوں میں مغربی ممالک کی خوشی کے سخت مخالف ہیں۔

آپ کی بعض پالیسیوں کو غیر حقیقت پسندانہ بھی کہا جاسکتا ہے، کہ (بلا خطا اور معصوم صرف انبیاء کرامؑ ہیں) لیکن اُن کے خلوص سے ذرا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے دیکھا کہ عالم مغرب اور عالم اسلام دونوں ہی اخلاقیات کے لحاظ سے تنزل کا شکار ہیں، جب کہ مغربی طاقتیں جو عیسائیت کی علمبردار ہیں، یہ طاقتیں پاپائیت کا شکار ہو کر اُمت مسلمہ پر ہر طرح کے مظالم روا رکھتی ہیں اور مسلم حکومتیں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، آپ نے اُن کا مقابلہ کرنے کیلئے سجدہ ریزی کرنیکی بجائے احادیث کے حوالوں سے علماء کرام کو اجتہاد سے کام لیکر مقابلہ کرنے کے مشورے دیئے، جن سے اسلام کا سر بلند ہوتا ہے۔ جس میں اعلیٰ تعلیمی مدارس میں اسلامی لحاظ سے سیاسی فکر، صحافت اور اخباری مضامین، پمفلٹ کا پھیلایا جانا شامل ہیں، آپ کی اس جرأت مندانہ فکر اور دعوت نے ان عناصر کو حوصلہ بخش کر اوپر آنے کا موقعہ بخشا جو اغیار کے سامنے کوئی متبادل راہ نہ پاکر سجدہ ریزی روا سمجھ بیٹھے تھے۔ اگرچہ آپکی ذات کسی بھی ملک کی اندرونی اصلاحات کے معاملے میں ایک لیڈر کی نہ تھی، جبکہ آپ نے زیادہ وقت مسلم ممالک میں خارجی تسلط ختم کرنے پر گزارا۔ لیکن بعض اوقات آپ نے انکے دساتیر میں پارلیمنٹری سسٹم اپنانے کے بھی مشورے دیئے۔

بعض اصحاب کی رائے میں آپ کی زندگی کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو سیاسی شطرنجی ہے، دوسرا پہلو باشعور طبقہ کو منظم کرنا اور سیاسی آگاہی بیدار کرنا۔ اگرچہ آپ نے دونوں پہلوؤں میں کام کیا ہے، لیکن زیادہ زور پہلے پہلو پر دیا ہے، چنانچہ جو اصحاب آپ کے ثناء خواں ہیں ان میں بعض کی رائے ہے کہ اگر دوسرے پہلو میں کام کرتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔

سید صاحب کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ آپ اسلام پر ایمان رکھنے والوں کا صرف روایتی دینی عبادات پر عمل پیرا ہونا اسلام کا تقاضا قرار نہیں دیتے جس سے آگے علماء کی نظر نہیں ہے، بلکہ دینی عبادات کے ساتھ سیاسی ہوش مندی بھی لازمی قرار دیتے ہوئے ہر جگہ منصوبہ بندی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس پہلو سے آپ کے کام نے نہ صرف آپ کو زندۂ جاوید کردیا بلکہ آپ کے بعد بھی ہر طرح کی مغربی رکاوٹوں اور اس کے خوشہ چینوں پر دولت کی بارش۔

Marfat.com

کے باوجود ایک ایسی مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ تحریک احیائے اسلام ایک عالم گیر تحریک ہے۔ یہ عالم مغرب کے لئے ہر طرح کی مادی بالادستی کے باوجود بہت بڑا چیلنج ہے۔

پاکستان سمیت دیگر اسلامی ممالک میں ''نظریۂ اسلام'' بہ الفاظ دیگر ''وحدت اُمت مسلمہ''، کم وبیش جڑ پکڑ چکا ہے، جب کہ عالم مغرب اور مغربی حکومتیں اپنے خوشہ چینوں کے ذریعہ اسے جھٹلاتے ہوئے ''جمہوریت'' اور ''لبرل نظریہ'' کی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے اپنی بالادستی قائم رکھنے پر مصر ہیں جیسا کہ پاکستان کا معاملہ ہے، لیکن ''نظریۂ اسلام'' کی اصطلاح جس کا وجود سید صاحب کے دور سے شروع ہوا، وہ اُمت مسلمہ کے دانشور طبقہ میں ایک مستقل نظریہ ہے، جس سے مغرب اپنی مادی بالادستی کے باوجود بری طرح خوفزدہ ہے۔

''نظریۂ اسلام'' کی اصطلاح جس کا اصل مقصد مغربی طاقتوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا تھا، ایسا مقبول ہوا کہ آپ کے الفاظ اور آپ کی تحریریں بطور حوالہ جات نہ صرف مسلم جدت پسندوں، قوم پرستوں اور ہم عصر علماء میں دیئے جانے لگے، بلکہ ای جی براؤن E.G. Brown اور وِلفریڈ بلنٹ Wilfred Blunt جیسے معروف مغربی سکالر جن کے ساتھ آپ کے ذاتی تعلقات تھے، انہوں نے بھی آپ کی تعریف میں مضامین لکھے، جن کی وجہ سے عالم اسلام میں آپ کا مقام مزید بلند ہو گیا۔ آپ کی اثر انگیز تحریریں جن پر مباحثے بھی ہوئے، معروف مغربی سکالروں کے نزدیک ان کو تسلیم کئے بغیر دیگر کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اس وجہ سے مسلم دانشوروں کی نظروں میں بھی آپ ایک مقبول شخصیت کی حیثیت اختیار کر گئے۔

دراصل اس مقبولیت کی سب سے بڑی اور اہم وجہ مغربی طاقتوں اور ان کے ہم نواؤں سے کسی قسم کی مفاہمت کا آپ کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس کی سب سے بڑی مثال آپ کے مصری مقلد محمد عبدہٗ ہیں اور بعد ازاں جناب رشید رضا جو جناب محمد عبدہٗ کے مقلد ہیں۔ یہ دو ایسے مضبوط اسلامی کردار کے نمونہ ہیں جنہوں نے مصری عوام کی زندگیوں کو اسلام میں ڈھال دیا۔

سید صاحب کی زیادہ شہرت آپ کی وفات کے بعد بیسویں صدی میں ہوئی جب کہ آپ کی سوانح حیات اور آپ کی تحریروں کو بیسویں صدی ہی میں یک جا کیا جانا شروع کیا گیا۔ افغان قوم

Marfat.com

جس کے عالموں نے پہلی عالمگیر جنگ سے نہ تحریر میں لایا اور نہ قبل ازیں آپ کا افغان ہونا کبھی بیان ہوا تھا، اچانک من حیث القوم آپ کو نہ صرف افغان قوم کا ہیرو بنا دیا، بلکہ آپ کے جسد خاکی کو استنبول سے افغانستان لا کر دوبارہ دفن کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلکہ آپ کے افغانستان میں پیدا ہونے اور بچپن کی کہانیاں بھی بیان کی جانے لگیں۔ بہر حال آپ کی جائے پیدائش ایران ہے یا افغانستان، دونوں اسلامی ممالک ہیں۔ آپ کی شخصیت نہ صرف ان دونوں ممالک کے لئے قابل افتخار ہے بلکہ تمام اُمتِ مسلمہ کے لئے ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔ بالخصوص مغربی طاقتوں کے تعاون سے پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے نتیجہ میں اسرائیل کا قیام اور بعد از اں ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ کے نتیجہ میں اسرائیل کی لبرل خیالات کی حکومت پر عظیم فتح نے تحریک احیائے اسلام کو تقویت بخشی ہے۔

آپ کی زندگی کا محور یہ تین امور ہیں جن کا موجودہ دور میں ایک کا بھی مغربی طاقتوں کو اجازت دینا غلامی کا برقرار رکھنا ہے:

اوّلاً:...... مسلم ممالک میں مغربی طاقتوں کا اندرونی معاملات میں مداخلت کے خلاف بھرپور دفاع کیا جائے۔

ثانیاً:...... اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے اقتصادیات اور معاشیات میں ایسی اصلاحات اپنائی جائیں جن کی بنا پر نام نہاد امداد کے نام پر مغربی طاقتوں کی مالی غلامی کے محتاج نہ رہیں۔

ثالثاً:...... صرف اسلام اور اسلامی اقدار کو ہی ٹھوس انداز میں حکومت میں جگہ دیں۔

ان میں سے کسی ایک سے چشم پوشی بدستور مغربی امپریلزم کا تسلط جاری وساری رکھے گی۔ جبکہ بدقسمتی سے پاکستان تو نام و نمود اور ذاتی خواہشات کے تابع خود اپنی اور بہت کچھ اغیار کی دولت کی بارش کے مالک حکمرانوں کے ہاتھوں تینوں عذابوں کا شکار ہے، اسکے نتیجہ میں ملک زوال کی جن پستیوں کے انتہاء میں جا چکا ہے، وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس میں بھی روشنی کی ایک کرن مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریک احیائے اسلام ہے جو اس کتاب کا حصہ ہے۔

Marfat.com

۲

محمد عبدہٗ

۱۸۴۹ء تا ۱۹۰۵ء

از: یونی حداد

یہ مضمون عرب عیسائی خاتون ''یونی حداد'' YOune Hadad کا مرہون قلم ہے۔ جو لبنانی عیسائی ہیں اور امریکہ کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں ''ہسٹری آف اسلام'' اور ''عیسائی مسلم تعلقات'' کے مضامین کی پروفیسر ہیں۔ مضمون کی ترتیب میں ایک صد حوالہ جات منقول ہیں، جن میں مغربی سکالرز چارلس ایڈمز، البرٹ ھوران اور میلکم کر Malcum Karr کی تصانیف اور مسلم سکالرز میں عثمان امین، حسن الشیخ، عین الدین، عبدالعاصی محمود، عباس محمود الوقار، علامہ رشید رضا ہیں۔ ویسے آپ سید جمال الدین افغانی کے شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں اور ان کے ساتھ لندن اور پیرس میں بھی فیض حاصل کیا ہے۔

اس کتاب میں انیسویں اور بیسویں صدی کی احیائے اسلام کی جو آئمہ سنی اور شیعہ شخصیات ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے یہ سب مادرزاد اولیائے کرام ہیں جنہوں نے نہ اپنے ہاں کسی بڑی علمی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی، نہ ہی اپنے دور کے کسی جید عالم کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کئے، اس کے باوجود بلا استثناء ان سب کو شرق و غرب میں جو علمی اور سیاسی فضیلت حاصل ہے، وہ انتہائی حیران کن ہے۔ بعض معاملات میں اُن کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو مفاد کا نام نہیں دیا جاسکتا کہ ان کی تحریروں سے جہاں نہ صرف بڑے مغربی سکالرز بڑے متاثر نظر آتے ہیں، بلکہ اُن میں سے بعض خود اور بیشتر عوام اسلام قبول کرتے ہیں۔ جناب محمد عبدہٗ کی مذہبی اور سیاسی امور پر گہری نظر کے علاوہ ایک صوفی اور درویش کی بھی نظر آتی ہے۔ جو مصر بدر

Marfat.com

ہو کر فرانس جاتے ہیں، فرانسیسی زبان پر مکمل عبور حاصل کرتے ہیں، جب کہ کسی مغربی زبان کا ہمارے علماء کرام میں علوم حاصل کرنا دُور از کار ہے۔ آپ وہاں ماڈرن ازم کے نام پر جدید جاہلیت کے علمبرداروں جو اسلام پر عیسائی مذہب کی برتری کے دعوے دار ہیں، خود بائبل کے حوالوں سے ماڈرن ازم اور عیسائیت دونوں کو ایسی بری طرح سے مذہبی، سیاسی، معاشی سطح پر لاجواب کر کے ہر میدان میں اسلام کی برتری ثابت کرتے ہیں۔

آپ کی زندگی

آپ ۱۸۴۸ء صدی عیسوی میں دریائے نیل کے کنارے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کی دو بیویاں تھیں، آپ دونوں بیویوں کی اولاد میں سب سے چھوٹے تھے، ایسے میں خیال کیا جاسکتا ہے کہ آپ اپنی ابتدائی زندگی میں کن مصائب و مشکلات سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ تاہم چونکہ آپ کا گھرانہ ایک مذہبی گھرانہ تھا، لہٰذا آپ بچپن ہی مین پڑھنے لکھنے لگے۔ آپ ابھی بارہ سال کے تھے، کہ روزانہ قرآن کریم کی اتنی بار تلاوت کرتے تھے، کہ بلا کسی مدد آپ نے قرآن کریم حفظ کرلیا۔ چنانچہ اس بارے میں آپ کا ایک سوانح نگار رقم طراز ہے کہ چونکہ آپ کا کسی مدرسہ میں جائے بغیر گھر پر لکھنا پڑھنا اور گھر پر ہی کسی استاد کی مدد کے بغیر قرآن کریم کا حفظ کرنا آپ کے ہم عمر بچوں سے قطعاً مختلف تھا، جہاں بچے مدرسوں میں جا کر اساتذہ کی مار پیٹ سے دوچار ہوتے تھے، اور پھر بھی کم ہی علم حاصل کرتے تھے، اسے ایک خصوصی عطیہ خداوندی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

جب آپ تیرہ سال کے ہوئے تو آپ کو مزید تعلیم کے لئے طنطاء شہر کی مسجد احمدی میں داخل کرایا گیا، جو الازہر کی مشہور یونیورسٹی کے بعد دوسری بڑی علمی درسگاہ ہے۔ اس درسگاہ میں آپ کو ایک تجربہ تلاوت قرآن پاک کا قرأت کے ساتھ تلاوت کرنے کا حاصل ہوا، دوسرا تجربہ ان آیات کا حفظ کرنا تھا اور بعد ازاں جن کو آپ نے اپنی زندگی میں موقعہ بموقعہ استعمال کیا۔ وہ قوانین شرعی، معاشرتی اصلاح اور فقہی اور دیگر اہم معاملات کے بارے میں تھیں لیکن ماحول خوشگوار نہ تھا، چنانچہ جلد ہی طنطاء سے نکل بھاگ کر گھر آ گئے کہ علمی زندگی ایک خشک زندگی ہے۔

Marfat.com

ابھی گھر واپس لوٹے تھے کہ گھر والوں نے سولہ سال کی عمر میں ان کی شادی کر دی۔

ابھی شادی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اور آپ گھر پر ہی تھے کہ ایک صوفی منش چچا شیخ خضر درویش آپ کی زندگی میں داخل ہوئے۔ جو اہل تصوف کے شاذلی مسلک کے صوفی تھے۔ جنہوں نے آپ کی زندگی میں اسلام اور اسلام کے بنیادی تقاضوں اور اپنے تصوف کے سلسلہ میں ایک منضبط اسلامی زندگی کی شمع روشن کی۔ اگرچہ بعد ازاں آپ نے چچا کے ساتھ بہت کم عرصہ گزارا، لیکن آپ کی مستقبل کی زندگی جو اس سے قطعاً مختلف تھی، اس کے تاثرات عمر بھر آپ پر رہے۔

ابھی شادی کو ایک سال کا عرصہ نہ گزرا تھا اور اپنے چچا کی تصوف کی رُشد و ہدایت سے بھی زیادہ فیضیاب نہ ہوئے تھے، کہ اچانک آپ پر الازہر یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق دل میں اُبھرا اور آپ نے ۱۸۶۶ء میں قاہرہ آ کر الازہر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن جیسے جیسے یونیورسٹی میں ایک طالب علم کی حیثیت سے وقت گزرتا گیا، ویسے ویسے محسوس کیا کہ طنطاء کی علمی درسگاہ سے الازہر درسگاہ مختلف نہیں ہے۔ یہاں بھی وہی معمول کی نصابی تعلیم ہے، جس میں علم کے نام سے کوئی خود اعتمادی اور اُمید کا نام ونشان نہیں۔ الازہر میں آپ کے ایک استاد شیخ محمد مصطفیٰ المراغی کا کہنا ہے کہ دوران طالب علمی آپ بھی دیگر طلباء سے ذہنی لحاظ سے مختلف نہ تھے اور قرآن کریم کو کسی سوچ وفکر کے بغیر ایک مقدس کلامِ الٰہی سمجھ کر پڑھتے تھے۔

ابھی آپ الازہر معمول کی نصابی تعلیم حاصل کرنے کے لئے الازہر ہی میں تھے کہ ۱۸۷۱ء میں ترکیہ بدر ہو کر مصری حکمران خدایو اسماعیل کی دعوت پر سید جمال الدین افغانیؒ جو اپنی مقناطیسی اور ایک مصلح کی حیثیت منوا چکے تھے، مصر آ گئے اور عام نصابی تعلیم کے علاوہ اپنے گرد ایسے نوجوانوں کا حلقہ جمع کر لیا جن کو آپ نے فلسفہ، سماجیات اور سیاسی علوم جن میں بین الاقوامی سیاست اور مغربی ممالک کی اسلامی ممالک کے بارے میں استحصال کی پالیسی شامل تھی، سے شناسا کیا۔ آپ کے اس حلقہ میں سعد زاغلول پاشا جو بعد ازاں معروف مصری لیڈر اور خود محمد عبدہٗ شامل ہیں۔ جب کہ محمد عبدہٗ سید افغانی کے ساتھ مل کر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جناب سید افغانی کی وہ انقلابی شخصیت تھی جنہوں نے اپنے طلباء اور اپنے گرد حلقہ میں اپنے ملک کے عوام میں

Marfat.com

یورپی ممالک کا ملک کے اندرونی مداخلت کا مقابلہ کرنے اور عوام میں ایک متحد اُمت مسلمہ کی ضرورت کا ایسا جذبہ بیدار کیا جسکی سب سے زیادہ ضرورت تھی کیونکہ محمد عبدہٗ سمیت جیسا کہ آپ کی ابتدائی زندگی میں اپنے صوفی منش چچا نے سبق دیا، ترک دنیا کو کامیابی کی راہ خیال کرتے تھے، جب کہ کفار کی مادی ترقی کا مقابلہ کرنے کیلئے تصوف کی نیکی کی اقدار اپنانے کے ساتھ ان کا سیاسی میدان کے علاوہ ہر اُن پہلوؤں میں مقابلہ کیا جائے جہاں وہ اُمت مسلمہ اور مسلم ممالک پر حملہ آور ہیں۔ چنانچہ جناب عبدہٗ نے سید افغانی کے حلقہ میں داخل ہو کر یہی راہ اپنائی۔

ابھی سید افغانی مصر ہی میں تھے کہ مصری حکومت نے جناب عبدہٗ کا ۱۸۷۸ء میں ''دارالعلوم'' نام کے ایک کالج میں ایک فاضل استاد کے طور پر تقرر کیا جو آپ نے قبول کر لیا۔ یہاں آپ کو ایک مقرر، ایک کالم نگار، ایک سیاسی اور سوشل مفکر کے ساتھ بالخصوص قومی تعلیم میں تبدیلی لانے کا موقع ملا۔ اگلے سال ۱۸۷۹ء میں مصری حکومت نے جناب افغانی کی شخصیت اور آپ کے سیاسی افکار کو اپنے خلاف خیال کرتے ہوئے مصر بدر کر دیا اور اسکے ساتھ جناب عبدہٗ کو ''دارالعلوم'' کالج سے ریٹائر کر دیا گیا۔ لیکن مصری وزیر اعظم نے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے سرکاری مصری گزٹ ''الوقاع المصریہ'' کا مدیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ آپ کیلئے کالج کا ٹیچر ہونے کی بجائے یہ پوسٹ زیادہ قابل قدر تھی کہ آپ رائے عامہ کو زیادہ موثر طور پر سیاسی شعور سے بیدار کر سکیں۔

حکومت کی طرف سے آپ کا ٹیچر ہونے کی بجائے سرکاری گزٹ کی ادارت آپ کو راس نہ آئی کہ حکومت پر قابض طبقہ اور فوجی افسران برطانیہ نواز تھے، جب کہ آپ گزٹ میں حکومت کی برطانیہ نواز ہونے کی پالیسیوں کو تختۂ مشق بنا رہے تھے، جن کی بنا پر آپ کو دو پالیسیوں میں سے ایک اختیار کرنے کا اختیار دیا گیا۔ آیا کہ وہ قوم پرست لیڈر رہیں جس کے نتیجہ میں ۱۸۸۲ء میں تین سال کے لئے مصر بدر کر دیا جائے گا یا برطانیہ نواز پالیسی اختیار کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں حکومت ان کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرے گی۔ آپ نے پہلی پالیسی کو ترجیح دی اور ۱۸۸۲ء میں آپ مصر بدر ہو گئے۔ لیکن یہ پالیسی آپ کو بہت مہنگی پڑی، اس قدر مہنگی کہ اسے

Marfat.com

آپ کی زندگی کا تاریک دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ عوام کے دلوں میں اب قوم پرستی کے لئے جگہ نہ تھی، چنانچہ آپ مایوس ہو کر بیروت چلے آئے اور یہاں آپ کو اپنے مہربان کرم فرما سید افغانی کی طرف سے پیرس آنے کا دعوت نامہ ملا۔ انہوں نے جناب عبدہٗ کو اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کا مشورہ دیا جو آپ نے قبول کر لیا۔ یہاں آ کر آپ دونوں نے ''العروۃ الوثقیٰ'' نام سے ایک عربی ماہنامہ جاری کیا جس کا مقصد فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کو متحد کر کے اقوام مغرب کے خلاف ایک متحد اُمت مسلمہ کی محاذ آرائی تھی، لیکن کوئی مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اس کے صرف اٹھارہ شمارے شائع ہو سکے، لیکن اٹھارہ شماروں نے نہ صرف عالم عرب میں ایک انقلاب برپا کر دیا بلکہ اقوام مغرب بھی بوکھلا اُٹھیں۔ یہ اٹھارہ شمارے صرف اور صرف اعلیٰ سیاسی طبقوں اور باشعور افراد اور حکومتی حلقوں میں بلا قیمت ہزاروں کی تعداد میں پہنچائے گئے تھے، اور اس کا ہر شمارہ دل نشیں انداز میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔ کیونکہ ان میں غیر مغربی عوام کے لئے یورپین اقوام کی، بالخصوص برطانیہ کی مسلم ممالک کے اندرونی حالات میں مداخلت کے بدنتائج کے انتباہ تھے۔ کہ اس ملک نے مصری عوام کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے بدترین محرومیوں سے دوچار کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

جناب عبدہٗ نے پیرس میں ''العروۃ الوثقیٰ'' کے شماروں اور دیگر تحریروں میں جن باتوں کا اُمت مسلمہ کو اپنانے پر زور دیا وہ یہ ہیں:

۱۔ اُن اسباب کا تعین جن کی وجہ سے امت مسلمہ ماضی میں زوال پذیر ہوئی۔

۲۔ اُمت مسلمہ کے اندر نہ صرف نا اُمیدی کا خاتمہ کیا جائے بلکہ اس میں کامیابی کی شمع بھی روشن کی جائے۔

۳۔ اپنے اُن آباؤ اجداد کے ان اصولوں کو اپنانے پر زور دیا جائے جن پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ بزرگ زندہ جاوید ہیں۔

۴۔ مغربی اقوام کا اسلام کے خلاف پورے زور و شور سے دفاع کیا جائے، کہ اسلام ہی ان کے عزائم کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

Marfat.com

۵۔ اُمت مسلمہ کو بین الاقوامی سیاسی واقعات اور صورت حال اور وجوہات سے باخبر رکھا جائے۔

۶۔ اقوام عالم کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے کیساتھ عوامی بہبود کو بھی بہتر بنایا جائے۔

مذکورہ مقاصد کیلئے آپ نے ایک سوسائٹی بھی قائم کی تھی، لیکن زیادہ لوگوں نے آپ کا ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ پیرس میں اس سوسائٹی کو ختم کرنے کے بعد آپ دوبارہ بیروت لوٹ آئے اور ایک مسلم سکول میں حصول رزق کی خاطر ملازمت اختیار کرلی۔ لیکن اب آپ کی شخصیت ایک معمولی ٹیچر کی نہ تھی بلکہ اس کی جگہ اب آپ ایک غیر معمولی سیاسی، سماجی، علمی شخصیت کے مالک تھے۔ اب آپ ایک ایسی مقناطیسی شخصیت تھے کہ آپ کا گھر مسلمانوں، عیسائیوں اور دروز قبیلہ کی معروف شخصیات، سبھی کا مرکز بن گیا۔ آپ ان سب کو ایسے منفرد انداز میں علم سے شناسا کرتے تھے کہ سبھی آپ کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ آپ نے اپنے ان لیکچروں کو ''رسالہ التوحید'' کے عنوان سے شائع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ خدیو مصر نے ایک بار پھر آپ کو قاہرہ واپس آنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ آپ تعلیم و تدریس میں حصہ نہیں لے سکیں گے، بلکہ آپ کو ایک مقامی عدالت میں منصف مقرر کر دیا گیا، جن میں خدیو کے بعض اپنے ''قانونی اختیارات'' Law Codes بھی تھے۔ ۱۸۹۵ء میں آپ کو الازہر انتظامی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا، اور تھوڑے ہی دنوں بعد جب انیسویں صدی ختم ہونے والی تھی، خدیو نے آپ کو مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا۔ آپ کا یہ منصب آپ کو ہر طرح کے معاملات میں ''فتویٰ'' جاری کرنے کا مجاز قرار دیتا تھا جو کسی فرد کے نجی معاملہ میں بھی ایک فتویٰ کی شکل میں عدالتی حکم نامہ کے مترادف قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آپ کے بعض ''فتاویٰ'' بڑے دلچسپ اور انسانی نفسیات پر ایک ضرب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ کی ابتدائی زندگی اور اُمت مسلمہ کے مسائل:

اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جائے گا کہ انیسویں صدی کے آغاز میں ماسواء ان انگلیوں پر گنے چنے چند سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد کے جنہیں سیاح کہا جاسکتا ہے، یورپ عالم

Marfat.com

اسلام سے دور تھا، جب کہ یہی حال اُمت مسلمہ کا تھا کہ اس کے بعض افراد یورپ کے دارالحکومتوں کے علاوہ اندرون یورپ کے معاملات سے بے خبر تھے، لیکن یہ افراد جو مؤثر شخصیات کے مالک تھے وہ یورپ کی مادی ترقی کے اسباب معلوم کرنا چاہتے تھے، جن میں عسکری برتری کو اس وجہ سے ترجیح تھی کہ میدان جنگ میں مسلمان ہر جگہ شکست کھا رہے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں نے نہ صرف میدان جنگ میں یورپ کی عسکری برتری کو تسلیم کیا بلکہ یورپ کی تہذیب (جسے اخلاق سے بعید ماڈرن ازم کا نام دیا جائے گا) کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ان لوگوں کے مشوروں اور تعاون سے نوجوان طلباء جو برائے تعلیم یورپ میں آنے لگے، ان کے دماغوں میں مغربی تہذیب کا جادو کام کرنے لگا۔ اور علماء، تجارت پیشہ اور دیگر کاریگر حلقوں کا اثر عالم اسلام کے ممالک میں ختم ہو گیا۔ عالم مغرب کی اس تہذیب کے اتباع میں جو لوگ اُمت مسلمہ کا درد رکھنے کے ساتھ ساتھ احساس کمتری میں مبتلا تھے ان میں انڈیا کے سر سید احمد خان، مصر کے رفاع الطہادی، تیونس کے خیر الدین اور ایران کے ملقوم خان قابل ذکر ہیں۔ جو اپنے اپنے ممالک میں مروجہ تعلیمی طریقہ کو پوری طرح سے بدل کر دیگر ہر شعبہ میں مغربی اقدار اپنانے ہی کو اُمت مسلمہ کی کامیابی کا راز سمجھتے تھے اور والٹیر روسیو جیسے سیکولر ذہن کے فلسفیوں کی بنیادوں پر دیگر سیکولر فلاسفروں کے نظریات اپنانے پر زور دیتے تھے۔

چنانچہ انیسویں صدی کے نصف کی آمد تک مغربی نظریات اور فلسفیانہ خیالات پر اُمت مسلمہ کے ایک بڑے مؤثر حلقہ نے کافی دسترس حاصل کر لی، جو اس کے ناپاک عزائم سے قطعاً بے خبر اور اُمت مسلمہ کے لئے بد نتائج سے لاتعلق تھی۔ ان نظریات کے عالم اسلام میں مشرق تا غرب عربی زبان بولی اور سمجھی جانے زبان میں عربی تراجم ہوئے۔ نظریات کے ساتھ ان ممالک کا مسلم ممالک پر نوآبادیاتی تسلط ایسا تھا، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۱۸۷۰ء تک کسی بھی حلقہ میں خواہ حکومتی ہو خواہ علمی، کسی حلقہ سے کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ جب کہ ۱۸۷۰ء میں جب سید جمال الدین افغانیؒ جب کہ آپ کی عمر صرف ۳۲ سال تھی اور آپ نے ان دونوں خطرات کا ادراک کر کے اس سے قبل ہی اس کے خلاف کام شروع کر دیا تھا، جس کا ذکر سید صاحب کے حالات

Marfat.com

زندگی میں کیا جا چکا ہے۔ آپ نے انڈیا سمیت دیگر ممالک جا کر اسکا ادراک کر لیا تھا جب کہ حکومت ترکیہ نے محض دو سال قیام کے بعد ۱۸۷۱ء میں آپ کو مصر بدر کر دیا تھا، گو ابھی تک پین اسلام ازم یا تحریک احیائے اسلام کے نظریات وجود میں نہ آئے تھے، لیکن آپ کی تعلیمات سے مغربی طاقتوں کے نوآبادیاتی تسلط کے خلاف ''قوم پرستی'' کی تحریک سر اُٹھا چکی تھی، سید صاحب کی مصر آمد نے نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف سیاست کو ایک نیا رنگ دیا۔ ضرورت تھی کہ کوئی ایسی لیڈر شپ اُبھرے جوان کے اندرونی معاملات میں باز رکھنے کے ساتھ خود اعتمادی کو پیدا کرے۔ چنانچہ سید صاحب کی مصر آمد نے محمد عبدہٗ کو ان کے حلقہ میں داخل کیا اور آپ نے سید صاحب کی سوچ وفکر کا پورا اثر لیا۔

مصر کے مسائل کے حل میں جناب محمد عبدہٗ کا نکتۂ نظر:

جب آپ نے یورپ کے مقابلہ میں مصر کے معاشرتی نظام کا تجزیہ کیا تو آپ نے زوال کو بھانپ لیا۔ آپ کے تجزیہ کے مطابق اس کمزوری اور پس ماندگی کے دو اسباب تھے:

اوّلاً یہ کہ مغربی استعمار کی کی اتنی بالادستی جس سے مسلم معاشرہ کی بقاء بری طرح خطرہ میں ہے۔

ثانیاً خود ایسی داخلی کمزوریاں جو خود اپنی پیداوار ہیں۔

جناب محمد عبدہٗ نے مغرب کے چیلنجوں کو ان معنوں میں تسلیم کیا کہ ان کے ان چیلنجوں کی بنیاد ان کے سائنسی علوم، صنعتکاری، ان کی دولت، نظم ونسق، ان کی فتوحات جو افواج کی تعداد کے مقابلہ میں جدید اسلحہ کی بنا پر ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اُمت مسلمہ ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی شکست تسلیم کر لے اور ان خرابیوں سے بھرپور طور واطوار اپنا لے۔ بلکہ مغربی اقوام بالخصوص برطانیہ سے سخت نفرت ہے کہ برطانیہ نے مسلمانوں کے اندر غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے کے لئے جن مکارانہ طریقوں سے کام لیا وہ مسلم عوام کے اندر مزید نفرت کا باعث ہیں کیونکہ یہ ملک ایک جابر ہی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی عسکری قوت کے بل بوتہ پر مسلمان ممالک اور ان کے عوام پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ مزید برآں یہ ملک اور دیگر یورپی

Marfat.com

ممالک کسی مسلم ملک پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے خواہ وہ اسے انصاف ہی کیوں نہ دیں، کیونکہ ان کا مذہب اسلام سے ہر طرح سے مختلف ہے۔

جناب عبدہٗ کا اس بات پر زور تھا کہ یورپی ممالک کا ہر طرح سے مقابلہ کیا جائے، کہ جن بلند اصولوں کے پرچار کا دعویٰ کرتے ہیں اپنے غلام ممالک اور ان کے عوام سے ان کا سلوک ہر طرح سے قابل مذمت ہے۔ جب کہ مصری عوام ان پر اندھا اعتماد کرنے کی وجہ سے بڑے مصائب کا شکار ہیں کیونکہ اس اندھے اعتماد کے ساتھ خلوص کے ساتھ مکروفریب، سچ کے ساتھ جھوٹ، محبت دکھانے کے ساتھ غدار بنانے کے عزائم ہیں۔ جن کا ایک مرتبہ جناب عبدہٗ نے برطانوی سرکار کے ایک بڑے نمائندہ سے کھلے الفاظ میں اظہار کیا، اس برطانوی نمائندہ نے آپ سے مصر کے بارے میں برطانوی پالیسیوں کا سوال کیا، آپ نے اس کے جواب میں بڑے زور دار لہجہ میں کہا کہ ''کسی وقت ہم مصریوں کی لبرل پارٹی برطانوی لبرل ازم اور اس کی ہمدردیوں پر بڑا یقین کرتی تھی، لیکن اب اس پر ہمارا کوئی یقین نہیں، کہ الفاظ کے ساتھ عمل اس سے بالکل مختلف ہے، کیا عملاً تمہاری ہمدردی ایسی ہے، جیسے بھیڑیے کی بھیڑ کے ساتھ ہوتی ہے، کہ بھیڑیے کی ہمدردی بھیڑ کو ہڑپ کرنے کی ہوتی ہے۔''

جناب عبدہٗ مصر کی پہلی معروف شخصیت ہیں، جنہوں نے مصری معاشرہ کی پس ماندگی کو محسوس کرتے ہوئے اس کا عندیہ دیا کہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ آپ کا کہنا تھا کہ مصر کی سماجی اور سیاسی مشکلات اور مصائب ہم نے وراثتاً اپنے اوپر اتنی بری طرح سوار کر لی ہیں جو موجودہ دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے سے عاری ہیں۔ کچھ اندرونی اختلافات کمزوری کی وجہ ہیں۔ اُمت مسلمہ کو چھوٹی قوموں اور قومی خودمختاری میں تقسیم کرنے اور خلافت (خلافت عثمانیہ) کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے جن میں مختلف ممالک کو اُبھارا گیا ہے، مختلف قیادتوں کو ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں اور لڑائیوں میں مصروف رکھنا شامل ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بڑی آزمائش ہے، اور اسلامی تعلیمات پر عمل میں کوتاہی اس آزمائش کو جو ایک عذاب کی شکل اختیار کر گئی ہے، کا عمل دخل

Marfat.com

ہے۔آپ نے اس آزمائش کی وجہ جہالت اور قرآن فہمی میں شعور کی کمی بھی قرار دی۔ پھر بڑے پیمانے پر فرقہ بندی ہے، پھر انفرادی طور پر ''اجتہاد'' بھی بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر سیاسی قیادتوں کی غلط پالیسیاں ہیں۔

عام مسلمانوں اور اُمت مسلمہ کا بلا استثناء اسلام کا مثالی دور جناب عبدہٗ سمیت خاتم النبیین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا ہے۔ بعدازاں مختلف مسالک اور فقہی اختلافات کے ساتھ آہستہ آہستہ دیگر مکتبہ فکر بھی اُمت مسلمہ میں جگہ پا گئے۔ بالآخر یہ تمام اسباب اٹھارھویں، انیسویں صدی میں مجموعی طور پر زوال کا سبب بن گئے اور ضرورت لاحق ہو گئی کہ زوال پر قابو پانے کے لئے بنیادی اصلاحات ضروری ہیں۔ جن میں اولین بنیادی اصلاح یہ ہے جس پر تمام مسالک کے علماء بلا استثناء کسی فرقہ واریت یا دیگر اختلاف متفق ہیں لیکن اندھی ''تقلید'' کی بجائے ان احادیث کو متعارف کرانے پر زور دیا، جو متفق علیہ ہیں اور اسی طرح سنت پر عمل جس پر سب کا اجماع ہے، چنانچہ آپ نے اس بارے میں تین اصول ضروری قرار دیئے جو بلا کسی تنقیص اتھارٹی کے طور پر مسلمہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ماضی کے ان سلف صالحین کی آراء کو مقدم سمجھا جائے، جن میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔

(۲) باہمی مشورہ سے ان آراء کا بڑا محتاط تجزیہ ضروری ہے، ایک وہ ہیں جو ''سلف'' کا دعویٰ کرتے ہیں جن کی آراء کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھا جانا ضروری ہے، اگر وہ قرآن کریم سے مطابقت رکھتی ہیں تو ان سے استفادہ کیا جانا چاہئے۔

(۳) یہ امر تسلیم کہ اس وقت مذہبی فرقہ بندیاں ہیں لیکن یہ مذہبی فرقہ بندیاں اپنے آپ کو کسی غیر ملکی سیاست سے وابستہ نہ کریں بلکہ یہ دیکھیں کہ عقل سلیم کیا کہتی ہے؟ کہ کیا یہ رائے اسلامی نکتہ نظر سے ملک کے لئے مفید ہے، یا محض کسی مادی قوت کا خوف ہے۔

ان اصولوں کی بنا پر آپ نے اُمت مسلمہ کو اسلام کی طرف لوٹ آنے کی وکالت کی۔ آپ کا بڑے پُرزور الفاظ میں کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بڑے واضح الفاظ میں اپنی

Marfat.com

''سنت'' کی تشریح کی ہے، کہ اس کے قوانین میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ قوانین ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے قومیں عروج پاتی ہیں، اور ان سے روگردانی سے اُن کا زوال مقدر ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا ایمان تھا کہ ایک حق پرست اور منصف مزاج معاشرے کے قیام کے لئے قرآن کریم کے احکامات کو اپنانا ناگزیر ہے۔

جناب عبدہٗ کا کافی وقت فرانس کے وزیر خارجہ جبرائیل ہینوتی Gebrael Hanoteo کے اسلام پر تقریری اور تحریری حملوں کے جوابات میں گزارا۔ یہ وزیر خارجہ اُمت مسلمہ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ اُمت مسلمہ ''اسلام اور مغرب کے درمیان فساد پھیلانے کا باعث ہے'' جس پر جناب عبدہٗ کا یہ تجزیہ تھا کہ اس فساد کی اصل وجہ مغرب کا اُمت مسلمہ کے خلاف یہ رویہ ہے کہ ''ہم تم سے برتر ہیں کہ ہم عیسائی ہیں اور تم ہمارے مقابلہ میں کمتر ہو کہ تم مسلمان ہو۔'' لہٰذا بحیثیت مسلمان ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم تمہارے اس رویہ اور فکر کو اور مغربی تہذیب کا اسلامی تہذیب سے برتر ہونے کو مسترد کریں کہ اسلامی تہذیب مغربی تہذیب کے مقابلہ میں ہر طرح سے برتر ہے۔

وزیر خارجہ ہینوتی کا مغربی تہذیب کی بالاتری کا یہ نظریہ تھا کہ مغربی تہذیب کے کڑے آریائی تہذیب سے ملتے ہیں، جب کہ اسلامی تہذیب کی جڑیں سامی تہذیب ہے۔ جو آریائی تہذیب کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ جس کی جناب عبدہٗ نے بڑے زور سے تردید کرتے ہوئے جواب میں کہا کہ ''مغربی تہذیب موجد ہونے کی بجائے ایک نقال کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ بھی یورپ نے حاصل کیا ہے، وہ اسلامی تہذیب کا مرہون ہے نہ کہ خود اپنے طور پر ایجادات کی دنیا میں قدم رکھا۔'' وزیر خارجہ جس نظریہ سے یورپی تہذیب کا مداح تھا، جناب عبدہٗ اس کی تحقیر کرتے ہوئے اسے شرک کی بیماری میں مبتلا ایک غیر جمہوری شخص قرار دیتے تھے۔ آپ نے اسے اپنے ایک خط میں لکھا:

''وقت گزرنے کے ساتھ برف پگھل جائے گی تو تاریخ یہ گواہی دے گی کہ آریائی تہذیب کے جس مذہب کے تم پیروکار ہو، اس نے کتنے لاکھوں

Marfat.com

بے گناہ افراد کا اتنا خون بہایا ہے کہ زمین ان کے خون سے سُرخ ہوگئی، جب کہ ہماری تہذیب نے اس آگ کو بجھایا ہے۔''

انیسوی صدی کی یورپی تہذیب جس پر یورپ کو بڑا فخر ہے، اور اس کی یہ پہلی لہر ہے، جسے آریائی تہذیب ہوتے کا دعویٰ ہے لیکن سوال ہے کہ یہ لہر کہاں سے آئی؟ یہ لہر اوّلاً ''سامی'' Semitic ہے، جو علوم کی وہ لہر ہے جسے مسلمانوں نے پرشیا، مصر، روم اور یونان سے حاصل کر کے اسے صاف، شفاف بنا کر اُندلس میں بڑے دریا کی شکل دی، اس حقیقت کے باوجود کہ عیسائیت کے پیشوا اسے یورپ پر اپنی حکمرانیت کے خلاف بڑا خطرہ سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے سامی نسل اور مشرقی تہذیب کا بھرپور دفاع کیا بالخصوص فینقی Phoenasians اور مصری تہذیبوں کا کہ ان کی بنیاد خدائے واحد کی وحدانیت پر ہے، اس کے مقابلہ میں آریائی تہذیب جو یورپی قومیں اپنے ہاں ایشیا سے لائیں وہ مشرک و اصنام پرستی اور وحشت و بربریت ہے۔ اور اس سے انکار کیا کہ یورپی قوموں پر یونانی اور رومی تہذیب پر کوئی اثر ہے اور اس امر پر زور دیا کہ اسلام کی آمد سے قبل عیسائیت بے جان ہو چکی تھی۔

بطور مذہب اور تہذیب یورپی عیسائیت جناب عبدہٗ اس کے بڑے سخت نقاد تھے، اس دور میں یورپی دانشوروں اور حکمرانوں نے اسلام کو بری طرح اپنا نشانہ بنا رکھا تھا اور مسلمانوں کو اسلام کا پیرو ہونے کی وجہ سے ایک بے وقوف اُمت اور پس ماندگی کا سبب قرار دیتے تھے، اس الزام تراشی کے جواب میں کہا کہ اگر کسی مذہب کو کسی قوم کا زوال قرار دیا جائے تو اس بارے عیسائی مذہب کا موجودہ ماڈرن ازم سے ذرا بھی کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔ جب کہ مسلمانوں کی انجیل مقدس تک نہ رسائی ناممکن ہے، جب کہ اس کو پڑھنے اور سمجھنے (جو اصل نہیں بلکہ مختلف پادریوں کے تراجم ہیں، کوئی مشکل نہیں۔ اور اس کے پڑھنے سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ انجیل مقدس کسی عالمگیر تہذیب کی داعی نہیں بلکہ اپنے پیروکاروں کیلئے دنیا سے دوری اور رہبانیت کی داعی ہے اور یہ سبق دیتی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہاری قمیص چوری کرتا ہے تو اپنا تمام لباس اس کے حوالہ کر دیا جائے، اگر کوئی شخص تمہارے چہرے کے دائیں طرف تھپڑ رسید کرتا ہے تو دوسرے تھپڑ

Marfat.com

کے لئے بائیں طرف پیش کردو۔ انجیل کا حکم ہے کہ خدا کا حصہ خدا کو اور قیصر کا حصہ قیصر کو دو۔ چنانچہ جناب عبدۂ نے عیسائی یورپ سے مطالبہ کیا، کیا عیسائی یورپ انجیل مقدس کے ان احکامات پر عمل پیرا ہے؟ آپ نے بڑے زوردار الفاظ میں یورپ کو للکارا کہ "ماڈرن عیسائیت طاقت اور فتوحات کا دوسرا نام ہے۔ جو سونا اور چاندی اور عیش و عشرت کے گرد گھومتی ہے۔ سٹرلنگ پاؤنڈ اور لیرا Liral کرنسی کی اس پر حکومت ہے، جن کا انجیل مقدس اور اس کی تعلیمات سے دور کا تعلق نہیں۔

اسلام پر یورپ اور اس کے سکالرز کو جھٹلاتے ہوئے آپ نے کہا کہ "تم نے اسلام پر الزام تراشی کا ایک نیا طریقہ ڈھونڈا ہے، حالانکہ بازنطینی دور کی عیسائیت، جو تثلیث روح القدس اور مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے کے گرد گھومتی ہے، جب کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور دین اسلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت نبوت کا انکار نہ کرتے ہوئے ان پر لازم آتا ہے کہ بیسوی صدی میں دونوں مذاہب کی بنیادی اخلاقی اقدار کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی تہذیب قائم کریں جن کی بنیاد بہتر تعلقات ہوں۔"

آپ کی اس رائے نے بحث کا رُخ اس کے حق میں موڑ دیا کہ دونوں مذاہب کا یوم آخرت پر ایمان ہے اور یہ مشترکہ ایمان اس امر کا متقاضی ہے کہ دونوں مذاہب کے پیروکار اس مادی دنیا کو ایک کامیاب شکل دیں۔ جناب عبدۂ نے یورپ کے عیسائی سکالرز کو توجہ دلائی کہ عیسائیت ترک دنیا کی تعلیم دیتی ہے جب کہ قرآن کریم دین کے ساتھ دنیاوی رشتہ بھی قائم رکھتا ہے۔ آپ نے دونوں مذاہب کے بنیادی اصول علیحدہ علیحدہ بیان کر دیئے اور کہا کہ بیسویں صدی میں اُمت مسلمہ کے درمیان عیسائیت کی صحیح تصویر دیکھنے میں کوئی مشکل حائل نہیں۔

آپ نے یورپ میں بیٹھ کر یورپ اور عیسائی پاپائیت کو عیسائیت کا جو چہرہ دکھایا، وہ یہ ہے:

1) عیسائیت کی بنیاد اُن معجزات پر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سرزد ہوئے۔ چنانچہ انجیل یہ سبق دیتی ہے، چنانچہ عیسائیت کی حقانیت کا ثبوت وہ طریقہ ہے جہاں معجزات کے سامنے قوانین قدرت عاجز ہو کر رہ گئے۔ جس سے از خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ

Marfat.com

عیسائیت غیر سائنسی ہے، جس کا یورپی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں مطالعہ مظاہر قدرت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تمام کائنات کے ابدی قوانین ہیں اور کائنات کی ہر چیز جو گھومتی پھرتی نظر آتی ہے اسکے پیچھے اسباب ہیں۔ اگر کسی شخص کا یہ ایمان ہو کہ محض دعاؤں سے کوئی تبدیلی عمل میں آسکتی ہے تو پھر سائنسی تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟

۲) عیسائیت کا دوسرا اصول بہ مطابق باب متی آیت ۱۶؍۱۱۹ عیسائی پادریوں کے ہر طرح کے اختیارات ہیں جب کہ آیت کا مطلب یہ ہے:

''میں تمہیں خدا کی بادشاہت کی کنجیاں دیتا ہوں۔ تم زمین پر جو باندھو گے وہ بندھے گی اور جو ڈھیلی کرو گے وہ ڈھیلی ہو جائے گی۔''

یہ آیت عیسائیت کے اس دعویٰ کے خلاف ہے کہ عیسائیت مذہب حق ہے، جب کہ یہ آیت آزادیٔ رائے کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی پاپائیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کس شخص کو عیسائی ہونے کا حق دیتی اور بلاوجہ کسی کو عیسائیت سے خارج کرتی ہے۔ عیسائیت پر ایمان رکھنے والا کوئی عیسائی اپنے طور پر عیسائی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا، تا آنکہ پادری کے نزدیک وہ عیسائی نہ ہو اور نہ اپنے ذہن کے مطابق اُسے کسی عمل کا اختیار ہے، وہ بہر صورت پادری کے فیصلہ کا پابند ہے۔

۳) پراٹسٹنٹ جو انجیل کی آزادانہ تشریح کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ صرف انجیل ہی ذریعۂ علم ہے۔ مذہب عیسائیت انسانی ذہن کو ایسی پریشان کن صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے کہ انجیل جو سبق دیتی ہے وہی حرفِ آخر ہے اور اس کی تاویلات طبقۂ پاپائیت کے پاس ہیں جن میں ہر ایک کی تاویل کا کوئی شمار نہیں۔

۴) عیسائیت کا چوتھا اصول جس پر آرتھوڈوکس، پراٹسٹنٹ، کیتھولک اور دیگر سبھی متفق ہیں، اولین تقاضا عقلیت Irrational ہونا ہے۔ عیسائیت کا یہ ایمان ہے کہ عیسائیت ایک تحفۂ الٰہی ہے نہ کہ عقلیت کا تقاضا، اس لحاظ سے عیسائی مذہب کسی دلیل سے ماورا

Marfat.com

ہے، اور عقلیت کا انکار ہے۔

۵) عیسائیت کا پانچواں اصول یہ ہے کہ اناجیل (متی، لوقا، مرقس، یوحنا) میں انسانی زندگی اور بعدازاں زندگی کے بارے میں جو کچھ ہے، وہ حرفِ آخر ہے، ہر وہ بات جس کا مذہبی عقائد، انسانی بقاء اور چلتی پھرتی سرگرمیاں اور انسان کی خوشی وغمی جس کا تعلق ہر انسان سے ہے، وہ پرانے اور نئے عہد نامہ میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ بعض عیسائی سکالر مذہبی عقیدتمندوں میں اس انتہاء تک چلے گئے ہیں کہ انجیل مقدس میں علم معدنیات Metallurgy بھی ہے۔

۶) عیسائیت کا چھٹا اور سب سے نازک اصول عیسائیوں اور دوسروں کے درمیان جو ہے وہ انجیل کے باب متی: آیت ۱۰ کے مطابق یوں ہے:

"میں زمین پر امن کے لئے نہیں آیا ہوں، بلکہ تلوار لے کر بیٹے کو باپ سے، بیٹی کو ماں سے اور بیوی کو اپنی ساس سے علیحدہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔"

اس لحاظ سے عیسائی تعلیمات خاندانی زندگی میں انتشار اور سماجی توڑ پھوڑ کا باعث ہیں اور انسان دشمن اس کے قریب ترین اقارب ہیں۔ چنانچہ انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب یہ کہا گیا کہ "باہر چند لوگ (غیر عقیدتمند) آپ کا انتظار کر رہے ہیں تو جواب میں آپ نے فرمایا: "میرے مرید میری ماں بھائی ہیں۔"

عیسائیت کے بارے میں آپ کے یہ محققانہ جوابات مغربی سکالروں کے اسلام پر حملوں کا جہاں منہ توڑ جواب کہے جاسکتے ہیں، وہاں جناب محمد عبدہٗ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہیں کہ اسلام کو مقبول بنانے کے لئے دوبارہ تشریح بھی ضروری ہے۔ اس بارے میں آپ نے جو انداز اختیار کیا وہ مدافعانہ نظر آتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ عیسائیت پر اسلام کی برتری ثابت کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اس بارے میں آپ جو کوشش کرتے ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے جس میں دو باتوں پر ایمان لازمی ہے۔

Marfat.com

ا) تمام کائنات کے خالق و مالک ہونے کا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر پختہ ایمان اور اس بات پر ایمان کہ اس کی طرف سے حضرت محمد ﷺ دنیا کے لئے حق کا پیغام لے کر آئے۔ یہ ایمان انسانی ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے اور اس کے قوانین وضوابط کیا ہیں، اور یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ یہ کائنات از خود پیدا نہیں ہوئی بلکہ تمام ارض وسماء کا کوئی واحد خالق ہے، جس نے دن اور رات، بر و بحر اور ہوا پیدا کئے، جس کی مدد سے انسان اپنی کشتیاں چلاتا ہے، اس وجہ سے جب اسلام انسان کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، تو وہ عقل سلیم کے طور پر اسے سمجھنے کی دعوت دیتا ہے نہ کہ عیسائیت کے مطابق ایک اتفاقی معجزہ۔ اسلام میں اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہی اس کے پیغمبروںؑ اور ان پر نازل شدہ کتابوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اوّلاً جب تک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتا وہ کیسے اس کی پیغمبروں پر نازل کردہ کتابوں پر ایمان لاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اسلام میں جس دوسری بات کا دوسرا بڑا تقاضا ہے وہ قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونے پر ایمان ہے جس میں انسان کی طرف سے کوئی آمیزش نہیں، جیسا کہ بائیبل اور اس سے قبل دیگر کتب سماوی ہیں۔ چنانچہ اسلام کا پہلا بنیادی اصول ایک عقلی ثبوت کی بناء پر ہے جو صحیح ایمان ہے۔

۲) اسلام کی دوسری بنیاد جس پر اکثریت کا اجماع ہے کہ اگر ایک متنازعہ فیہ امر ہے، جس میں عقل وروایت متصادم ہیں، تو عقل کو ترجیح حاصل ہوگی۔

۳) تیسرے اصول کے مطابق مختلف تاویلات ثابت کرنے کی آزادی ہے۔ مثلاً اگر کوئی فقیہ کے پاس کسی شخص کے بارے میں کافر قرار دیئے جانے کے ایک صد وجوہات ہیں، لیکن ایک وجہ ایسی سامنے آتی ہے جس کے مطابق وہ مسلمان قرار دیا جاسکتا ہے، اسے کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۴) اسلام کا چوتھا اصول ''دعوۃ'' اور ''فتنہ'' کی روک تھام کرنا ہے۔ مغربی سکالرز اور

Marfat.com

طاقتیں اسلام میں "جہاد" کے لفظ سے اسلام پر جنگ وجدل کا الزام لگاتی ہیں، جب کہ حقیقت میں اسلام معافی کی تلقین کرتا ہے، جنگ یا جہاد کسی غیر ملی طاقت کی جارحیت کے خلاف دفاع کیا جاتا ہے تاکہ جارحیت کو روک کر امن قائم کیا جا سکے۔ دفاع میں جہاد کر کے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد کسی کو تبدیلی مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا اور نہ ان لوگوں سے انتقام لینے کی اجازت ہے جو اختلاف کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کا یہ ریکارڈ ہے کہ اسلام کے پیروکاروں کو جب بھی فتوحات حاصل ہوئیں مفتوحین کے جان و مال کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا اور عیسائیوں کے بارے میں یہ بات بھی تاریخ میں ریکارڈ پر ہے جب انہیں فتوحات حاصل ہوئیں انہوں نے بچوں، بوڑھوں کا قتل عام کیا اور خواتین کی عزت و ناموس کو لوٹا جو اس کتاب کے دوسرے حصے "صلیبی جنگوں کی حقیقت" از پروفیسر جان کیسی کے مضمون میں موجود ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے کسی ملک میں فتح حاصل کی وہاں کے لوگوں کو اپنے مذہب اور رسم ورواج کے مطابق عبادت کی اجازت دی۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ مسلم ممالک میں عیسائیوں کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی اجازت کے ساتھ اپنے رسم وروج کے مطابق زندگی بسر کی پوری آزادی تھی اور اب بھی ہے، لیکن مغربی ممالک نے مسلمان خواتین کے اسکارف کے استعمال پر پابندی لگادی ہے۔ جہاں تک "جزیہ" کا تعلق ہے اس کے عوض ان کا تحفظ یقینی بنانا تھا۔ اس کے ساتھ ان کی مدد کرنا بھی مقصود تھا، یہی عیسائی جب دوسروں کی غلامی میں تھے، اس سے بڑھ کر بلا کسی ضمانت، تحفظ ان کو ٹیکس دیتے تھے، جب کہ خلفائے اسلام کا اپنے فوجی لیڈروں کو یہ حکم تھا کہ وہ ان کی خانقاہوں اور عبادت گاہوں کا پورا احترام کریں، خواتین، بچوں اور غیر لڑاکا لوگوں کے خون حرام کیے گئے۔ سنت "ذمیوں" کے قتل سے منع کرتی ہے۔ مسلمانوں اور "ذمیوں" کے درمیان باہمی مفاہمت سے ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔ جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک

Marfat.com

حدیث مبارکہ کی رو سے ''جو کسی ذِمی کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں''، عیسائیت پر ایمان رکھنے والوں کو توجہ دلاتی ہے کہ اسلام کتنے رحم کا مذہب ہے۔

جنابِ عبدہٗ نے اعتراف کیا کہ ممکن ہے کہ بعض مسلمان حکمرانوں نے ان احکامات پر عمل نہ کیا ہو، لیکن یہ اسی وقت ہوا جب اسلامی حکومتیں زوال پذیر ہوئیں۔ لیکن اس پر اصرار کیا کہ یہ معاملہ ان سے غیر متعلق ہے، جب کہ اسلامی تعلیمات وہی ہیں جو بیان کی جا چکی ہیں اور قرآن وسنت کے مطابق ہیں۔ جب کہ امن کی علمبردار عیسائیت ایسے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتی ہے، جو اخلاقیات سے عاری ہیں، اس نے ہر عمر اور ہر جنس کے غیر عیسائیوں کو اپنے بدترین مظالم کا نشانہ بنایا اور ان لوگوں کو ملک بدر کر دیا، جن کو جبراً عیسائی بنا کر بپتسمہ دینے میں ناکام رہی بلکہ طاقت اور تلوار کے استعمال کے ذریعہ مذہب سے بے بہرہ افراد کو عیسائیت میں شمار کر کے اپنی زیادہ تعداد دکھاتے ہیں۔

۵) اسلام کا پانچواں بنیادی اصول ''مودت'' باہمی بھائی چارہ ہے، ان لوگوں کے ساتھ جو باہمی مذہبی مطابقت نہیں رکھتے، اس حقیقت کی شاہد اور گواہ یہ امر ہے کہ مسلمان مرد عیسائی یا یہودی خواتین سے شادی نکاح کر سکتے ہیں اور یہ خواتین اپنے بچوں کی پرورش کرنے کی ذمہ دار ہیں جب کہ مرد اپنی ان بیویوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، بلکہ وہ اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق عبادت کر سکتی ہیں اور اپنے دیگر فرائض بجا لا سکتی ہیں۔

۶) اسلام مذہبی اختیارات کا جُوا اُتار پھینکنے کی اجازت دیتا ہے کیونکہ یہ انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ذاتی رشتہ ہے، بزعم خود کسی مذہبی عنصر کا کسی پر حاوی ہونا ایک صاحبِ فکر مسلمان کی آزادیٔ فکر کو ختم کرنا ہے جس کی اسلام میں اجازت نہیں۔

۷) اسلام کا ایک اصول یہ ہے کہ چونکہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب دین مکمل ہو گیا ہے لہٰذا اگر اب کوئی شخص اپنی بات منوانا چاہتا ہے اسے ثبوت کے

Marfat.com

ذریعہ منوانا ہوگا اور اسے کسی کرامات یا غیر معمولی واقعہ کا سہارا نہ لینا ہوگا۔

۸) اسلام کا آٹھواں اصول دنیاوی زندگی کی پاکیزہ زندگی کے ساتھ یوم آخرت کی جواب دہی کے ساتھ مشترک ہے، اسلام کی تعلیمات ایک خوش حال دنیاوی زندگی سے منع نہیں کرتیں اور اُخروی خوشحالی کی خاطر ترکِ دنیا کی اجازت نہیں دیتیں جب کہ عیسائیت اس کے خلاف دنیاوی زندگی کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔

اسلام کی ان تعلیمات کو جو بڑی مثبت اور اثر انگیز ہیں، یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جناب عبدہٗ مغربی علوم اور ان کے حصول سے انکار نہیں کرتے، چنانچہ آپ نے اپنی اواخرِ عمر میں فرانسیسی زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ فرانسیسی ادب اور فلسفہ پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ کہ نیکی کے حصول کے لئے مادی تبدیلیاں بھی ضروری ہیں۔ آپ نے جہاں یہ تسلیم کیا، کہ جہاں مغرب کی مادی ترقی بڑی اثر انگیز ہے، لیکن کامیابی کی اُمیدیں اپنے اوپر سوار کیے جانے سے بچنا چاہئے۔ آپ نے مصر کا سیکولرازم کی راہ اختیار کرنا بڑی بری طرح سے محسوس کیا کہ یہ راہ مصریوں میں پھوٹ پیدا کر رہی ہے، جب کہ آپ نے محسوس کیا کہ آپ کا مشن مصری قوم کو اس کے خلاف بیدار کرنا ہے کہ بحثیت مسلمان وہ اپنی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کریں کہ ان کا دین اُن کی پس ماندگی کا باعث نہیں، بلکہ اسلام تو سماجی ترقی چاہتا ہے، اور اسلام تو وہ قوت ہے جو دنیاوی مسائل و مشکلات حل کرنے مین اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس یقین و ایمان کے ساتھ کہ تمام تبدیلیاں دین کی روشنی میں کی جائیں، اصلاحات خود اپنے اندر آنی چاہئیں نہ کہ ایک اجنبی نظام کو اپنائیں۔

جناب عبدہٗ خوب سمجھتے تھے کہ اسلامی معاشرہ میں اصلاحی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے دور میں اسلامی فکر مسلمان علماء اور مفکرین مین عنقا ہے۔ ضرورت وقت کو خوب سمجھ کر آپ نے ایک ذہنی انقلاب لانے کا بیڑا اُٹھایا، اس بارے مین آپ نے یہ تمیز جاننے کی کوشش کی کہ اوّلاً مذہبی اقدار کو قائم رکھتے ہوئے کیا کیا تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں، ثانیاً وہ کونسا ضروری اقدام ہے جو کسی تبدیلی کا موضوع نہیں بن سکتا، ان تبدیلیوں کی کامیابی کے لئے

Marfat.com

آپ نے ضروری خیال کیا کہ مسلمان یاس و نا اُمیدی کا شکار ہونے کے بجائے اُمید و کامیابی کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیں، جیسا کہ قرآن کریم کی آیات ۱۲: ۸۷ اور ۱۵: ۵۶ یقین دلاتی ہیں آپ کی رائے میں مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب اسلام میں ''بدعات'' کا آجانا تھا، جنہوں نے مسلمانوں میں نا اُمیدی کو پروان چڑھایا، اور یہ عقیدہ کہ کرپشن کا کوئی علاج نہیں ''نا اُمیدی مسلمانوں کی روح کی پوشیدہ بیماری ہے، ایسی بیماری جوان کے دلوں میں چھا گئی ہے، کیونکہ انہوں نے قرآن کریم کے احکامات اور سنت رسول ﷺ پر عمل کو خیر باد کہہ دیا ہے اس کی بجائے غلط روایات کو قبول کرلیا ہے یا حقیقت کو نہیں سمجھ پائے ہیں۔ یہ ایسی بیماری ہے جس نے جسم کی بجائے روح مردہ کردی ہے۔''

قرآن کریم عوام کے دلوں کی آواز ہے!

اپنے دور میں اسلام کو سیاسی اور سماجی لحاظ سے مقبول بنانے کے لئے آپ کے ذہن میں یہ احساس اُجاگر ہوا کہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی ترجمانی ایسے الفاظ میں کی جائے جن سے آپ کے دور کے لوگ مانوس ہوں اور قرآن کریم کی تعلیمات پر زد نہ پڑنے کے ساتھ غلط ترجمانی سے بچا جائے۔

آپ نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس بارے میں قرآن کریم ایک مرکزی کردار ادا کرسکتا ہے، جس سے اُمت کی اصلاح ہو اور اسلامی تہذیب کا احیاء ہو۔ اسلام کو تعمیر و ترقی کا دین سمجھا جائے، چنانچہ آپ نے اس انداز میں قرآن کریم کی ترجمانی کی کہ پڑھے لکھے اور باشعور طبقے نے اجنبیت کی بجائے مطالعہ کرنے کی طرف رجوع کیا، گویا خالق کائنات بلاواسطہ اس سے مخاطب ہے، بہ الفاظ دیگر آپ نے بیسویں صدی کا آغاز قرآن کریم کی عام فہم تفسیر سے کیا۔

جناب عبدہٗ کے نزدیک اُمت مسلمہ کا عروج من حیث القوم اس ایمان کے ساتھ ہے کہ قرآن کریم کا پیغام لافانی اور عالمگیر ہے۔ قرآن کریم دیگر کتب سماوی کے مقابلہ میں اس لحاظ سے بہتر ہے کہ نہ اس کا پیغام محدود ہے اور نہ کسی خاص قوم کے لئے ہے۔ بلکہ تمام انسانیت اس کی مخاطب ہے۔ آپ نے قرآن کریم کے ان نکات پر بالخصوص زور دیا:

Marfat.com

۱) قرآن کریم کا جو اولین ترین سبق ہے وہ عقیدۂ توحید ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ان معنوں میں ایمان کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے پیغمبر بھیجے جن کو بذریعہ وحی مخاطب کیا اور ہدایات دیں اور دوبارہ ان کے نیک اور بد اعمال کے مطابق جزا و سزا کے لئے زندہ اُٹھایا جائے گا۔

۲) قرآن کریم ایک مکمل اور جامع بذریعہ وحی ہدایت ہے، اس پر ایمان لانے والوں کو ذرا یہ حق نہیں کہ وہ اس کے ایک حصہ کو قابل عمل قرار دیں اور ایک حصہ سے اجتناب کریں بلکہ قرآن کریم کے تمام احکامات و ہدایات پر عمل لازمی ہے۔

۳) ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے کے لئے قرآن کریم کو ہی منبع قانون سازی قرار دیا جانا ہوگا جہاں آپ نے اس بارے میں اتفاق کیا، کہ دلیل و علم سے کام لینا ہوگا۔ وہاں اس امر پر بھی زور دیا کہ معاشرتی زندگی کو قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

۴) قرآن کریم کے واضح احکامات اور ہدایات کی ترجمانی میں اغیار کی نقالی کو خاطر میں نہ لایا جائے بلکہ ہر لحاظ سے دین کے مطابق مدلل اور صحیح روح کی حامل ہوں۔

۵) قرآن کریم کی ترجمانی میں دلیل اور مظاہر Reflaction سے استفادہ کیا جائے۔ قرآن کریم کے بارے میں آپ نے مشاہدہ کیا کہ قرآن کریم اپنے وحی الٰہی ہونے کے بارے میں تحقیق اور فکر کی دعوت دیتا ہے اور اس کے ساتھ ان قوانینِ فطرت اور اصولوں کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے جن کی کائنات پر حکمرانی ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کریم وہ آسمانی صحیفہ ہے جس میں آزادیٔ فکر پنہاں ہے، دلیل کا احترام ہے، انسان کا اپنی انفرادی زندگی کے التزام کے لئے تحقیق کی آزادی ہے جس میں علم اور دلیل کے استعمال کی کھلی اجازت ہے۔

جناب عبدہٗ کا یہ ایمان تھا کہ قرآن کریم کا نزول اس مادی دنیا کی خوشحالیوں اور بعد از موت زندگی پر مبنی ابدی خوش حالیوں کی خاطر ہوا۔ لیکن قرآن کریم سے قبل جو کتب سماوی نازل ہوئیں وہ اس وجہ سے بے معنی ہو گئیں کہ نہ وہ زبانیں زندہ رہیں جن میں وہ نازل ہوئیں نہ ان

Marfat.com

کے ترجموں کا ترجمہ کرنے والے شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ ہر ایک کا ترجمہ ایک دوسرے سے مختلف اور متنازعہ فیہ ہے۔ ان کے الفاظ اور گرائمر تک مختلف ہیں جن میں اُمت مسلمہ کے لئے کوئی جاذبیت نہیں۔ جب کہ قرآن کریم ہر شخص خواہ وہ عالم ہے یا عام اہلیت کا مالک، اپنی صلاحیت اور اہلیت کے مطابق بخوبی سمجھ سکتا ہے، البتہ ایسی "تفسیر" کی ضرورت ہے کہ عوام کا بہ آسانی قرآن کریم پر ایمان بحال ہو، عبادات اور دعاؤں کی اہمیت سمجھیں۔ زندگی کو اسلامی اخلاقیات کے مطابق پاکیزہ بنائیں اور ہر طرح کی برائیوں سے کیسے بچیں۔

آپ کے دور میں جن علماء کی تفسیریں معاشرہ میں مطالعہ کی جا رہی تھیں، آپ نے ان کو اپنے دور کیلئے مسترد کر دیا، کہ وقت کی ضرورت کے مطابق تفسیر عملاً قانون سازی، اول نفسیات اور باعث کشش ہوں، جو مسلمانوں کو عمل پر اُبھار سکیں۔ یہ تفسیریں جو انہیں قرآن کریم کی سیدھی راہ سمجھنے میں مدد دیں کہ عمل کرنے مین کامیاب ہوں۔ وہ اس فکر کے خلاف تھے کہ کوئی تفسیر جس کی عام آدمی تک رسائی ہو، اس امر کی بھی متقاضی ہے کہ اس کو سمجھنے کیلئے کوئی سپیشلسٹ Specialist ہونا چاہئے کہ ان الفاظ کے صحیح معنیٰ کیا ہیں۔ ضرورت ہے کہ جو اصحاب قرآن فہمی کے دعویدار ہوں، وہ علم کی گہرائیوں سے بھی واقف ہوں جس کیلئے آپکے سامنے یہ پانچ اصول تھے:

۱) قرآن کریم کے الفاظ کے معنوں کی Vocabulary (ذخیرۂ الفاظ) کا علم قرآن کریم سمجھنا اور اُس طرح تفسیر کرنا جن دنوں قرآن کریم کا نزول ہوا تھا۔ یہ معانی اسلام کی پہلی تین صدیاں استعمال میں رہے اور بعدازاں مفسرین نے اپنی فکر اور اپنے دور کے مطابق تفاسیر مرتب کیں۔ اس لئے ضروری نہیں کہ قرآن کریم کی جو تفاسیر اسلام کے دور اول کے بعد مرتب ہوئیں، وہ دور اول کے مطابق ہوں۔

۲) مفسرین کو عربی زبان پر کامل عبور ہو، جو صحیح تفسیر کی ضمانت ہو، آپ کے نزدیک فنون اور سائنس کے مضامین زوال کا شکار ہو چکے ہیں، جب کسی زمانہ میں اس کا شہرہ تھا، دنیا میں اسلام کو مقبول بنانے کے لئے عربی زبان کو مقبول بنانا یا جانا ضروری ہے۔ یہ مقبولیت الازہر میں پڑھائی جانے والی کتابوں کے ذریعے حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ

Marfat.com

ہمیں اُن سکالرز کی تصانیف کا سہارا لینا ہو گا جب اسلام اپنے عین عروج پر تھا۔

۳) مفسرین کو انسانی نفسیات کا کافی علم ہو۔ جب کہ قرآن کریم انسانی فطرت، قوانین فطرت اور قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں پوری رہنمائی دیتا ہے۔ اور اس کی رہنمائی سے قوموں کا عروج، اُن کی طاقت اور کمزوریاں، ان کی عظمت اور پسی، ان کا علم اور جہالت اور ان کا ایمان اور ایمان سے بے بہرہ پہن کا پتہ چلتا ہے۔

۴) موجودہ مفسرین قرآن فہمی کا وہ ادراک رکھتے ہوں جس دور میں قرآن کریم حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اور یہ اِدراک کہ اُس دور میں جو اصحاب مال و دولت کا مالک ہونے کے ساتھ منکرین قرآن ورسالت اور یوم آخرت کی وجہ سے ذلت کا شکار ہو کر دنیا سے رُخصت ہوئے، ان کے اندر اور کونسی خرابیاں اور بدکاریاں تھیں جو کسی اچھے معاشرے کے لئے ناقابل قبول ہوتی ہیں۔ چنانچہ جناب عبدہٗ کی نظر میں اصلاحات کا منصوبہ قرآن کریم کے بنیادی اصولوں پر تھا، آپ کی نظر میں ہر متنفس وحی الٰہی کے مطابق یومِ آخرت خود جواب دہ ہے نہ کہ کسی وَلی کی سفارش اور شفاعت کے ذریعہ۔ آپ نے روایات کی بجائے بلاواسطہ قرآن کریم کی مرکزیت کو زندگی کا محور قرار دیا۔ قرآن کریم کے وہ اصل اصول جو عالموں کی تفاسیر کی جگہ لیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا پورا علم رکھتے ہوں۔

انسانی نفسیات کا یہ علم جو قرآن کریم کے مطالعہ سے حاصل ہوا ہو، اس کے مخاطب خصوصی حلقوں کے بجائے عوام ہوں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی آپ نے ''داعیانِ دین'' کو مشورہ دیا کہ وہ عوام کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کریم کی آیت ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ '' (دین میں کوئی جبر نہیں) کو مدنظر رکھیں۔ اس اسلامی فکر کو عوام کے دلوں میں جگہ دینے کیلئے آپکے نزدیک ایک نئی مذہبی لیڈرشپ کی تربیت کی ضرورت ہے جو نہ ماضی کی غلامانہ ذہنیت کی مالک ہو اور نہ ہی مغرب کی لادینی کی ترجمان۔ البتہ موجودہ دور کے سائنسی علوم سے استفادہ کرنے کی اہل ہونے کے ساتھ زندگی

Marfat.com

میں اپنے داعیانہ کردار کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہ لیڈرشپ سیاستدانوں کی ذاتی اور اقتدار پرستی کا فیصلہ کر سکتی ہے جو احیائے سنت پر زور دینے والی ہو۔ انکے نزدیک علماء کا کام اغیار کی اندرونی معاملات کے خلاف بند باندھنا ہے۔ ان کا علماء سے سوال تھا:

الف) کیا ماضی میں ان کے آباؤ اجداد کی زمین پر حکمرانی نہ تھی اور اب وہ اسے اغیار کی شکل دینا چاہتے ہیں؟

ب) کیا وہ اپنے ظالم دشمنوں کے ہاتھوں مستقل بے عزتی، لعنت، غربت اور مشکلات کے متلاشی ہیں؟

ج) کیا وہ اغیار کی حکمرانی میں اپنی حفاظت کا سامان پاتے ہیں؟...... وغیرہ وغیرہ

سوال یہ ہے کہ اگر مسلم عوام قرآن کریم کی تعلیمات اور فیوض و برکات سے لاعلم ہیں ان علماء کے پاس کون سا عذر ہے کہ انہوں نے عوام کو قرآن کریم کی تعلیمات سے بے بہرہ رکھا اور اس کے قوانین کو نافذ العمل کرنے میں ناکام رہے۔

انہوں نے کیوں اُمت مسلمہ کو بطور ایک اُمت متحد کرنے کی راہ تلاش نہ کی؟ انہوں نے کیوں بدعنوانیاں اور کرپشن ختم کر کے اچھی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش نہ کی؟

انہوں نے کیوں اس امر کی تبلیغ نہ کی کہ نا اُمیدی قوموں کی موت ہے، بلکہ ان میں اُمید پیدا کر کے ظلم کے خلاف جدوجہد کو اللہ تعالیٰ کے وعدۂ کامیابی کی تبلیغ کیوں نہ کی؟

یہ تھا علماء کا قرآن کریم کو عوام کے دلوں کی آواز بنا کر اغیار کے خلاف جدوجہد کا کام، جس میں علماء کوتاہ رہے۔

شعبۂ تعلیم:

آپ کی زندگی کا جو اہم ترین موضوع تھا اور زندگی بھر آپ نے بھرپور انداز میں اپنا کردار ادا کیا، وہ مصر میں تعلیمی اصلاحات تھیں۔ آپ کے نزدیک تعلیم ایک نازک مسئلہ اور سائنسی علم Knowledge لازمی تھا۔ اس معاملہ میں مصر ایک جمود کا شکار تھا جس کی وجہ مذہبی مدارس

Marfat.com

تھے، اس جمود کو توڑنے کے لئے کیا متبادل راستہ اپنایا جائے، یہ آپ کا مطمحِ نظر تھا۔ اس بارے میں آپ کی نظریں ''الازہر'' پر تھیں۔ آپ کی نظر میں اولین متبادل طریقہ جس میں مناسب فہم و شعور کا دخل ہو، قرآن سے استفادہ جس سے اوّلاً احیائے معاشرہ ہو، اپنایا جائے۔ آپ نے دیکھا کہ ملک کو سائنسی علوم سے شناسا کرنے کے لئے عیسائی مشنری سکولوں کی بھرمار ہے، جب کہ حکومت جو سکول قائم کر رہی ہے، ان کا نکتۂ نظر عیسائی مشنری سکولوں سے مختلف نہیں، اس لحاظ سے جو طلباء ان سکولوں سے فارغ التحصیل ہوں گے، اول الذکر سکولوں سے وہ عیسائیت سے متاثر ہوں گے جب کہ مؤخر الذکر سے لامذہب۔

یورپ سے تعلیمی اصلاحات کے حصول کے بارے میں آپ کی رائے یہ تھی کہ ہمیں اس امر سے احتراز کرنا چاہئے کہ ہم من وعن اُن کو اپنالیں، جن میں وہ خود برائی کا شکار ہیں۔ آپ کا اس بارے میں پورا یقین تھا کہ ''وہ لوگ جو یورپی نظریات اور خیالات کو اخباری تراجم کے ذریعہ پھیلانا بیماری کا علاج سمجھتے ہیں، یہ نظریات خود ایسی بیماری ہیں جو ملک کو مزید لاعلاج کرنے والی ہیں۔ اُن کو شائع کرنے کا کیا فائدہ، جنہیں لوگ پڑھتے نہیں اور پڑھتے ہیں تو سمجھتے نہیں اور جو لوگ سمجھتے ہیں کیا وہ اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکیں گے؟''

آپ نے فرمایا کہ ''بعض اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ یورپی نظام تعلیم نہ صرف ایک ملک میں بلکہ تمام مسلم ممالک میں نافذ کیا جائے، کہ اس نفاذِ عمل سے علم فروغ پانے کے ساتھ عوام میں اخلاقیات بھی دخیل ہونگی۔'' آپ نے اسے اس وجہ سے غلط قرار دیا کہ اگر مقصد تمام مسلم ممالک میں نفاذ ہے تو یہ ایک شاہی حکم کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، جسکے پاس ضروری ذرائع بھی موجود ہوں۔ پھر بھی بادشاہت کو اس تبدیلی کیلئے طاقت کا استعمال کرنا ہوگا جسکی عوام مزاحمت کریں گے۔

آپ نے تعلیمی تبدیلیوں کے بارے میں دیگر تجاویز بھی ناقابلِ عمل قرار دیں۔ بعض دانشوروں کی یہ تجویز تھی کہ بعض باشعور لوگ مغربی درسگاہوں میں سائنسی علوم حاصل کریں جو واپس ہو کر اپنے ملکوں میں آ کر باقی معاشرہ کی تربیت کریں۔ آپ نے اس تجویز کو اپنے اندر ایک مضبوط جواز رکھتے ہوئے تسلیم کیا۔ لیکن اپنانے پر اس وجہ سے احتراز کیا کہ بالآخر یہ غیر مؤثر ہوں

Marfat.com

گی۔ آپ نے سوال کیا کہ یہ طریقہ کیسے کام آئے گا، جب اس کا علم اپنے بیج Seed کے لئے غیر ہے۔ پھر اس کے کاشت کئے جانے اور پروان چڑھانے میں بذات خود زمین بھی غیر ہیں۔ اس تجویز کو آپ نے اس وجہ سے بھی ناقابل عمل قرار دیا کہ ان تربیت یافتہ افراد کی حیثیت ایک ایسے ''ٹرانسمیٹر'' Transmeter کی ہوگی جو علم اس نے حاصل کیا ہے اس کو بڑے پیمانے پر پھیلانے کے لیے نہ اپنے کوئی ذرائع ہیں نہ پیچھے کوئی مدد۔ نہ کوئی وسیع دائرہ علم، ایسے لوگ جب کوئی معمولی علم حاصل کر پاتے ہیں، بڑی آسانی سے دھوکہ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ''ان کا علم مکمل ہے۔'' حالانکہ وہ کامل علم کے مالک نہیں، محض ایک معمولی ''ٹرانسمیٹر'' ہیں۔

ایک اور کمزوری جو آپ نے عصری اور ترک قوموں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں نمایاں پائی اور یہ تعلیم یافتہ طبقہ وہ تھا جو پرانے نظام تعلیم کو خیر باد کہہ کر اب کئی عشروں سے یورپی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر کے خود ان ملکوں میں ان بنیادوں پر سائنس، آرٹس، ان کی تہذیب کو فروغ دے رہا تھا، آپ کا ان تعلیم یافتہ افراد اور ان کے سرپرستوں سے سوال تھا:

اے میرے مصری اور ترک بھائیو!

۱) غیر ملکی یورپی تہذیب اپنائے اتنا عرصہ ہو چلا ہے تم کو اس نے کیا فائدہ پہنچایا؟

۲) کیا تمہارے حالات ان کے مقابلے میں بہتر ہو گئے ہیں جو اس سے قبل تھے؟

۳) کیا تم نے اپنے ملکوں کو غربت اور محتاجی سے نجات دلائی ہے؟

۴) کیا وہ اپنے آپ سے اور اپنے لوگوں کے ساتھ اغیار کی بدسلوکی کے چنگل سے نجات دلا چکے ہیں؟ جس کا خود ہم پر الزام دھرتے ہیں۔

۵) کیا تم نے ان کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کیا ہے؟

۶) کیا تم نے اپنے دشمنوں کے حملوں کے کامیاب جواب کا انتظام کیا ہے؟

اس کا ہر بات میں جواب ''نہیں'' ہے۔

Marfat.com

آپ کے نزدیک مسلمانوں کے پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں کو مغربی تہذیب اور رنگ میں ڈھالنے کا نتیجہ ان کو کئی خطرات میں مبتلا کرنا تھا۔ ان کے نزدیک چند افراد کے مغرب کے یہ نعرے ''آزادی، نیشنلزم، مذہبی آزادی، سیکولرازم'' کے ایسے نعرے ہیں جن کا مسلم عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان نعروں نے نہ صرف ان لوگوں کے طرزِ رہائش، پوشاک، خوراک کی اقسام اور کھانے کا طریقہ اور گھروں میں وہ فرنیچر اور وہ برتن جن سے وہ یورپینوں سے زیادہ یورپین معلوم ہوں، ان میں یہ تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس کے علاؤہ اور کچھ نہیں۔ وہ یورپ کی اشیاء بڑے فخر سے خرید کر ان کی نمائش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان لوگوں نے قومی صنعت اور اپنے صناعوں کو بے روزگار کر دیا ہے، جب یہ اشیاء محض عیاشی کی مصنوعات ہیں اور اگر قومی کاریگران کو بنانا چاہیں تو اُن کے پاس مطلوبہ آلات درآمد کرنے کے وسائل نہیں۔ بہ الفاظ دیگر ایسے لوگوں نے ملکی دولت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

جناب عبدہٗ کا مغربی تعلیم کے بارے میں آخری تجزیہ یہ تھا کہ جن لوگوں کے ذہنوں میں اندھا دھند مغربی تعلیم حاصل کرنے کا بھوت سوار ہے، تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ غیر قوموں کی نقل کرنے کے بعد کسی بیرونی دشمن سے لڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ بغیر لڑائی ہم نے دشمن کو فتح مند بنا دیا ہے۔ یہ لوگ اغیار کے دخیل کار ہیں، جو ہمارے معاشرہ میں خرابیوں کے دروازے کھول کر ان کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ اغیار ان نقالوں کو ''عزت'' کا درجہ دیتے ہیں اور ہماری اقدار کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ جب کہ یہ نقال ان استحصالی نو آبادکاروں کو اپنے ملک میں خوش آمدید کہتے ہیں کہ یہ استحصالی نو آبادکاران کے لئے نعمت ہیں جو ان کو عمدہ ملازمت دیں گے۔ چنانچہ اغیار کی فتح اُن کے لئے نعمت ہے۔ یہ نقال غیر ملکی فاتحین کے لئے پیش دستہ ہوتے ہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ نقال نیشنلزم وغیرہ کے نام پر مفاد پرستی کے بہروپیئے ہوتے ہیں جو اپنے مفادات کے علاوہ دیگر سوچ رکھنے کے روادار نہیں۔

اغیار کے مرہون تعلیمی نظام کو ردّ کرتے ہوئے آپ اسلامی اقدار کی بنیاد پر ایسا تعلیمی نظام قائم کرنے کے داعی تھے جو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر لاگو ہو اور انکے اندر پڑھنے، لکھنے اور حساب

Marfat.com

وغیرہ کا مضمون حاصل کرنے کا پورا شوق ہو۔ایسی تعلیم جسکی بنیاد اسلام پر ہو،لیکن مذہبی فرقہ بندی نہ ہو، البتہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان جو بنیادی اختلافات ہیں ان سے ضرور آشنا کرایا جائے۔

عرصۂ تعلیم وہ ہونا چاہئے جو طلباء اپنی سہولت اور حصولِ مقصد کی خاطر مناسب سمجھتے ہوں اور مضامین اختیاری ہوں۔جناب عبدہٗ چاہتے تھے کہ دہقانوں اور کاریگروں کے بچے کم از کو وہ ضروری تعلیم حاصل کریں کہ وہ اپنے ماضی کے آباء واجداد کے نقشِ قدم پر چل کر مزید تعلیم حاصل کرنے کے اہل ہوں۔البتہ ان سے یہ بھی اُمید نہیں رکھنی چاہئے کہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عالم فاضل ہو جائینگے۔ابتدائی تعلیم کے مدارس کی جو علمی بنیاد ہو، وہ ان باتوں پر ہو:

(الف) کسی فقہی یا فرقہ کی تخصیص کے بغیر سنی العقیدہ اسلامی عقائد کی مختصر کتاب۔

(ب) ایک مختصر کتاب جس کی بنیاد صحیح یا غلط کی تخصیص کے بغیر، ایک اخلاقی اور دین کی زندگی اپنانے پر ہو۔

(ج) ایک اور مختصر کتاب، جو حضور اکرم ﷺ، آپ ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور دیگر معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ زندگیوں کے حالات بیان کرنے والی ہو، کہ کن اسباب و وجوہات کی بناء پر اسلام کو عروج حاصل ہوا۔

مڈل کلاس کے سکولوں کے بارے میں آپ کا مشورہ یہ تھا کہ جو طلباء ان کلاسوں میں داخلہ لینا چاہتے ہوں اُن کو چاہئے کہ شریعت کے مضمون کو اولیت کا درجہ دے کر سرکاری ملازمت کے لئے ملٹری، میڈیکل کی ٹریننگ بھی حاصل کریں۔ان کے نصاب میں یہ کتابیں شامل ہوں:

۱) ایک کتاب جس میں علم کا تعارف، ذہنی فکر، اصولِ دلائل، اختلاف کے پروٹوکول وغیرہ ہو۔

۲) اصولوں پر مبنی ایسی کتاب جو داعیِ حق ہو، تنازعات کو ہوا دینے کی بجائے میانہ روی اختیار کرنے والی ہو، عیسائیت اور اسلام کے درمیان جو اختلافات ہیں ان سے متعلق جو مزید تفصیل مہیا ہوں، مزید برآں اس میں وہ اسلامی تعلیمات زندگی پر لاگو ہونے والی ہوں جو دنیاوی اور اُخروی زندگی کے لئے ضروری ہوں۔

Marfat.com

۳) ایسی کتاب جو صحیح اور غلط کی تشریح کرتی ہو، جس میں دین کا استعمال اور منطق کے اصول ہوں۔

۴) تاریخ کی وہ کتاب جو تفصیل سے اسلامی فتوحات اور کیسے دنیا بھر میں اسلام پھیلا؟ بیان کرے

اعلیٰ تعلیم سکولوں کے اساتذہ اور کالجوں کے پرنسپل صاحبان کو تیار کرنے میں مددگار ہوگی۔ جس کے نصاب میں قرآن کریم کی تفسیر، عربی زبان پر عربی میں بات کرنے کے لئے پورا عبور، علمِ حدیث، مطالعۂ اخلاقیات، انصاف کے تقاضے، علمِ تاریخ، دعوت دین مؤثر بنانے کا طریقۂ تبلیغ اور بات سمجھنے کا فہم و شعور ہو۔

آپ کی زندگی میں شعبۂ تعلیم کے بارے میں آپ کے یہ مشورے اور تجاویز محض مشورے اور تجاویز نہیں بلکہ آپ نے ۱۸۸۸ء میں بیروت سے قاہرہ واپس آئے اور ۱۸۹۵ء الازہر یونیورسٹی انتظامیہ کا رکن مقرر ہونے پر اور قبل ازیں ۱۸۷۸ء میں آپ نے اپنے اختیارات کے مطابق تعلیمی اصلاحات بروئے کار لائیں اور یہ آپ ہی کی تعلیمات تھیں کہ بعدازاں جناب حسن البناؒ شہیدؒ اور سید قطب شہیدؒ جیسی عظیم شخصیات کے علاوہ اور دیگر بڑی شخصیات منظرِ عام پر آئیں جنہوں نے ہر طرح کی مشکلات، ہر طرح کے مصائب جھیلتے ہوئے اسلام دشمن مغربی طاقتوں، ان کے وظیفہ خوار حکمرانوں اور لادین ذہن کے مالک حکمرانوں اور سیاستدانوں کا بلا کسی تیغ و تلوار ایسا سینہ تان کر مقابلہ کیا اور جاری رکھا کہ یہ سب ذلت و رسوا ہر کر بری طرح ہزیمت زدہ بنتی جا رہی ہیں۔ زمانہ کے لحاظ سے عرصۂ مقابلہ بہت طویل نظر آتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھا جائے کہ حملہ ایک دوطرفہ نہیں بلکہ کئی طرفہ ہے۔ محض جنگی اسلحہ اور نظریات نہیں، بلکہ کرپشن اور بدعنوانیوں کے ذریعہ مخصوص طبقوں کو ہر قیمت پر مسلط رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ تدبیر بھی دم توڑتی نظر آ رہی ہے۔

یہ تھیں شعبۂ تعلیم میں جناب محمد عبدہٗ کی نظر میں بعض مشورے اور تجاویز، جو آپ نے بلا کسی باقاعدہ سکول و یونیورسٹی اپنے گرد جمع ہونے والے حلقۂ تعلیم میں عام کیے، جو اس اسلامی معاشرہ میں جو صدیوں سے اسلام سے عملاً منقطع ہو چکا ہے، ایک داعی مردِ مؤمن کا کام، جسے کرامت کہا جائے، غلط نہ ہوگا۔

Marfat.com

اصلاحات کے بارے میں جناب عبدہٗ کی فکر:

آپ کا دَور وہ دَور ہے جب یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں جہاں اسلامی ممالک کو میدان جنگ میں شکست دے کر اپنا غلام بنا چکی ہیں، وہ اس پر قانع نہیں بلکہ ان کے سکالر ''ان شکستوں کا باعث ان کی پس ماندگی ہے، جو اسلام سے انہیں منتقل ہوئی ہے۔'' اس سوچ کے تحت مصری تعلیم یافتہ طبقہ نے جو یورپ کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر واپس مصر لوٹا اور مصری انتظامیہ پر حاوی ہو گیا اور عالمِ اسلام میں صرف وہ واحد ملک تھا جس کی طرف دنیائے اسلام کی نظریں اُٹھتی تھیں۔ اس کے پڑھے لکھے طبقہ کا مغرب اور مغربی تہذیب کا گرویدہ ہو جانا اُمت مسلمہ کے لئے بڑا چیلنج تھا، اس لحاظ سے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے خود مصر سے جناب عبدہٗ کی شخصیت ایک کراماتی طور پر ایسے پُراسرار انداز سے اُبھرتی ہے جہاں اغیار اور اپنے، دونوں شکست خوردہ ہو کر جاتے ہیں۔ چنانچہ اولاً آپ کا اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے اسباب زوال اُمت مسلمہ متعین کرنا تھا کہ سبب زوال اسلام نہیں، بلکہ اُمت کا اسلام سے بے خبری کی وجہ سے اس پر عمل پیرا نہ ہونا ہے۔

اسلام پر حملہ آور بحیثیت کر چیچن، نوآبادیاتی طاقتیں اور ان کی مشنری تنظیمیں تھیں، اس سلسلہ میں آپ نے دونوں کو مسترد کرتے ہوئے اسلام کی برتری پر زور دیا، کہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کے پیغام کا ترجمان ہے۔ جبکہ اس دور میں جب مغرب فتح یاب نظر آتا ہے، اس کی وجہ مذہبِ عیسائیت کی تعلیمات پر عمل نہیں بلکہ مغرب نے اسلام کی ان خصوصی اقدار کو اپنا لیا، جو اسے مناسب نظر آئیں، جبکہ مسلمانوں کا زوال اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اُن سے جان چھڑا لی۔ آج بھی اگر وہ اسلام کی اُن ضروری اقدار کو اپنائیں، جو کسی تہذیب اور حملہ آور کے مقابلہ کے لئے ضروری ہیں تو بلاشبہ آج بھی وہ غالب آسکتے ہیں۔

آپ کی رائے میں آزادی سے محرومی کی ایک بڑی وجہ آزادی اور غلامی کے فرق کے تعین سے عاری ہونا ہے، اس وقت بعض ممالک ڈائریکٹ غیر ملکی تسلط میں ہیں اور بعض ان کے زیر اثر ملکی غلامی کے زیر اثر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام عوام کو غیر ملکی تسلط اور ان کے اثرات دونوں کیخلاف بیدار کرنا ہے۔ عوام ان دونوں کو چیلنج کریں۔ ان کے اندر ایمان کا وہ جذبہ اور روح

Marfat.com

پروان چڑھائیں کہ یہ صورت حال مستقل رہنے والی نہیں۔ یہ غلامی اور آزادی سے محرومی اسلام کی نااہلیت نہیں بلکہ اسلام تو اغیار کے جھوٹے دعوؤں کا مقابلہ کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

جناب عبدہٗ کے سامنے موضوع یہ نہیں تھا کہ مسلمان ہوتے ہوئے جدید دنیا کو قبول کر لیا جائے، بلکہ موضوع یہ تھا آیا کہ اسلام دورِ جدید کے تقاضوں کو سمجھتا ہے؟ اس لحاظ سے اُن کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اسلام ہی ایک ایسا حقیقی مذہب ہے کہ وہ ہر دور میں زندگی کے مقاصد کی خدمت کرتا ہے۔ آپ کا اس اَمر پر زور تھا کہ ''اسلام ہی موجودہ دور کی خرابیوں کو دور کرتے ہوئے اس دور کی گندگیوں کو پاکیزگی میں بدل سکتا ہے۔'' موجودہ تہذیب جسے نادانی سے مغرب نے اپنایا ہے جب صحیح اسلام کو سمجھ پائے گی وہی اس کا سب سے بڑا دفاع کرنے والی ہوگی، اور مضبوط سے مضبوط تر بنائے گی۔ ہر طرح کی خرابیاں جڑ سے اُکھڑ جائیں گی، اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم اسلام کے بارے میں ایک زندہ جاوید گواہ ہے۔''

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک کرتا ہے۔ اسکے ماننے والوں کی اپنے مذہب کی طرف واپسی اُن کو ایک مضبوط طاقت بنا دیگی کیونکہ یہ واپسی انکے دلوں کا غبار صاف کر دے گی، ان کے اخلاقی دھاگے استوار کر دے گی، اور اُمت کے دفاع میں ایک ناقابل شکست جذبہ انگیخت کر دے گی۔ صدیوں سے اُمت کے ہر فرد کے دل میں مذہب کی روح زندہ ہے، انکے دل اس پر قانع ہیں، ہر وہ شخص جس کے دل میں احیائے اسلام کی لگن ہے، جلتی آگ پر پھونک مارے تو وہ ہر روح کو تابندہ کرتی جائے گی۔''

'اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے معاملات درست ہوں، تو فتح حاصل کرنے کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں، اور اسلام کی حقیقی بنیادیں اپناتے ہوئے فتح اپنی منزل قرار دیں، کوئی طاقت آپ کا راستہ نہ روک سکے گی۔

آپ کا فرمانا تھا کہ: ''جب ہم مسلمانوں کو اپنے دین کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دیتے ہیں تو یورپ کو اس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے البتہ عیسائی بالخصوص ان کا مذہبی طبقہ جب مسلمانوں کو اسلام کی طرف لوٹ آنے کے بارے میں سنتا ہے تو وہ اسلام کا ذکر ایک دیو Monster کے طور پر

Marfat.com

کر کے ڈراتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے ادائیگی حج کو عیسائیت کے خلاف ایک سازش کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ یہ فریضہ ایک دیانت دارانہ باہمی راہ ورسم ہے، جسے غلط رنگ دینے میں ذرا شرم نہیں آئی۔ مزید برآں اس کا مقصد ایک دوسرے کے تجربات سے کچھ سیکھنا، اپنی بعض خرابیوں کو ایک دوسرے سے مل کر دور کرنا، ایک دوسرے کے مصائب، ناانصافیوں اور مشکلات کا دفاع کرنا ہے، انہوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں نے لفظ ''توکل'' غلط معنوں میں لیا گیا ہے، جس نے انکے اندر سستی Laziness پیدا کی ہے۔ جس نے کام کرنے کی بجائے اُن میں اپنا معاملہ ''تقدیر'' پر چھوڑنے کی راہ اپنائی ہے۔ اس بے عقلی کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوگا۔

لفظ ''توکل'' کو غلط معنوں میں سمجھنے کے علاوہ مسلمانوں نے اسلام سمجھنے میں ایک غلطی یہ بھی کھائی ہے کہ عظمت واقتدار اسلام کا مقدر ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی مسلمان کسی مصیبت یا سختی کا شکار ہوتا ہے کہ وہ اس مصیبت کا سبب معلوم کر کے اس کو دور کرنے کا علاج کرے، وہ اس میں سکون محسوس کرتا ہے اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ ازخود یہ مصیبت کب دور ہو۔

جناب عبدہٗ کی زیادہ دلچسپی انسانی حالات کے حقائق معلوم کرنے اور ان کے مطابق اصلاح کرنے میں تھی۔ بجائے اسکے کہ انکے بارے میں کوئی فلسفیانہ یا صوفیانہ بحث کے دروازے کھولے جائیں، اور اس بارے میں اس حد تک چلے گئے کہ دلیل کے ذریعہ حق و باطل کے درمیان صحیح راہ اختیار کرنے پر قادر ہے۔ اس بارے میں آپ کے دو علمی کام ''رسالۃ التوحید'' اور ''الاسلام والنصرانیۃ مع العلم والمدینۃ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس بارے میں آپ نے ''دلیل، وحی اور انفرادی اخلاقی مزاج'' کو یکجا سمو دینے کی کوشش کی، لیکن بالآخر دلیل کو سب پر ترجیح دی۔

(نوٹ:...... اس بارے میں آپ نے ان تینوں امور پر بحث کی ہے، لیکن وحی پر دلیل کو ترجیح دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان کسی طرح بھی دلیل کو وحی پر ترجیح نہیں دے سکتا، جبکہ وہ ہر حالت میں صحیح العقیدہ مسلمان تھے، جب کہ مضمون نگار ایک عیسائی ہین اور ہر طرح کی غیر جانبدارانہ کے باوجود جناب عبدہٗ کی عزت واحترام کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر رہی ہین۔)

Marfat.com

اصلاحات کے بارے میں جناب عبدہٗ نے یہ بھی کہا کہ:

''اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا ''خلیفہ'' (نائب) مقرر کیا ہے کہ وہ اس کی زمین پر تہذیب وتمدن تعمیر کرے۔ جبکہ اس مقصد کیلئے اس تہذیب وتمدن کی تعمیر کیلئے اسکی طرف سے آخری معمار حضرت محمد ﷺ ہیں جبکہ اس تعمیر کیلئے ہر شخص اپنی صلاحیتوں اور وسائل کے مطابق یوم آخرت اس کا جواب دہ ہے۔''

شعبۂ سیاست:

آپ کا دور یورپی استعماری طاقتوں کی برتری کا ایسا دور ہے، جسے عالم اسلام کا چیلنج کرنا تو درکنار، اگر برائے نام کوئی مسلمان ملک آزاد کہلانے کا دعویدار ہے، تب بھی وہ کسی یورپی ملک کے زیر اثر ہے اور اس خوف میں مبتلا ہو کر حکومت کر رہا ہے کہ اگر اس نے بالادست حکمران کی پالیسی سے ذرا اختلاف کیا، تو اس کی حکومت کا تختہ اُلٹ جائیگا، ایسے میں جناب عبدہٗ کی شخصیت یورپ کی ہر حکومت کو سیاست کے میدان میں بڑے موثر انداز میں چیلنج کرتی نظر آتی ہے جبکہ یہی وہ اصل میدان ہے جس میں جناب عبدہٗ نے بغیر کسی حکومت تحریک احیائے اسلام کی نہ صرف مدافعت کی، بلکہ خود استعماری طاقتوں اور انکے ایجنٹوں کو باوجود اپنی برتری اسلحہ منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔

اس میدان میں آپ کا ایک بڑا حریف عرب عیسائی رسالہ ''الجمیعۃ'' اور اُس کا ایڈیٹر ہارون انطون تھا جو غالباً قاہرہ سے شائع ہوتا تھا۔ اسکی اشاعت بہت زیادہ اور عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے اعلیٰ حلقوں میں بڑی مقبول تھی، انطون کا اس بات پر بڑا شدومد سے زور تھا (جسے اسلام سے دور مغرب زدہ اور مغرب کے فیشن کے دلدادہ مسلمانوں نے قبول کرلیا) کہ اسلام اور مسلمانوں کے زوال اور پس ماندگی کا سبب اسلام کی تعلیمات ہیں، جن میں مذہب اور حکومت کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا گیا ہے۔ جب کہ مغرب کی ترقی کا سبب دونوں کی علیحدگی ہے۔ جناب عبدہٗ کا اس کے اس موقف میں ایک جواب یہ تھا کہ مذہب عیسائیت جس کی مغربی تہذیب علمبردار ہے، کہ عیسائیت مذہب اور لادینی حکومت کو ایک دوسرے سے علیحدہ

Marfat.com

نہیں کرتیں کیونکہ عیسائی تعلیمات عام انسانی زندگی کو اپنے مذہبی پیشواؤں کے تابع کرتی ہیں۔ ثانیاً ان کا حریف اسلام کی صحیح تعلیمات ہیں۔ جو مسلمانوں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ مذہب عیسائیت کی طرح اسلام علماء کی مطابعت کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اُمت مسلمہ من حیث الجموعی نہ صرف کسی کو حاکم یا حاکمیت کا درجہ دینے کا حق رکھتے ہیں بلکہ حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے بڑھ کر اپنے ماتحت عوام کی خیر و بہود کو یقینی بنائے۔ اُمت Ummah اس اجتماعیت کا نام ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کیا چیز اس کے مفاد میں ہے اور اپنے مفاد حاصل کرنے کیلئے اسے کیا کرنا چاہئے۔ البتہ اُمت مسلمہ کی بدقسمتی کہا جائے کہ راہِ ہدایت سے گمراہ مغرب کو طعنہ دینے کا موقعہ ملا کہ اُمت جس صورتحال سے دوچار ہے وہ اسکی حکومت، اسکے علماء اور قانون سازوں کی مغرب کی سیاسی چالوں سے ناواقفیت کہ وہ ان سے واقف ہو کر اپنے حکمرانوں پر صحیح راہِ عمل اختیار کرنے پر زور ڈالیں۔ یہ اُس کا نتیجہ ہے کہ اُمت مسلمہ زوال کا شکار ہے۔ پھر ہمارے حکمران وہ ہیں، جنہیں انصاف کے ساتھ حکمرانی کوئی سلیقہ نہیں، انہوں نے اپنی خواہش نفس کی خاطر ان علماء اور قانون سازوں کو کرپشن کے ذریعہ وہ "فتاویٰ" جاری کرنے کا اختیار دیدیا ہے، جو ان بدکردار حکمرانوں کی خرابایاں دور کرنیکی بجائے مزید خرابیوں کا اختیار دیں۔

جناب عبدہٗ کے نزدیک اُمت کا وقار بحال کرنے کے لئے اس میں اتحاد اور انصاف کی اہم ترین ضرورت ہے، جو دونوں باتیں اُمت مین ناپید ہیں، اس کی بڑی وجہ لیڈرشپ کا فقدان ہے۔ اس تمام خرابی اور زوال کی وجہ اُمت کا انتشار ہے۔ پھر جن مین لیڈرشپ کی صلاحیتیں ہیں کہ وہ اُمت میں اتحاد پیدا کر کے اُمت کا وقار و عزت بحال کریں، وہ اغیار کے خطابات حاصل کر کے خود اپنے عوام کو اغیار کی غلامی میں دے کر ان کے مصائب و مشکلات میں اضافہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ حکمران وہ ہیں جو عوامی دولت غصب کرتے ہیں اور انصاف مہیا کرنے میں کوتاہ...... کس لئے؟ محض اپنی عیاشی اور خواہشات نفس کی خاطر! مزید برآں کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھیں کہ اس معاملہ مین کسی کتاب کا مطالعہ ضروری ہے یا سنت کی پیروی کریں دونوں باتیں انہیں گوارہ نہیں۔

Marfat.com

جناب عبدہٗ کا اس اَمر پر زور تھا کہ ''اسلام میں فیصلہ کن امر اللہ تعالیٰ کا حکم اور آخری پیغمبر ﷺ کی سنت کے علاوہ کوئی اور نہیں۔'' جن میں دعوتِ حق اور مذمتِ شر کے علاوہ دیگر کوئی بات نہیں، ہر دور کے مسلمانوں کے لئے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ ہدایت ہے، اس اہم ہدایت کی متابعت میں ہر صحیح کو بڑے سے بڑے شر کا مقابلہ کرنا ہے کہ انصاف کیا کہتا ہے۔

جناب عبدہٗ کا عیسائیت پر یہ بڑا اعتراض تھا کہ جو شخص عیسائیت میں (خواہ در پردہ اس میں کتنی برائیاں کیوں نہ ہوں) پوپ کا مقام حاصل کر لے اسے مذہبیت اور سول دونوں کی حاکمیت حاصل ہے۔ جبکہ اسلامی شریعت نے عوامی حقوق اور بڑی سے بڑی اتھارٹی کے اختیارات متعین کر دیئے ہیں۔ حکمران خواہ وہ خلیفہ کہلائے یا سلطان، اسلام میں انصاف مہیا کرنے کیلئے قاضی کا عہدہ ہے اور کسی قانونی معاملہ میں قاضی جو فیصلہ کر دے، حکمران کو وہ فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔

حدود قائم کرنے اور حقوق متعین کرنے کے بارے میں اسلام نے ایک راہ مقرر کر دی ہے۔ جو حکومت قاضی کے فیصلہ کا احترام نہ کرتے ہوئے سائل کو انصاف مہیا نہ کرے، اسے قانون سازی کا نام دیا جانا قانون کے ساتھ مذاق ہے۔ اسلام میں خلیفہ یا سلطان کو قاضی کے فیصلہ کو نافذ کرنا ہوگا، خلیفہ یا سلطان معصوم نہیں، نہ ہی اب وحی کا نزول ہے اور نہ وہ قرآن کی تفسیر کرنے کا اہل ہے۔ تاہم عربی زبان پر عبور حاصل ہونا چاہئے تا کہ وہ قرآن کریم اور طریقۂ نبی آخر الزماں ﷺ سمجھنے پر قادر ہو اور آزادی سے حق و باطل کے درمیان امتیاز کر سکے اور بہ آسانی انصاف مہیا کر سکے۔ اسکی فرماں روائی اسی وقت تک جائز ہے جب تک وہ قرآن کریم کے احکامات اور سنت رسول ﷺ کی پابندی کرتا ہے۔ لیکن مسلم رعایا کو اسکے طرزِ عمل اور غلط کاموں میں اسکی گرفت کا حق حاصل ہے چنانچہ اگر وہ راہِ حق سے تجاوز کرے تو اس کا محاسبہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی اصلاح کی جائیگی۔ جو حکمران اپنے خالق (اللہ تعالیٰ کی کتاب) کے احکامات سے انحراف کی راہ اختیار کرتا ہے وہ حکمرانی کے حق سے محروم ہو جاتا ہے اور اسکی جگہ کسی اہل تر کو حکمرانی کا موقع دیا جائے گا۔ یہ ذمہ داری بحیثیت مجموعی ''اُمت'' کی ہے، جسے پورا اختیار ہے۔ اس نااہل حکمران کو حکمرانی سے ہٹایا جانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ خود اسکے مفاد میں ہے۔ چنانچہ

Marfat.com

اس لحاظ سے ایک مسلم حکمران (خلیفہ یا سلطان) ایک عام حاکم ہے کوئی مذہبی پیشوا نہیں۔

جناب عبدہٗ اُمت مسلمہ کے لئے یہ لازم قرار دیتے تھے کہ قرآن کریم کی ہدایت ''شوریٰ'' ومشورہ کے تحت اہم امور میں حکمران کو مشورہ دیں۔ قرآن کریم کا حکم آمریت اور آمرانہ سوچ پر ایک ضرب کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں جہاں اُمت کی خیر و بہبود کا سامان ہے وہاں وہ ''شریعت'' کی پابندی کرتے ہوئے اغیار کی سازشانہ کارروائی کو ناکام بناتے ہیں۔ مسلمانوں میں ''شوریٰ'' کا طریقہ اپنانا کسی ریسرچ ''تحقیق'' کا نتیجہ نہیں جو متنازعہ فیہ کہلائے۔ اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ تلاشِ حق ہے اور ایسے نظام کا قیام ہے جو عوام کے مفاد میں ہے۔ اس بارے میں مغربی مفکرین کو اپنے ذہنوں سے یہ بات نکال دینی چاہئے کہ قوانین انصاف اُن کے مرہون ہیں۔ بعض قوانین ایسے ہوتے ہیں جو ان کے لئے مناسب ہوں، لیکن دوسروں کے لئے نہیں۔ نفع مندی کا تعین کرنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کس قوم کے حالات اور مزاج کے مطابق زراعت، تجارت وغیرہ کے شعبوں میں کس قسم کی قانون سازی کی جائے، وہ ملکی قانون ساز جو ان شعبوں میں قانون سازی کا شوق رکھتے ہیں، ان کو چاہئے کہ اس بارے میں اغیار کے دروازے کھٹکھٹانے کی بجائے اپنے لوگوں کے مزاج و حالات کا جائزہ لے کر قانون سازی کریں۔

جناب عبدہٗ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ کو بڑے اصرار سے یہ توجہ دلاتے تھے کہ انہیں اپنے مغرب کے بڑے سکالرز کے مقابلہ میں اس بارے میں کسی معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی ضرورت نہیں کہ ''اسلام اس دنیا اور یوم آخرت دونوں کو یکجا کرتا ہے''۔ جب کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ یورپ جو عیسائیت کا پیروکار ہے، یہ عیسائیت ہے جس نے اس دنیا اور یوم آخرت کے بارے میں دوہرا رویہ اختیار کیا ہوا ہے۔ پھر جناب عبدہٗ نے یورپ کو اس بارے میں دوہرے معیار کا مجرم گردانا۔ جسکی ایک مثال فرانس ہے، جس کی حکومت نے ''یسوع مسیحی فرقہ'' Jesuists کے عیسائیوں کو فرانس بدر کر دیا کہ وہ ریاست کے معاملات میں دخل دیتے ہیں، پھر اسی فرقہ کے عیسائیوں کی لبنان میں فوجی اور مالی مدد کرتی ہے کہ وہ لبنان میں عیسائیت کی تبلیغ کریں اور اس مقصد کے لئے یورپین نے مسلمانوں کی اراضی ہتھیالی ہیں اور بہانہ یہ تراشا ہے کہ

Marfat.com

معاشرہ کو مذہبی پابندیوں سے آزاد کیا جائے۔ پھر اسی پر کہ "اسلام میں ریاست کی سیاست مذہب سے علیحدہ نہیں" بس نہیں کی، خود اس کی دورُخی پالیسی یہ ہے "فرانس کی حکومت مشرق میں کیتھولک مذہب کی محافظ ہے"۔ برطانیہ میں ملکہ برطانیہ اپنے آپ کو "پروٹسٹنٹوں کی ملکہ" کہتی ہیں اور تیسرے بڑے عیسائی ملک روس کے بادشاہ زارِ روس، روس کا بادشاہ، بیک وقت بادشاہ اور چرچ کا پیشوا ہے۔ ایسے میں کیا امر مانع ہے کہ سلطان عبدالحمید کو خلیفۃ المسلمین اور فوج کا کمانڈر نہ سمجھا جائے۔

جناب عبدہٗ نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ یورپ یا اسکے عیسائی سکالرز نے اسلام پر حملہ کیا ہو اور آپ نے اس کا منہ توڑ جواب نہ دیا ہو، لیکن اسکے باوجود جتنا عرصہ آپ لبنان مین رہے، آپکے حلقۂ اثر میں ایک بڑی تعداد عیسائی طلباء کے علاوہ آپکے بیشتر عیسائی دوست تھے۔ آپ نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ مصر کی نیشنل پارٹی ایک سیکولر پارٹی ہے لیکن اسکی اس رُکنیت یہودیوں اور عیسائیوں کیلئے بھی کھلی ہے۔ آپکا کہنا تھا کہ بطور انسان سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کسی سے نفرت کی اجازت نہیں دیتی، اور سب کو مساویانہ حقوق اور برادرانہ سلوک روا رکھتی ہے۔ اس بات کے باوجود اسلام کا ایک پہلو "جہاد" یا جنگ ہے، لیکن اس میں "فساد" یا "فتنہ" سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ خلافت عثمانیہ پر یہ الزام کہ اس میں عیسائیوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا، اسکے جواب میں آپ کا کہنا تھا کہ ماسوائے شرعی عدالتوں کے "قبطی" عیسائی تمام محکموں میں اعلیٰ ملازمتوں تک موجود ہیں۔ آپ نے طنزیہ انداز میں سوال کیا:

۱) کیا کسی عیسائی کو ملازمت سے برطرف کیا گیا ہے؟

۲) کیا کسی عیسائی وکیل کو وکالت سے منع کیا گیا ہے؟

۳) کیا کسی عیسائی کو اخبار کی اشاعت سے روکا گیا ہے؟

۴) کیا کسی عیسائی کو پرنٹنگ پریس قائم کرنے کی اجازت نہیں دی گئی؟

۵) کیا کسی عیسائی صنعتکار کو صنعت قائم کرنے سے روکا گیا ہے؟

ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے، بلکہ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو:

(الف) عیسائیوں کو مسلمان شہریوں کے مقابلے میں ترقیاں دی جاتی ہیں۔

Marfat.com

(ب) ان کو وہ مراعات دی جاتی ہیں جس کے وہ مستحق نہیں۔

حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ کے سفارتی حلقہ میں کئی سفیر عیسائی ہیں۔ خود سلطان کے عیسائی فرقوں کے پیشواؤں سے بڑے عمدہ مراسم ہیں اور اپنے دربار میں اُن کا بڑا احترام سے استقبال کیا جاتا ہے۔

یہ تھا جناب عبدہٗ کا یورپ اور یورپی سیاست کے دوہرے معیار کے مقابلہ میں ان کو ایسا منہ توڑ، منہ در منہ جواب، جس سے ہمارے اہل علم بے خبر تھے، جبکہ آج کے دور میں ضرورت ہے کہ ہمارے سیاستدان یورپ کے اس دوہرے معیار سیاست سے سبق لے کر اپنے ممالک کی سیاست اپنائیں۔ اور جناب عبدہٗ کی تمام شعبوں کی تعلیمات ہر طبقہ میں پہنچائیں بالخصوص ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے بعد پاکستان کے حکمرانوں نے جس سیکولرازم کی راہ پر ڈالا ہے، یونیورسٹیوں اور کالجوں سے اُن کو بے دخل کریں۔

حقوق نسواں:

سماجی اصلاحات کو بھی جناب عبدہٗ نے ضروری قرار دیا، کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق شرعی احکامات کو نظر میں رکھتے ہوئے ان پر نظر ثانی کی جائے۔ آپ کا یقین تھا کہ ایک مضبوط قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے ایک مضبوط سماجی رشتہ کا قیام ایک نازک عنصر ہے۔ جسکے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ کی نفسیاتی اصلاح کی جائے۔ جو اسلامی معاشرہ پر مغرب کے فریب خوردہ اور خرابی کے شکار حملوں کا جواب ہو۔ ایسے نئے معاشرہ کی تشکیل میں ہر فرد کا کردار اپنی اپنی جگہ اہم ہے، اُمت مسلمہ خاندانی وحدتوں سے تعبیر ہے اور جب تک یہ وحدتیں ایک صحت مند ماحول پیدا نہ کریں گی معاشرہ ہچکولے کھاتا رہے گا: ''اسکی اجتماعیت میں گھرانوں کی خیر و بہبود ہے''۔ اپنے دور کے معاشرے میں مسلم خواتین کا کیا کردار ہو؟ اس کیلئے وہ ضروری خیال کرتے تھے کہ انکے رسم و رواج میں کچھ اصلاحات عمل میں لائی جائیں جس کی بنیاد میاں بیوی کے ازدواجی رشتہ میں دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے عزت و احترام ہو۔ جس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل تخلیق ہوگی، جس میں خود اعتمادی، عزت نفس ہوگی اور اغیار اسے اپنا کھلونا نہیں بنا سکیں گے۔

''یاد رکھو جو مرد ظلم و زیادتی کے ذریعہ عورتوں کے اپنے گھروں میں آقا بننا

Marfat.com

چاہتے ہیں وہ اغیار کے لئے غلام نسل پروان چڑھاتے ہیں۔''

مغربی مؤرخین کے اس الزام کے جواب میں کہ''اسلام عورتوں پر ظلم و زیادتی کا مذہب ہے''۔آپ کا کہنا تھا کہ اسلام تذکر و تانیث کی مساوات کا دین ہے۔چنانچہ

''مرد و عورت حقوق و فرائض کی ادائیگی میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ احساسات،عزت نفس میں بھی برابر ہیں۔''

آپ نے مغربی معترضین کو اسلام کے سمجھنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ:

''اسلام میں مرد و عورت کے حقوق و فرائض میں ہم آہنگی ہے اور یوم آخرت دونوں اپنے اپنے اعمال کی حساب دہی کے جواب دہ ہیں اور دونوں کے لئے حصول علم ضروری ہے۔ جب کہ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانا دونوں پر لازم ہے۔''

قرآن کریم کی آیت ۲:۲۲۸''الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ ''مردوں کو خواتین پر فضیلت حاصل ہے''، کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آپ نے اپنے قارئین کو توجہ دلائی کہ یہ امتیاز انتشار سے بچنے کی خاطر ہے۔ کیونکہ ہر خاندان ایک معاشرتی ادارہ ہے۔اور ہر معاشرتی ادارہ کا انتظام کرنے کے لئے ایک لیڈر کا ہونا لازمی ہے۔طاقت و توانائی کے لحاظ سے مرد لیڈرشپ کے زیادہ اہل ہیں،اور بوجہ اپنی توانائی رزق و دولت سے وہ خاندان کی بقاء اور آسائش مہیا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔قانون کے لحاظ سے خاوند اپنی طاقت و توانائی کے بل بوتہ پر اپنی بیوی کی جان اور عزت کا محافظ اور رزق مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔اسکے جواب میں بیوی پر خاوند کی اطاعت و فرمانبرداری لازم آتی ہے۔لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس پر ظلم و زیادتی کی جائے اور کونے میں دھکیل دیا جائے، بلکہ اپنی جگہ دونوں باہمی طور پر اپنی ذمہ داریاں پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

''مرد عورت کے لئے ،عورت مرد کے لئے ، دونوں ایک جسم کا جگر گوشہ ہیں۔مرد سر ہے عورت باقی جسم۔''

تاہم آپ کا یہ بھی یقین تھا کہ کسی خاتون میں لیڈرشپ اور بہتر فیصلہ کرنے کی خصائص

Marfat.com

زیادہ ہیں، تو مرد کی برتری ختم ہو جاتی ہے، ایک اور جگہ پر آپ نے قرآن کریم کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ خواتین میں نیک و حق پر قائم اور فتنہ پرور دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔ ایسے میں گر کوئی بیوی مؤخر الذکر خرابیوں کا شکار ہو تو شوہر کو اپنے اختیارانہ حقوق استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔"

جناب عبدہٗ نے معاشرہ میں خرابی کی بگاڑ کی وجہ مردوں کی حد سے زیادہ خواہشات نفسانی میں خوشی کو قرار دیا۔ اپنے دیگر ہم عصر سکالرز کی طرح آپ نے عورتوں پر الزام نہیں لگایا کہ وہ مردوں کی نفسانی خواہشات کو اُبھارتی ہیں، بعض اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ

"عورتوں میں خواہش نفس کی تسکین زیادہ ہے۔"

آپ کا اس بارے میں جواب تھا کہ اس کا کوئی ثبوت یا مواد نہیں بلکہ ماضی میں بھی مرد تھے اور اب بھی مرد ہیں۔ جو عورتوں کو اپنی خواہش نفس کی تلاش میں رہتے ہیں اور جہاں موقعہ ملے وہاں زیادتی کرنے سے بھی باز نہیں آتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ اُن غریبوں کے کیا احساسات ہیں۔

اس بارے میں آپ کی رائے تھی کہ اس بارے میں اصلاحِ معاشرہ کے لئے کچھ قوانین وضع کرنا ضروری ہیں جو مردوں کی دیدہ دلیرانہ ایسی خواہشات کو کنٹرول کر سکیں اور ان کی خواہشات کو حدود میں رکھنے والے ہوں۔

یک طرفہ زوجیت Monogomy کے بارے میں یہ آراتھیں:

۱) اگر ہر عورت ہر مرد کے لئے جائز قرار دی جائے اور ہر عورت ہر مرد کی شریک حیات بن سکے، تو اس کے نتیجہ میں فطرتِ انسانی کے مطابق حد کی آگ کسی وقت بھڑک کر خون خرابہ کا باعث ہوگی۔

۲) فطرتاً عورت حصول رزق کے بارے میں نا اہل ہے، اس کے ساتھ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔ بالخصوص دورانِ حمل اور حیض۔ اگر مرد عورت کو تحفظ دینے اور اس کے حقوق ادا کرنے کے نا اہل ہے تو عورت کی عزت و ناموس کو یقینی بنایا جانا ناممکن ہے۔

۳) نو مسلم مرد کو اپنے حصول رزق کے لئے قدرے زیادہ محنت کرنا ہوگی اور وہ افراد جن کی روزی کا وہ ذمہ دار ہے، ان کے لئے اُسے کچھ نہ کچھ بچاتے رہنا ہوگا۔

Marfat.com

مرد کی زندگی کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ جب تک اس کی زندگی میں اہل وعیال نہ ہوں، وہ اپنی ضرورت سے زیادہ حصول رزق کی تگ ودو نہ کریگا۔ مرد کیلئے اہل وعیال کا ہونا نہ صرف اسکے اندر زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی تحریک کرتا ہے بلکہ ایک یہ جذبہ بھی، کہ جب اس کے قویٰ کام کرنے سے جواب دیدیں گے تو اسکے یہی اہل وعیال اس کی خبرگیری کریں گے جب تک اس کے بیوی بچے اس کے محتاج نہ ہوں، وہ مستقبل کے لئے بچانے کی کوشش نہ کرے گا۔

مغربی معترضین کا عورت کے بارے میں اسلام پر اعتراضات کا کئی مباحث میں آپ نے اپنی اسلامی فکر کے مطابق جواب دیا۔ مغربی معترضین کا ایک کثیر الازدواجی پر سب سے بڑا اعتراض ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں کثیر الازدواجی کا رواج نہ تھا موجودہ دور میں اسے جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ ابتدائی دور میں یہ اجازت اس وجہ سے مقبول تھی کہ اس کے نتیجہ میں مزید باہمی رشتہ داریاں قائم ہوتی تھیں اور ایک مزید مضبوط معاشرہ اور معاشرتی برادری ظہور میں آرہی تھی۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اپنی تمام ازواج سے قابل رشک حُسن سلوک تھا۔

آج کے دور میں جہاں شریعت میں چار بیویوں کی اجازت ہے وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عملاً یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے سب کے ساتھ مساوی حقوقِ ادائیگی زوجیت کرسکے، جو مرد کے لئے ممکن نہیں، ایسے میں مرد اس سے بچے، تو اسکے لئے اچھا ہے۔ مزید برآں (سوائے جماع) اس کو ہر بیوی کے لئے مساویانہ طور پر علیحدہ علیحدہ رہائش، لباس، خوراک اور دیگر اخراجات کا انتظام کرنا لازمی ہے۔ اگر مرد شریعت کے ان احکام پر اس کے لئے ممکن نہ ہوگا تو از خود ایک بیوی پر قانع ہوگا۔ اگر انصاف اور مساویانہ سلوک سنجیدگی سے مدنظر رکھے جائیں تو یہ نظر نہیں آتا۔ کوئی شخص انصاف کے تقاضے پورے کرسکے، مزید برآں "حنفی" مکتبۂ فکر یہ تسلیم کرتا ہے کہ دین اسلام معاشرہ کی خیر و بہبود کے لئے آیا، لہٰذا اس کے علماء کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ انصاف کا مہیا کرنا ممکن نہیں، لہٰذا کثیر الازدواجی منع کی جائے۔

مغربی معترضین کے نزدیک دوسرا بڑا اعتراض "حجاب" پر ہے اس بارے میں آپ کا

Marfat.com

نکتۂ نظر یہ تھا کہ یہ ایک رواج ہے، جو مسلمانوں نے دوسرے قوموں سے اپنایا ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ (جناب عبدہ کا یہ نکتۂ نظر جمہور علمائے اسلام کی آراء سے ہٹ کر ہے۔) جہاں تک خواتین کی تعلیم کا معاملہ ہے، جناب عبدہ کا کہنا تھا کہ ان کی تعلیم صرف دینی تعلیم تک محدود نہ کردی جائے، بلکہ اس کے دائرہ کار میں گھریلو انتظام کیسے چلایا جائے' اولاد کی تعلیم و تربیت سے شناسا کیا جائے، دنیا کس طرف جارہی ہے، انسانی تعلقات کیسے ہوں، جہالت سے عورتوں کے حقوق غصب کرنا اور بے وقوفی سے خرابی کی طرف توجہ دلانا سخت جرم ہے۔

ان معترضین کا ایک اور اعتراض بہ آسانی مرد کو طلاق کا حق ہے، جو آپ کے دور میں جاری تھا۔ اس رواج کی اصلاح کے لئے آپ نے قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ دیا ''اللہ تعالیٰ طلاق کو سخت ناپسند کرتا ہے: ۲:۲۳۰۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ مسئلہ طلاق کوئی انفرادی مسئلہ نہیں بلکہ تمام اُمت کا اجماعی مسئلہ ہے۔ جس میں کچھ سماجی پابندیاں عائد کی جانی چاہئیں نہ کہ کسی فرد کا ایک خاندانی مسئلہ چنانچہ آپ نے اس کے حل کے لئے خاوند کی فوری طلاق دینے کے اختیارات کے خلاف معاملہ ''قاضی'' کے فیصلہ پر چھوڑا۔

معاشرہ مجموعی طور پر عورت پر ظلم و زیادتی کے ارتکاب سے روکے، بعض ناگزیر حالات میں عورت کو طلاق لینے کی اجازت ہو، مثلاً خاوند بلا کسی اطلاع عرصہ ہوئے کہیں چلا گیا ہے، جسمانی ظلم و زیادتی اور روزانہ گالی گلوچ اور مستقل لڑائی جھگڑا اسے باز نہ آنا۔

اس کے ساتھ خواتین کے بارے میں جناب عبدہ کی آراء ختم ہوتی ہیں۔

حرفِ آخر:

آپ کی شخصیت مختلف خصوصیات کا مجموعہ تھا۔ ایک معمولی دہقان کے گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن اپنی تعلیم عام نصابی تعلیم کی بجائے شروع ہی سے وہ حلقہ اساتذہ منتخب کیا جو عام نصابی تعلیم کی بجائے بلند علمی شعور کے مالک ہوں۔ جہاں آپ مصر پر غیر ملکی قبضہ کو سخت نفرت کے معنوں میں لیتے تھے، وہاں حکومت کے اعلیٰ مناصب کے عہدیداروں کے ساتھ بھی بڑے اچھے تعلقات قائم رکھے، تا کہ وہ خود بھی با اثر عہدہ حاصل کر کے اغیار کے حکومت پر اثرات کو ممکنہ حد

Marfat.com

تک زائل کر سکیں۔ کیونکہ آپ کی شخصیت یہ محسوس کر رہی تھی کہ پرانے نظریات کو نئے نظریات کا سامنا ہے، اس وجہ سے بڑی مصلحت کوشی سے کام لے رہے تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ایک طرف کٹر انتہا پسندی کا زور ہے لہٰذا انہیں ایسا میانہ روی سے کام لینا ہوگا کہ قرآن وسنت کی بنیادی تعلیمات پر کوئی زد نہ پڑے جو آپ کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ آپ کسی مصلح کا دعویٰ کئے بغیر انتہا پسندی میں تبدیلی چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے مناسب جانا کہ آپ ایک مرشد کا کام کریں تا کہ ان سے تربیت حاصل کرنے والے ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔ آپ نے اپنی زندگی کو قلم اور دعوت کے ذریعہ رشد وہدایت کا محور بنالیا۔ اور آپ کی ان دونوں باتوں نے اصلاحات کا رنگ اختیار کر لیا اور ''مکھی پر مکھی مارنے'' سے آزاد کر دیا اور مسلم عوام میں یہ اعتماد اُجاگر کر دیا کہ خود اسلامی تعلیمات کو ہوش مندی کے ساتھ سمجھ کر اُن پر عمل کریں۔ آپ بہت سی باتوں میں یہ دیکھتے ہیں کہ آپ کے دور کے مطابق اسلام کو اس کے مطابق کیسے بنایا جائے کہ ''سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''۔ آپ کا دور بڑا نازک دور تھا کہ مقابلہ یورپ کے ساتھ تھا جو اپنی مادی برتری کی وجہ سے اسلام کو حقیر نظروں سے دیکھتا تھا۔ جب کہ مسلمان قوموں نے اپنی کمزوریوں سے ان کو یہ موقعہ دیا تھا کہ وہ انہی نظروں سے دیکھا جائے جبکہ جناب عبدہٗ نے مقابلہ کرنے کے لئے کمزوریاں دور کرنے پر زور دیا۔ یورپ نے اپنی مادی برتری کی وجہ ''عوامی افادیت'' قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی برتری کے لئے ''المصلحت العامہ'' کا نظریہ اپنایا جو مقبولیت اختیار کر سکے۔ آپ کا دور مسلم ممالک میں بلا کسی محاسبہ بادشاہوں کا دور تھا جو خدائی اختیارات کے مالک تھے، جب کہ قرآن کریم نے کسی حکمران کو یہ اختیارات نہ دیئے تھے اور اس کے لئے حکومت کے لئے ''مشورہ سے حکومت'' ''شوریٰ'' کے ذریعہ حکومت کرنے کا اختیار دیا تھا، جسے یورپ نے لفظ ''جمہوریت'' استعمال کر کے طریقۂ حکمرانی اختیار کیا تھا۔ اور آپ نے بھی مسلم حکمرانوں پر ''شوریٰ'' یا ''جمہوریت'' کے ذریعہ حکومت کرنے پر زور دیا۔

اسلامی روایات پر عمل اور آزادیٔ عمل ان دونوں باتوں نے آپ کے اپنے حلقہ میں ایک دوسرے سے متضاد دو حلقوں کو جنم دیا۔ ایک حلقہ نے اثر لیا، تمام مصائب کا حل ''احیائے

Marfat.com

اسلام'' ہے، دوسرے نے ''مذہب کو ریاست'' سے علیحدگی کا نظریہ یعنی سیکولرازم اپنایا۔ اگرچہ پہلے مرحلہ میں سیکولرازم کامیاب نظر آتی ہے اور ''احیائے اسلام'' کی تحریک کا عوام ساتھ نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود سیکولرازم ناکامی کا اظہار کرتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ مسلمان ممالک میں عوام کی بہتری کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں، یہ عذر پیش کرتی ہے کہ اسے عوامی تائید حاصل نہیں، عوامی تائید نہ ہونے کی وجہ سے سیکولرازم ''جمہوریت'' کی آڑ لے کر آمریت میں اپنی بقاء پر یقین رکھتی ہے، اس آمریت نے ''جمہوریت'' کی آڑ میں کرنل ناصر اور صدام حسین جیسے آمروں کو حکومت کا موقعہ بخشا حالانکہ سوائے اسلامی ناموں کے، کھل کر ایسے انداز میں اپنے ملکوں میں حکومت کی کہ اسلام کا نام مٹ جائے۔ لیکن یہ آمر نشانۂ عبرت بن کر مٹ گئے، اور اپنی تمام تر سیکولرازم پر عمل پیرا ہونے کے باوجود ''احیائے اسلام'' کی تحریک کو اُبھرنے کا موقع دے گئے۔ اب مغرب نظریاتی طور پر اسلام کے مقابلہ میں شکست کھا چکا ہے لیکن اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے کرپشن کا سہارا لیا ہے جس میں پاکستان اپنے قیام کے روزِ اول سے کبھی فوجی آمروں کے ذریعہ اور کبھی بدعنوان اور اقتدار پرست اشخاص کے ذریعہ جمہوریت کے نام پر جو خود بھی ہر طریقہ سے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے حریص اور ایسے ہی ملک کی نوکر شاہی، دونوں کو اسلام دشمن مغربی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کبھی یہ طاقتیں آمریت کو جمہوریت کی ناکامی کا طعنہ دینے کا موقعہ دے دیتی ہیں اور کبھی جمہوریت کو ملکی مصائب کا ذمہ دار آمریت کو طعنہ دینے کا موقع دیتی ہیں، لیکن دونوں کے ساتھ خود ان کی سرپرست مغربی طاقتیں احیائے اسلام سے بری طرح لرزاں ہیں۔ عوام ان دونوں سے سخت نفرت کا شکار ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ کے بعد دو اسلام دشمن طاقتیں روس اور امریکہ ایک دوسرے کی حریف کے طور پر اُبھریں۔ اور ان کے اسکالرز نے محسوس کیا کہ تمام تر مادی وسائل اور پروپیگنڈا مشینری پر حاوی ہونے کے باوجود خاموشی کے ساتھ اُمت مسلمہ میں احیائے اسلام کی جو تحریک اُبھرتی جارہی ہے اُسے کیسے ختم کیا جائے؟ اس بارے میں اولاً روس نے افغانستان میں پہل کی۔ یہ سمجھ کر کہ یہ اگرچہ اس ملک میں کوئی شرعی حکومت نہیں نہ ہی اس کے پاس کوئی جدید ہتھیار ہیں،

Marfat.com

ماسوائے اس کے کہ اسلام کی خاطر مرمٹنے والے لوگ ہیں جو مادی اور اسلحہ کی برتری کی وجہ سے کوئی مشکل نہ ہوگی، جب کہ روسی اشترا کی ایمپائر کا ہمسایہ ہونا اس کی فتح کو مزید آسان بنادے گا۔ چنانچہ حملہ کر دیا گیا اور یہ نہ سوچا کہ اب خاموشی سے ایسی تحریک احیائے اسلام کی اُبھر چکی ہے جو کہ ہر اسلامی ملک میں کچھ نہ کچھ افراد یہ سمجھ کر اپنی چند افراد کی جمعیت سے اپنے ملک میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے، لہٰذا جس ملک پر بڑے پیمانے پر دشمنانِ اسلام کے خلاف کامیابیوں کی اُمید کے ساتھ جنگ کی جارہی ہے تو کیوں نہ اس ملک میں جا کر ان کا ساتھ دیں جو اسلام کو ایک زندہ و تابندہ رکھنے کی جنگ لڑ رہے ہیں، چنانچہ روس کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور دنیا کے گوشے گوشے سے ایک ایک کر کے خفیہ راستوں سے افغانستان میں داخل ہو کر روسی جارحیت کا مقابلہ کرتے رہے، تا آنکہ ایک دشمن اسلام سپر پاور کا خاتمہ ہو کر اس کا وجود پارہ پارہ ہو گیا۔

روسی ایمپائر کے خاتمہ کے بعد اس قوم کو جس نے اپنی ہمسایہ سپر پاور کی اُمت مسلمہ کے خلاف کسی قیمت پر بھی اسلام کی غیرت و آزادی داؤ پر نہ لگانے کا فیصلہ کر رکھا ہے، ہزار ہا میل دور سپر پاور نے دہشت گردی ختم کرنے کا بہانہ تراش کر اپنے قبضہ میں لینے کا اقدام کیا تو وہ بھی اب اسی انجام کی طرف جارہی ہے جس کی طرف اس کی حریف سپر پاور جا چکی تھی۔ بظاہر اگرچہ تحریک احیائے اسلام عوام کی نظروں میں زیادہ مقبول نظر نہیں آتی، لیکن وہ اپنے مصائب و مشکلات کی وجہ سے جن سے ان کو آمریت اور جمہوریت دونوں نے دوچار کیا ہے وہ ان مصائب و مشکلات کا حل نفاذ اسلامی حکومت ہی میں پاتے ہیں۔ جس کی لیڈر شپ دیانتدار، مخلص، منصف مزاج اور اغیار کے قرضوں سے نجات دلانے والی ہو۔ یہ تحریک ایک انقلاب کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے جو لینن (Lenin) کی لیڈر شپ میں روس کا اشترا کی انقلاب تھا، جس میں لاکھوں آدمی جاں بحق ہوئے۔ کسی مذہب کا نام لینا جرم بن گیا، بڑے محلات اور مالکان کے ساتھ کوئی شخص ذاتی جائیداد کا مالک نہ رہا، بلکہ اس کی جگہ ایسا پرامن انقلاب ہوگا جو اسلام کی روح ہے، اور اسلام دشمن طاقتیں اس سے ناواقف نہیں، اسلام کی یہی وہ پاکیزہ روح ہے جو تحریکِ احیائے اسلام کے نامور قائدین مغرب کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔

Marfat.com

آپ کی وفات

آپ نے مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۹۰۵ء کو قاہرہ میں وفات پائی۔ آپ کی پیدائش انیسویں صدی کے عین وسط ۱۸۴۸ء میں ہوئی، جبکہ وفات بیسویں صدی کے عین آغاز ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ جیسا کہ آپ کی ساری زندگی بتاتی ہے، آپ نے مصر اور خود یورپ اور یورپی تہذیب کے مرکزی شہر میں بیٹھ کر دعوتِ دین کا کام اور اُس کے بڑے سیاستدانوں بلکہ خود فرانس کے وزیرِ خارجہ کو اور عالمِ عرب میں عیسائیت کے مبلغ لیکن عربی اخبار کے ایڈیٹر فرح ہارون کو چیلنج کیا، یہ سب کچھ اُن کی زندگی ہر اِس کتاب کے مضمون میں بیان ہے، جو ہر لحاظ سے نہ صرف بڑا اہم ہے بلکہ اپنی وفات سے قبل ماڈرن مصر میں ایک مؤثر تعداد میں داعیانِ اسلام کے نوجوان تیار کر چکے تھے، جنہوں نے تحریکِ احیائے اسلام کو آگے بڑھایا۔

آپ کی وفات کے ایک سال بعد مصر جو عالمِ اسلام اور عالمِ عرب کے قلب میں عربیت کا سب سے بڑا مرکز ہے، ۱۹۰۶ء میں جناب حسن البنّاؒ پیدا ہوئے۔ چنانچہ جب آپ جوان ہوئے، اور آپ نے تحریکِ احیائے اِسلام کا کام شروع کرنے کا اِرادہ کیا، تو مشیت ایزدی سے آپ کو بڑی آسانی سے ایک اچھی تعداد اپنے مقصد کی مل گئی، جو لیڈر شپ کی ضرورت مند تھی اور آپ کی شخصیت میں اُن کو یہ لیڈر شپ مل گئی، جو جناب عبدہٗ کی وفات سے قبل انیسویں صدی کے آخر میں تیار ہوئی تھی اور حسن البنّاؒ نے بیسویں صدی کے اول ربع میں اِس کے ذریعہ بدعنوان ماڈرن مسلمان نسل کو چیلنج کیا۔

آپکی شخصیت عرب مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں میں بڑی کشش کا مرکز تھی، چنانچہ آپکے جنازہ میں ہزارہا عرب مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں اور یہودیوں کی معروف شخصیات کے ساتھ دیگر نے بھی شرکت کی۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یومِ آخرت آپکے درجات بلند فرمائے۔

Marfat.com

۳

جناب حسن البناؒ شہیدؒ

۱۹۰۶ تا ۱۹۴۹

ڈیوڈ کامنز

جناب حسن البناؒ شہید کی زندگی پر یہ مضمون امریکی سکالر ڈیوڈ کامنز David Commins کا مرہون ہے۔ جو ڈکنسن کالج میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے اپنے اس مضمون کو اپنے محسن سکالر رچرڈ پی مچل Richard P.Mitchell سے معنون کیا ہے، جو وفات پا چکے ہیں، جو ''سوسائٹی آف مسلم برادرز'' کے مصنف ہیں اور یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے، نام سے ظاہر ہے، کہ یہ کتاب ''اخوان المسلمون'' کے بارے میں معلوماتی ہوگی۔ اس مضمون کی تدوین میں ۸۶ حوالہ جات ہیں، جن میں مغربی مصنفین کی تصانیف

۱) G.Kampffmeyer by "Egpt and Westan Asia

۲) H.A.R.Gibb by "Whither Islam"

۳) On the variety of Religious Societies in Egpt By James Heywarth Dunne

۴) Charles Wendell by "Hassan-el-Banna" Yesterday & Today.

۵) Hassan-el-Banna(انگریزی ترجمہ)Towards the Light

شامل ہیں۔ دیگر حوالہ عربی تصانیف سے ہیں۔

Marfat.com

اِس مضمون کے مرتب کرنے میں اِس مغربی سکالر نے جس محنت سے کام لیا ہے، اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سکالر حسن البنّا شہیدؒ کی شخصیت سے عقیدت رکھتا ہے۔ پھر ایک کتاب نہیں، بلکہ ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک مضمون ہے، جس میں وہ سب کچھ سمو دیا گیا، جو ضخیم کتابوں کے وقت طلب کی محتاج ہوتی ہیں۔

سید حسن البناء شہیدؒ نے اپنی داعیانہ زندگی کا آغاز جیسا کہ مصر میں تحریک احیائے اِسلام کے پہلے محرک جناب محمد عبدہ' کی حیات پر مضمون میں بتایا جا چکا ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے ربعے میں آغاز ہوا۔ کوشش کی گئی ہے، بلا کسی تلخیص، پورے مضمون کا ترجمہ کتاب میں کیا جائے۔ جبکہ موقع محل کے مطابق بعض اضافے بھی ممکن ہیں۔

تحریک کا آغاز کیسے ہوا؟

۱۹۲۸ء میں حسن البنّاؒ کے نام سے ایک ۲۲ سالہ سکول ٹیچر نے سوسائٹی آف مسلم برادرز نام کی ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد خالص پاکیزہ اِسلامی نظام ایک موثر تحریک کی شکل میں قیام تھا اور یہ بیسویں صدی کا آغاز تھا۔ اگرچہ معاشرہ میں اِس کی طلب جناب عبدہٗ کی تحریک سے پیدا ہو چکی تھی، لیکن ایک عوامی تحریک کی بجائے ایک محدود حلقہ اِس کا خواہش مند تھا۔ حسن البنّاؒ نے اِس پاکیزہ خواہش کو ایک مخلص اور نمائش سے دُور صحیح فکر کے مالک ذہنوں کو اِس سمت ایسی ہر دلعزیزی دے دی، جو قبل ازیں اِسلامی دُنیا میں مفقود تھی، جبکہ آپ کا مقصد نہ صرف مصر میں بلکہ تمام عرب ممالک اور عالمِ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں حلقوں میں اِسلام کو جاذبِ نظر بنانا تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نویں عشرے میں سوڈان اور فلسطین سمیت تیونس سے لے کر مصر اور دیگر تمام عرب ممالک میں اِسلام کے لیے جو تڑپ ہے، وہ جناب البنّاؒ کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اپنی اِسلامی فکر کو مقبول بنانے کے لیے ایسا دل کش انداز اپنایا کہ دیکھتے دیکھتے ہزاروں مصری نوجوان آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے پورے خلوص اور دل و ضمیر کی آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ خود آپ کی شخصیت اُس کا نمونہ تھی۔ ضرورت صرف ایک مخلص اور نمود و نمائش سے ماورا لیڈرشپ کی تھی۔ جو مشیت

Marfat.com

ایزدی سے آپ کی ذات میں تھی، جبکہ زمین اُس کی روئیدگی کے لیے بالکل تیار تھی۔

اندرونِ مصر یورپی کارستانیوں کی تاریخ:

مصری تاریخ کی انیسویں صدی عیسوی تمام تر سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے یورپ کے تابع ہے۔ اِس صدی کے آغاز میں بڑی بھاری مقدار میں مصر یورپ کو کپاس برآمد کرتا تھا۔ اِس لحاظ سے کپاس کی کاشت مصر کی خصوصی طور پر ترجیح بن گئی۔ اس بڑھتی تجارتی منڈی کو یورپ صنعتی سرمایہ کاریوں نے یورپ اور مصر کے درمیان ایک بہتر تعلقاتی رشتہ کو مزید استوار کرنے کے لیے ''ٹرانسپورٹیشن'' کو ترقی دینا ضروری سمجھا۔ جو اپنے ایجاداتی ذہن کی وجہ سے مشکل امر نہ تھا۔ چنانچہ ریلوے، بندرگاہیں، ٹیلیگراف، ڈاکخانہ جات کا سلسلہ بڑی تیزی سے عمل میں لایا گیا۔ اِس سلسلہ میں اہم ترین کام نہر سویز کی تعمیر تھی جو ایک فرانسیسی انجینئر فرانس ڈی لیسپس Francis de Lasseps کا منصوبہ تھا اور ۱۸۶۹ء میں مکمل ہو گیا۔ جہاں اِن منصوبوں نے مصری اقتصادیات کو ماڈرن بنا دیا، وہاں مصری ریاستی خزانہ کو اپنا مقروض کر دیا۔ (یہ اِس وجہ سے تھا، کہ مصری سیاستدان سیاسی فکر سے دیوالیہ تھے۔ حالانکہ جس زمین پر نہر تعمیر ہو رہی تھی وہ مصری سرزمین تھی اور سیاست کا تقاضہ تھا کہ فرانس نہ صرف اپنے اخراجات سے نہر تعمیر کرے، بلکہ تعمیر کے بعد مصر کی ملکیت ہو نہ کہ فرانس کی، جسے بعدازاں برطانیہ نے اپنے قبضہ میں لے لیا، جبکہ نہر فرانس کی ملکیت ہوگئی اور نہر سے جو جہاز گزرتے تھے، وہ فرانس کو ٹیکس دہندگان تھے، یہ تھی یورپ کی مصری سیاست پر پہلی بالا دستی، جو یورپ نے بغیر کسی جنگ مصری حکمران اور اُس کے گرد سیاست سے دیوالیہ وزرا اور مشیران سے حاصل کی۔

یورپی طاقتوں کا تجارتی اور مالی اور اقتصادی شعبوں میں مصر میں یہ دخول ملک کے حکمران اور دولت مند طبقوں میں یورپی رسوم و رواج اور طریقۂ زندگی اپنانے کا باعث ہوا، لیکن حکمران طبقہ کے اِس عمل نے یورپ اور خود حکمرانوں کے خلاف عوام میں نفرت کا شعلہ بھڑکایا، اور یہ خواہش کہ اِن اثرات سے نجات پائی جائے۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں یورپ کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی بالادستی کے خلاف ایک تحریک اُبھری، جسے یورپی سرمایہ کاروں نے اپنے مفادات کے

Marfat.com

خلاف ایک خطرہ قرار دے کر برطانیہ نے ستمبر ۱۸۸۲ء میں مصر پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ ناکامی کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا کہ برطانیہ اِس شرط پر مصر سے اپنی فوج نکال لے گا، اگر اُس کے مفادات کو تحفظ دیا جائے، مصری حکومت نے عوامی جذبات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اِس شرط کو تسلیم کر لیا۔ لیکن یوزپ اور کفار نے میکیاولی سیاست کا سبق پڑھ کر کب کسی عہد پر عمل کیا ہے، چنانچہ برطانوی افواج بیسویں صدی تک مصر پر قابض رہیں۔

آزادی اور خود مختار مصر کے نام پر برطانیہ نے بالواسطہ اپنی حکمرانی قائم رکھتے ہوئے ایک نظام قائم کیا کہ مصر کی وراثتی حکومت کو دوام دینے کی خاطر ایک برطانوی ریذیڈنٹ بمعہ اپنے عملہ مصری دارالحکومت قاہرہ میں مقیم رہے گا۔ اگرچہ وہ عثمانی خلافت سے قطع تعلق نہ کرے گا۔ جبکہ مصری حکمران ''خدیو'' کہلائے گا، جو دوسرے معنوں میں برطانوی حکومت کا وائسرائے کے طور پر ہوگا۔ برطانوی حکومت اور مصری حکمرانوں کے درمیان یہ نظام پہلی عالم گیر جنگ سے قبل تک جاری رہا۔ بیسویں صدی کے عین آغاز میں اگرچہ مصر کی خود مختاری کے لیے ایک قومی تحریک اُبھری۔ لیکن ناکام رہی۔ لیکن بعدازاں جب ۱۸-۱۹۱۴ء پہلی جنگ عالم گیر کا آغاز ہوا، جس میں خلافتِ عثمانیہ برطانیہ کے خلاف اور جرمن قوم کی اتحادی تھی جبکہ مصر آئینی طور پر خلافت عثمانیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے جنگ میں خلافتِ عثمانیہ کا (بطور ایک مسلمان ملک بھی) ساتھ دینے کا ذمہ دار تھا، لیکن برطانیہ نے اپنی سیاسی مکاری کو عمل میں لاتے ہوئے مصر کو جنگ سے علیحدہ رکھ کر اُسے اپنی ''پناہ گاہ'' Protectroate قرار دے کر خلافتِ عثمانیہ سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا۔ تاہم ۱۹۱۹ء میں جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ کے خلاف تحریک اُبھری کہ برطانیہ اپنی فوج سمیت مصر سے نکل جائے۔ اُس وقت جناب حسن البنّاؒ کی عمر تیرہ سال تھی اور اِس تحریک میں آپ نے حصہ لیا۔ اگرچہ اولاً برطانیہ نے اِس تحریک کو ناکام بنا دیا، لیکن عوام برطانیہ سے اتنے برگشتہ ہوگئے تھے کہ بالآخر ۱۹۲۲ء میں اس نے (چند تحفظات کے ساتھ) مصر کی خود مختاری کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی فوج نکال لی۔ اِس لحاظ سے اوائل عمر ہی میں جناب حسن البنّاؒ نے سیاسی ماحول اپنا لیا تھا، بلکہ اغیار کے خلاف ایک فکری ذہن پیدا کر لیا تھا۔

Marfat.com

۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے مصر سے اپنی فوج نکال کر یہاں ایک آئینی بادشاہت قائم کی، جس کے دستور میں بادشاہت کے ماتحت ایک پارلیمنٹ، سیاسی پارٹیوں کی اجازت اور انتخابات ضروری قرار دیئے گئے۔ جس کے نتیجہ میں ایک ایسی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا، جس میں بادشاہت، سیاسی پارٹیاں اور برطانوی حکومت کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ تھا۔

اِس کشمکش میں دو امور بحث کا مرکز تھے۔

الف) ملکی آزادی کی حدود واضح کی جائیں۔

ب) بادشاہت اور سیاسی پارٹیوں کے اختیارات کے درمیان توازن۔ اُن دنوں وفد پارٹی کا زور تھا اور سعد زاغلول اِس پارٹی کے لیڈر تھے (سعد زاغلول ایک زمانہ میں سید جمال الدین افغانی کی مجلسوں میں حصہ لیتے رہے تھے، جس وجہ سے بہر طور سیاسی تربیت حاصل کی تھی)۔

صدر کے دوسرے عشرے میں تینوں طاقتوں (بادشاہت، سیاسی جماعتیں اور برطانیہ) کے باہمی مفادات کے تقاضوں نے اِس جمہوری نظام کو ناکام بنایا۔ جہاں بادشاہت مسلط رہنا چاہتی تھی وہاں سیاسی جماعتیں بھی اغیار کی کرپشن کا شکار تھیں، چنانچہ صدی کے تیسرے عشرے میں سیاسی جماعتوں میں کرپشن کی وجہ سے عوام اُن سے نفرت کرنے لگے۔

یہ فضا برطانیہ کے لیے سازگار تھی، برطانیہ ہی سیاسی جماعتوں کو بذریعہ کرپشن اپنا کر ملک پر خود مختاری کے نام پر اپنا تسلط قائم رکھ سکتا تھا، چنانچہ مصری اقتصادیات میں برطانیہ کے تسلط کی وجہ سے سیاست اور خارجی امور پر ملک پر بدستور برطانیہ کا قبضہ جاری رہا۔ جس وجہ سے برطانیہ مصر کی اقتصادیات، مالیات، صنعت، تجارت کے علاوہ تہذیب وتمدن پر بھی چھایا رہا۔

برطانیہ نے اپنے مفادات کی خاطر (دنیاوی مفادات کے طلبگاروں) امیر کو امیر تر اور لاکھوں غریبوں کو غریب تر بنا دیا۔ دولت کی یہ غیر مساوی تقسیم جس میں امیروں کو امیر تر بنا کر عیش وعشرت کا دلدادہ بنانا تھا، (جو پاکستان کے چند ہزار جاگیرداروں کی طرح تھا) اور برطانیہ نے یہی عمل مصر میں اپنایا، کہ یہ چند ہزار خاندان زرعی اجناس بالخصوص کپاس برآمد کر کے زیادہ سے زیادہ امیر بن کر مغربی تہذیب کو مصر پر مسلط کریں اور لکھوکھا کسانوں کو

Marfat.com

غریب سے غریب تر کریں، جن کی محنت سے یہ دولت مند بنتے ہیں۔ برطانیہ کا اِس جاگیردارانہ دولت مند طبقہ پر یہ اثر ملکی اقتصادیات کے ساتھ سیاسی آزادی پر بھی ہوا اور عوام کے اندر قومی آزادی کے جذبات کو اُبھارا۔

ویسے صدی کے پہلے عشرے میں معاشرے میں کافی تبدیلیاں آئیں، حکومت کی طرف سے صحت میں اصلاحات کے نتیجہ میں آبادی میں اضافہ ہوا، آبادی کے اِس اضافہ نے دیہاتی آبادی کو متاثر کیا، جس میں کم اراضی کے مالک لوگوں میں تقسیمِ اراضی نے خاندانوں کو متاثر کیا۔ جس وجہ سے دیہاتی آبادی کے لوگ روزگار کے لیے شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ اُدھر سے دیہاتی آبادی کی بڑی تعداد میں نقل مکانی نے شہری زندگی کو ایک عجیب صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں شہری زندگی میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ سرکاری ملازمین کا جس میں تعلیم یافتہ طبقہ، صنعتوں میں پیشہ ور اہل کاروں وغیرہ کا مڈل کلاس اور دوسرا ہر شعبہ میں مزدور غریب طبقہ لیکن اِسے مصری مسلمانوں کی بدقسمتی سے تعبیر کیا جائے، کہ امیر سے، امیر تر ہو جانے والے کہنے کو چند ہزار مصریوں نے اپنے ذاتی مفاد اور عیش و عشرت کی خاطر ع

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

تمام مصری قوم کو کس ارزاں قیمت کے ساتھ مصائب و مشکلات اور معاشرتی خرابیوں کی قیمت پر فروخت کیا۔ یورپ کی یہ سیاسی اور اقتصادی برتری اپنے ساتھ اس اُونچے معیارِ زندگی کے طبقہ میں مغربی طور طریقے اپنے ساتھ لائی، جن کا اِسلامی معاشرے کے رسوم و رواج اور دین کے ساتھ بلاواسطہ ڈائریکٹ تصادم تھا۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی تہذیب کے خلاف ''صحیح'' اسلام پر عمل پیرا ہونے کے بارے ایک موثر آواز اُٹھی تھی، اور وہ افراد جو اِس نظریہ پر یقین رکھتے تھے وہ اِس بات پر زور دیتے تھے کہ یہ گمراہ لوگ جو مغربی تہذیب کے حامی ہیں اگر توجہ سے اسلام کا مطالعہ کریں، تو یہ سمجھ پائیں گے کہ اِسلام سائنسی ایجادات اور دیگر سائنسی علوم حاصل کرنے کا مخالف نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے اپنی حق کی راہ کو چھوڑ دینا کہاں سے آ گیا؟ چنانچہ یہ مؤثر آواز جناب محمد عبدہٗ نے اُٹھائی تھی، جو آپ نے

Marfat.com

اپنے ماہنامہ ''المنار'' میں بلند کی جس میں آپ کی معاونت آپ کے مرید علامہ رشید رضا نے کی۔ جبکہ آپ ۱۹۰۵ء میں وفات پا گئے، لیکن بعد ازاں جناب رشید رضا نے ۱۹۳۵ء تک اِس رسالہ کی اشاعت جاری رکھی۔ لیکن مصر کے کٹر قدامت پسند علماء جن کا تعلق زیادہ تر ''الازہر'' سے تھا یا اولیائے کرام کی کرامات بیان کر کے مذہب سے سائنس کو خارج قرار دیتے تھے، اُنہوں نے جناب محمد عبدہٗ اور علامہ رشید رضا کے نظریات کو کہ ''اِسلام سائنسی علوم و اِیجادات میں رکاوٹ نہیں ہیں'' آگے نہ بڑھنے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ یورپ کو بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک مصری زندگی کے ہر شعبہ میں بلا رُکاوٹ بالادستی حاصل رہی۔

بیسویں کا پہلا رُبع، مصری زندگی کا معاشرتی بگاڑ

اِس صدی کے پہلے ربع نے مصری زندگی کے سیاسی اور پڑھے لکھے طبقہ میں پہلے سے کہیں زیادہ مغرب کے سیکولر اور ماڈرن نظریات کو فروغ دیا۔ چنانچہ علمی میدان میں مصری اخبارات، رسائل و جرائد، مطبوعات یورپی سیاسی اور سیکولرازم سے بھر گئے۔ قاہرہ اور اسکندریہ پر مغربی تہذیب ایسی بُری طرح سے چھا گئی کہ جگہ جگہ یورپی طرز کے ریستوران، نائٹ کلب، سینما، تھیٹروں کی بھرمار ہو گئی، اور جن کے پاس ذرا بھی مال تھا، وہ قدرے بچت کی بجائے فیشن کے طور پر فضول خرچیوں میں مبتلا ہو گئے، جس سے معاشرہ مزید مصائب کا شکار ہو گیا۔ علمی میدان میں مصری مصنّفین نے بڑے فخر سے قوم پرستی کے نام پر سیکولر اور لادینیت کے تابع تصنیفات شائع کرنا شروع کر دیں، اور اِسلام سے قبل کی مصری فرعونی تہذیب کے بلند ہونے کا جھنڈا اُٹھا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِسلام کے نام لیواؤں کو مصری معاشرے میں دوسرے اور کمتر درجہ کے لوگ سمجھا جانے لگا اور لفظ سیکولر کی بجائے لادین کہنا مناسب ہوگا، معاشرے پر حاوی ہو گئے۔ مصری معاشرے میں اِس تبدیلی نے جہاں خود ساختہ نام نہاد ''روشن خیالی'' کے لیے میدان خالی کر دیا، وہاں یہ کہنا بے سود ہے کہ یہ تبدیلی معاشرہ پر کسی اغیار کے حملہ کی وجہ سے آئی، بلکہ انہوں نے اپنی ناسمجھی اور بے وقوفی سے نمائش کے طور پر اپنایا۔ کیونکہ ان لادین اور مذہبی تعلیمات سے

Marfat.com

اپنی سستی عمل سے عاری لوگوں نے یورپی تہذیب کو برتر تسلیم کرلیا، کہ اِس میں اُن کو بلا رکاوٹ عیش وعشرت کی زندگی نظر آتی تھی۔ پھر پہلی عالم گیر جنگ کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ اور ترکیہ کو کمال اتاترک کی ۱۹۲۴ء میں مذہب کو سیاست اور دیگر امور میں علیحدہ کر دیئے تھے اِس عنصر کو ایک اور بہانہ مہیا کر دیا۔ حتیٰ کہ یہ مذہب، سائنس اور سیاست سے عاری عناصر اِس حد تک چلے گئے کہ ڈارون جیسے نام نہاد ایک اپنی لیبارٹری میں بیٹھ کرنا کام سائنسی تھیوری کی تسبیح پڑھنے لگے اور ساتھ ہی یہ تسبیح بھی پڑھنے لگے کہ ملکی ترقی میں خواتین کا باپردہ ہونا حائل ہے، اور اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے تھے، کہ اِسلامی تعلیمات پر عمل پیرا مسلمان ماضی کی باتیں ہیں، جو چند آئندہ سالوں میں دُنیا سے رُخصت ہو جائیں گے اور مصر برائے نام مسلم ممالک میں لادینیت کا مرکز ہوگا۔ اِس سے بڑھ کر اِن لادین عناصر نے عیسائی تبلیغی مشنریوں کو بھی تبلیغ عیسائیت کی کھلی چھٹی دے دی۔ جو کھل کر عوام میں اِسلام پر اعتراضات کرنے لگے، اور بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے خاتمہ تک ایسا نظر آرہا تھا کہ مغربی تہذیب مصری معاشرہ پر پوری طرح ایسی چھا جائے گی، کہ اِس ملک میں بطور مذہب اِسلام کا کوئی وجود نہ ہوگا۔

حسن البنّاؒ کی شخصیت، مشیتِ ایزدی کی زندہ تصویر:

جناب عبدہٗ جنہوں نے اپنے طور مصر میں تحریکِ احیائے اسلام کی بنا ڈالی، جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، گو ماسوائے گنتی کے چند غیر معروف افراد کو صحیح اِسلامی تعلیمات کا تابع بنا کر ۱۹۰۵ء میں دُنیا سے رُخصت ہو گئے اور ایک سال بعد ۱۹۰۶ء میں جناب حسن البنّاؒ کی پیدائش ہوئی، لیکن پیدائش کے وقت قوم پرستی کے نام پر عیش وعشرت کا دلدادہ سیکولرازم ایسی بُری طرح سے غالب آچکا تھا، جس کا تفصیلی ذکر اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ مغربی ممالک اور عالمِ اسلام میں یہ فرق ہے، کہ اول الذکر کے حکمران طبقہ نے مذہب کو خیر باد کہہ کر اپنے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کا بندوبست کر دیا ہے اور عوام کو یہ باور کرا دیا ہے کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔ حکمران طبقہ کی لادین سیاست نے اُن کی روٹی، کپڑے اور مکان کا اہتمام کر دیا ہے لہٰذا جو لوگ جو چرچ جانا چاہیں، خوشی سے جائیں، لیکن سیاست کا عمل اُن لوگوں پر چھوڑ دیں، جن کو سیاست

Marfat.com

کرنی آتی ہے۔

لیکن اِس نفس پرست مغربی حکمران طبقہ نے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا جو اہتمام کیا ہے وہ مسلم ممالک کے وسائل پر قبضہ کرنے کے بغیر ممکن نہیں۔ جو وہ اپنی مکارانہ سیاست کے بغیر کر نہیں سکتے۔ جبکہ مسلم ممالک کے عوام اپنے مذہب اِسلام کو خیر باد نہیں کہہ سکتے۔ جبکہ یہ لادین عیش وعشرت کا دلدادہ بدعنوان طبقہ ملکی وسائل پر اغیار کے قبضہ کی وجہ سے جب عوام کو مناسب طور پر روٹی کپڑا اور مکان نہیں مہیا کر سکتا، تو عوام کیسے سچے دین کو خیر باد کہہ سکتے ہیں۔

چنانچہ یہ وہ حالات تھے، کہ جو لادینیت عوام کو ماڈرن ازم کا سبق دے کر عوام کو روٹی کپڑا اور مکان سے محروم کرنے کے ساتھ مذہب کو بھی روانہ رکھنا چاہتی تھی، کیسے ممکن تھا کہ یہ دونوں محرومیاں لوگ برداشت کر سکیں۔ اغیار کے اپنے مکارانہ خود غرض مفادات کی وجہ سے قومی لادین سیاست کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ اول الذکر کا اہتمام کر سکے، لہٰذا عوام ایسی دینی لیڈر شپ کے طلبگار تھے جو اغیار کے تسلط اور عیش وعشرت کی دلدادہ لادین سیاست دونوں کو رخصت کر سکے۔ اِن دونوں کو خصوصی مشیت ایزدی سے جناب حسن البنّاؒ شہید نے چیلنج کیا۔

آپ ۱۹۰۶ء میں دریائے نیل کے کنارے محمودیہ نام کی ایک بستی میں ایک دینی گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد دین کے دلدادہ ہونے کے ساتھ بستی میں گھڑی ساز تھے۔ آپ کے والد نے چونکہ دینی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ لہٰذا بیٹے حسن البنّاؒ نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ گھڑی سازی کا کام بھی سیکھا۔ بارہ سال کی عمر میں، البتہ آپ نے حصولِ علم کی خاطر گورنمنٹ پرائمری سکول میں داخلہ لیا اور اِس کے ساتھ ہی ایک دینی جماعت ''تعمیر اخلاق سوسائٹی'' کی رُکنیت اختیار کرتے ہوئے عوام میں گھل مل کر اُن کو اخلاقی برائیوں سے بچانے کا کام شروع کیا۔ اِس سوسائٹی کا کام سختی سے اسلامی احکامات کی پابندی تھی اور کسی حکم مثلاً نماز کی قضا کی شکل میں ''جرمانہ'' کیا جا سکتا تھا، جرمانہ کی بھی عدم ادائیگی حکم کی نوعیت سے مختلف تھی۔ بعدازاں آپ نے ایک اور سوسائٹی ''مانع حرام'' شمولیت اختیار کی۔ اِس سوسائٹی کے منشور میں اِسلامی رسوم اور احکامات کی تعمیل میں زیادہ شدت تھی، حتیٰ

Marfat.com

کہ یہ سوسائٹی آبادی کے اُن افراد کو جو بعض حرام کاموں پر عمل کرتے تھے، اُن سے باز آنے کے لیے اُن کو تہدیدآمیز خطوط بھی ارسال کیے جاتے تھے۔

جب آپ کی عمر تیرہ سال کی ہوئی، تو آپ صوفیائے کرام کی ایک صوفی مسلک جماعت ''حصفیہ'' Hasfiyah سے وابستہ ہوگئے۔ اِس جماعت میں سختی سے شریعت کی پابندی تھی، حتیٰ کہ سونے کی انگوٹھی کا استعمال بھی جائز نہیں تھا۔ اِس مسلک میں خواتین کے لباس میں بھی سادگی تھی، جبکہ بزرگوں کے مزارات پر جا کر غیر شرعی رسوم ممنوع تھیں۔ جناب البناؒ نے اِس سوسائٹی کا جو ایک خیراتی ادارہ کے طور پر قائم کی گئی تھی، بطور سکریٹری اِس کی ذمہ داری سنبھالی۔ جس کا مقصد عوامی اخلاق کی اصلاح کے ساتھ یورپ کی عیسائی مشنریوں کی راہ روکنا تھا، جو یتیموں کی مدد کے نام پر مصری بچوں کو عیسائی بنانے کا کام کر رہی تھیں۔ بطور جوان آپ نے اپنے اردگرد کے لوگوں کو اپنے جذبات اور اثرات سے کام لے کر شرعی احکامات کا پابند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اِس سلسلے میں کہیں آپ نے خود جماعتیں قائم کیں اور کہیں اُن جماعتوں کا ساتھ دیا، جہاں پہلے سے کوئی جماعت کا کام کر رہی تھی۔

''اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر خداداد لیڈرشپ کی خوبیوں سے نوازا تھا۔''

ایک صوفی سلسلہ کے مسلک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے قدرت نے آپ کے اندر ایک مرشد اور اُس کے مرید کے رشتے کی وجہ سے ایک لیڈر کی اہمیت وضع کر دی، کہ ایک لیڈر کن خصوصیات کا حامل ہو۔ اِس اہمیت کا ذکر آپ نے اپنی یادداشتوں میں ذکر کیا ہے۔

> ''میرے ایک استاد نے مجھے یہ سبق پڑھایا وہ کیا رُوحانی اور جذباتی پابندیاں ہونی ضروری ہیں، جن کے نتیجہ میں استاد اور شاگرد کے درمیان رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔''

آپ نے زندگی بھر صوفیانہ زندگی گزاری اور اِس بات کا خاص لحاظ رکھا کہ اِس میں کسی ''بدعت'' کا دخل نہ ہو اور نہ ایسی سنی سنائی باتوں کا جن میں اولیائے کرام کی کسی کرامات کو مذہب

Marfat.com

اور دین کا حصہ بنا دیا جائے۔ آپ نے سلسلہ تصوف کی کبھی مخالفت نہیں کی، لیکن جو لوگ تصوف کے نام پر شرعی احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور اِس طرح اپنی دکان چمکاتے ہیں، اِس کی ہمیشہ مذمت کی، اور جن لوگوں نے ایسی تحریریں عمل میں لائی ہیں۔ اُن کو اِن کتابوں سے نکالنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔

آپ اپنی آبائی بستی میں ۱۷ سال کے ہوئے تھے کہ ۱۹۲۳ء میں آپ اپنا گھر چھوڑ کر قاہرہ چلے آئے اور ''ٹیچرس ٹریننگ کالج'' ''دار العلوم'' میں داخلہ لے لیا۔

دار العلوم میں داخلہ کے بعد آپ نے اپنا پانچ سالہ عرصہ تعلیم گزارا، جو ۱۹۲۷ء میں ختم ہوا۔ جیسا کہ آپ نے شروع سے اپنی زندگی کو براہِ تصوف سادہ زندگی کو اپنا شعار بنا لیا تھا، لیکن نوعمری کی یہ زندگی غیر معمولی انداز میں انتہائی سنجیدگی کا مرقع تھی، کہ اِس عمر کے بچے عموماً غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن قاہرہ کے ''دار العلوم'' میں ۱۷ تا ۲۲ سال عمر تک آپ نے بڑی سنجیدگی سے مصری معاشرے اور سیاست کا مطالعہ کیا، جو اِس عمر کے بچوں میں غیر معمولی کہا جا سکتا ہے اور اسے مشیتِ ایزدی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا، کہ مصر کی سیاسی زندگی میں دو متضاد عوامل کارفرما ہیں۔ ایک عمل وہ اور جس کو برتری حاصل ہے، یہ ہے، وہ مصر کا ہر پہلو میں مغربی تہذیب اور راگ و رنگ کا اپنانا جس میں الحاد اور غیر اخلاقیات ہیں۔ بیشتر دین سے محبت رکھنے والے لوگوں کی طرح آپ نے ترکیہ میں کمال اتاترک جیسے بے دین شخص کا اقتدار میں آنا، دین کے لیے ایک بڑا خطرہ قرار دیا۔ اِسی دوران آپ کے علم میں آیا کہ ۱۹۲۵ء میں ایک ''ریاستی سیکولر یونیورسٹی'' کے قیام کی تحریک جاری ہے۔ جو ترکی کے طرز پر اِسلام کو مصر سے نکال دینے کا علمی مرکز ہوگی۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ ایسے اخبارات اور مطبوعات کی اشاعت جن میں لادینی افکار کی بھرمار ہے، نوجوان ذہنوں میں بڑی مقبولیت پا رہے ہیں۔ تاہم ''دار العلوم الازہر'' ''لا'' کالج اور سلفیہ لائبریری میں آپ کو چند ہم خیال طلبہ مل گئے، جن میں طلباء کے علاوہ ''الازہر'' کے سکالر، شیخ یوسف الدجوی قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے اِس سے قبل ''احیائے اسلام'' کی ایک سوسائٹی قائم کی تھی۔ جس کا حسن البنّاؒ نے اپنی یادداشتوں میں ذکر کیا ہے، اِس حوالہ کے ساتھ کہ

Marfat.com

یہ سوسائٹی ناکام ہوگئی، کہ ''الازہر'' نے اِس اعتراف کے ساتھ مقصد نیک ہے لیکن مغربی تہذیب کا جو طوفان اُٹھا ہے، اِس کا مقابلہ ممکن نہیں۔ جبکہ شیخ دِجوی جب جناب البنّاؒ سے متعارف ہوئے تو آپ نے مؤخر الذکر سے کہا کہ ہر صاحب ایمان انفرادی طور پر جو کچھ کر سکتا ہے دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مصر کو شر سے بچائے، بلکہ کسی اِسلامی انقلاب کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ جبکہ جناب حسن البنّاؒ نے شیخ دِجوی کی اِس فکر کو رد کر دیا اور اُن پر زور دیا کہ مصری مسلم عوام کو طاقت خیال کر کے اپنے ہمراہ لیا جائے۔ اس پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے کہ دینی مزاج کی لیڈرشپ کے تحت ''احیائے اسلام'' کی وہ سوسائٹیاں قائم کی جائیں، جو بے غرض مصری نوجوانوں کے ضمیر کی آواز ہوں۔ آپ کی اِس مثبت فکر کا جواب آپ کو مصر کی بجائے شام کے معروف سکالر جناب محی الدین الخطیب کی طرف سے موصول ہوا۔ جنہوں نے ایک طرف حصولِ علم کے متلاشیوں کے لیے ''سلفیہ'' لائبریری قائم کی تھی، دوسری طرف ایک ہفت روزہ رسالہ ''الفتح'' شائع کر رہے تھے۔ جس میں معاشرے میں اِسلامی اصلاحات پر زور تھا۔ مزید برآں ''ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن'' نام سے ایک جماعت بھی قائم کی تھی۔ یہ جماعت ۱۹۲۷ء میں جناب الخطیب سے تعارف سے قبل قائم ہوئی تھی، لیکن اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جناب حسن البنّاؒ کے لیے کسی بڑے پیمانے پر ''تحریکِ احیائے اسلام'' کے لیے فضا سازگار ہوگئی تھی۔

جناب الخطیب کی ''ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن'' YAMMA عوام میں قرآنِ کریم کے مطابق معاشرے کی تشکیل چاہتی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا، کہ عوام اپنی زندگیوں میں اِسلام اپنائیں، جس کے نتیجہ میں معاشرے میں ایک استحکام عمل میں آئے، اور سائنس کے علم سمیت دیگر علوم کا حصول بھی جگہ پائے۔ اس ایجنڈا پر عمل کرنے کے لیے YAMMA نے قرآن کی تعلیم کے مدرسات قائم کیے، جن میں حضورِ اکرم کی حیاتِ طیبہ اور دیگر روایات کا حصول لازمی مضمون تھا۔ مزید برآں اپنی زندگیاں اِسلامی قوانین کے مطابق اپنانے کے علاوہ شراب نوشی، جُوا اور حرامکاری بڑی سختی سے ممنوع تھیں۔ یہ سوسائٹی مغربی تہذیب کی ٹانگیں پھیلانے کی روادار نہ تھی، بالخصوص عیاشانہ زندگی اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغ اور مدارس کے کھولنے کی۔ خواتین میں

Marfat.com

سادہ لباس کا پہننا اور تعطیلاتِ موسمِ گرما میں سیر گاہوں میں مرد وزن کے بلا کسی رکاوٹ اختلاط کے خلاف تھی۔ المختصر یہ سوسائٹی اپنے طور "خلافتِ راشدہ" کے دور کا احیاء چاہتی تھی۔ جو بعدازاں حسن البنّاؒ کی جماعت "الاخوان المسلمون" کا ایجنڈا بن گئیں۔

حسن البنّاؒ سے تعلق کے بعد الخطیب کی سوسائٹی YMMA نے سوسائٹی کی تنظیم اور سرگرمیوں میں کچھ تبدیلیاں عمل میں لائیں۔ سوسائٹی کے اندرونی معاملات کے لیے کچھ قواعد و ضوابط عمل میں لائے گئے۔ بارہ اراکین کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کی اسمبلی کا انتخاب سوسائٹی کے ممبران بذریعہ الیکشن ہوں گے۔ اپنے نظریات کی اشاعت کیلئے سوسائٹی مصر، فلسطین، شام اور عراق کے شہروں میں اپنی شاخیں قائم کرے گی اور اِس کے ساتھ ہفت روزہ اور ماہانہ رسائل بھی شائع کرے گی۔ سکولوں میں مسلم بوائز سکاؤٹ ایسوسی ایشنیں قائم کرے گی، جس میں بچوں میں جسمانی صحت اور طاقت کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لینے کا بھی التزام بھی کیا جائے گا۔ اقتصادی ترقی کے لیے سُود سے پاک صنعتکاروں کے تعاون سے بنک اور کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی جائیں گی۔ YMMA کی یہ سرگرمیاں صدی کے دوسرے عشرے کے خاتمہ یعنی ۱۹۳۰ء سے قبل سب رضاکارانہ طور پر عمل میں لائی گئیں، اور اِس سوسائٹی کی اِن بنیادوں اور سوسائٹی کے ممبران کی بنیادوں پر جناب حسن البنّاؒ کو "اخوان المسلمون" کا قیام آسان بنا دیا۔

قاہرہ میں "دارالعلوم" میں ٹیچرز ٹریننگ کے بعد جناب حسن البنّاؒ نے ۱۹۲۷ء میں نصابی اساتذہ تعلیم اور صوفی مُرشدوں کے درمیان تقابلی تربیت پر ایک مضمون تحریر میں لایا۔ اِس بارے میں جہاں آپ نے صوفی مرشدوں کی اپنے مریدوں کی سنجیدہ سوچ، نظم و ڈسپلن اور نیک مقصد سے لگن کی تعریف کی وہاں اُن کا معاشرے سے اپنے آپ کو اجنبی کرنا نیکی کے اثرات کو محدود کرنے کا باعث قرار دیا۔ اُس کے مقابلہ میں اساتذہ سکول جن کا معاشرے سے روزمرہ کا تعلق ہے۔ وہ معاشرے پر تعلیمی نظام کے ذریعہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اِس لحاظ سے اِن اساتذہ سکول کو صوفی شیوخ پر برتری حاصل ہے اور اِسکے نتیجہ میں معاشرے مسلمان نوجوانوں پر اثر انداز ہو کر اُن کو اِسلامی تعلیمات سے گمراہ کرنے اور مغربی تہذیب کے اثرات پھیلاتے ہیں۔ موخرالذکر

Marfat.com

کا مقابلہ کرنے کیلئے آپ نے اعلان کیا، کہ وہ اپنے زیر اثر اساتذہ کے ذریعہ ان میں بچوں میں صحیح اسلامی تعلیمات کو فروغ دینگے اور رات کو کلاسیں لے کر لیکچر اور تبلیغ دین کریں گے۔

آپ کے اِس آرٹیکل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو کس انداز سے ایک سکول ٹیچر ہونے کے ساتھ سلسلہ تصوف کے ساتھ منسلک ہو کر معاشرے میں ایک انقلابی انداز اپنایا۔ آپ نے اپنے اس انتخاب کا محور دونوں باتوں کو اتحاد کی شکل دے دی۔ اِس کے بعد آپ نے اگرچہ تصوف کے اِس ڈھانچہ سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن ''اخوان المسلمون'' کے اراکین میں تصوف کے چیدہ چیدہ عناصر اپنانے میں ایک منشور بھی شامل کیا۔ جو یہ تھے:

۱۔ متابعتِ شیخ

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاصی قلبی لگاؤ

۳۔ پورے خلوص کے ساتھ دینی فرائض پر عمل

اگرچہ آپ نے اہلِ تصوف کی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ فرد کا اپنے طور تعلق سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ اس کی جگہ ایک تنظیمی ڈھانچہ کی راہ دریافت کی۔

۱۹۲۷ء میں آپ ''دار العلوم'' سے باقاعدہ فارغ التحصیل ہوئے اور اِس کے فوراً بعد وزارتِ تعلیم نے آپ کو نہر سویز کے کنارے ''اسماعیلیہ'' قصبہ کے پرائمری سکول میں عربی زبان کا ٹیچر مقرر کر دیا۔ جہاں نہر سویز کمپنی کے مرکزی دفاتر بھی تھے۔ جہاں اِس مغربی کمپنی کا قبضہ واضح تھا اور کمپنی کے اعلیٰ ملازمین کے رہائشی بنگلے، اُن کی عیش وعشرت کی زندگی اور اُس کے سامان اُن کی برتری کا ثبوت تھے، جبکہ مصری ملازمین کی مفلسانہ حیثیت نمایاں تھی۔ کمپنی اسماعیلیہ کو پانی کی بہم رسانی، قصبہ کی آبادی کی صحت وصفائی کی ذمہ دار تھی، لیکن اِس کے ساتھ برطانوی فوج کا ایک بڑا دستہ بھی مصر پر برطانوی حکمرانی کی شہادت تھا۔

حسن البناؒ چاہتے تھے کہ سکول ٹیچر کی ملازمت کے ساتھ آبادی کو اِسلام کی اصلاحی تعلیمات سے شناسا کیا جائے اِس نیت کے ساتھ کہ آبادی میں جو مذہبی گروہ بندیاں ہیں، اپنے آپ کو کسی ایک گروہ کا فرد نہ سمجھا جائے۔ اِس وجہ سے آپ نے مساجد میں جا کر دعوت سے گریز

Marfat.com

گیا، بلکہ اس کی جگہ قصبہ کے تین کافی ہاؤسوں کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا، جہاں وہ باقاعدگی سے جاتے اور خطاب کرتے۔ آپ کا یہ مضمون آپ کے لیے یہ راہ متعین کرتا ہے کہ آپ بطور ایک سکول ماسٹر اور راہِ تصوف کے ایک صوفی بیک وقت دونوں راہوں کو اپنا کر عوام میں اسلامی شعور بیدار کریں، جس کے نتیجہ میں اسلام لوگوں کے دلوں کی آواز بن جائے۔ یہ چیز سماجی اتحاد کا باعث ہوگی۔ جلد ہی لوگ بڑی تعداد میں آپ کی مجالس میں حاضر ہونے لگے اور اُن سے گزارش کی کہ علیحدگی میں بھی باہمی مشورے کے لیے چھوٹی مجلسوں کا اہتمام کیا جائے۔

اسماعیلیہ میں سکول ٹیچر ہوتے ہوئے آپ نے مارچ ۱۹۲۸ء میں ''اخوان المسلمون'' کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد معاشرے میں اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے ساتھ ملک میں مغربی طاقتوں کے تسلط کے خلاف جدوجہد کرنا تھی۔ چنانچہ آئندہ چار سال میں نہر سویز کی تمام بستیوں اور وادیٔ نیل کے اکثر قصبات میں اس جماعت کی جگہ جگہ شاخیں قائم کر دیں۔ چونکہ اس میں کسی ذاتی غرض اور نمود و نمائش کے بغیر اُس ملک میں خوبیِ معاشرے کی تمام خرابیاں جگہ پا چکی تھی اور مشیت ایزدی نے اپنے دین کی بقا کیلئے عالمِ اسلام کے اِس اہم ملک میں تبدیلی لانا تھا۔ آپ اِس اہم تبدیلی کے لیے چن لینا کہا جا سکتا ہے کہ خرابی کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

وزارتِ تعلیم نے آپ کی اِن سرگرمیوں کی تھوڑی اطلاع پا کر ۱۹۳۲ء میں آپ کو اسماعیلیہ سے قاہرہ تبدیل کر دیا۔ لیکن اب ''اخوان المسلمون'' کی یہ جماعت ایک محض دینی عبادات پر زور دینے والی جماعت نہ رہی تھی، بلکہ دعوتِ دین کے ساتھ ایک قومی سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اسماعیلیہ سے قاہرہ اپنی تبدیلی کے بعد آپ نے قاہرہ ہی میں ''الاخوان المسلمون'' کے دفاتر قاہرہ تبدیل کر دیئے۔ جبکہ تمام مصر میں اِس کی شاخیں قائم ہو گئیں، اور جناب البنّاؒ کی شخصیت ایک معمولی سکول ٹیچر کی بجائے ایک دینی سیاسی قومی لیڈر کی ہو گئی۔ جبکہ آئندہ مزید سالن میں آپ کا اپنا مضبوط پریس، کئی رسائل و جرائد وجود میں آنے کے ساتھ تہذیبی پروگرام بھی عمل میں آنے لگے۔

اِس کے بعد جیسے جیسے ملک میں ''اخوان'' اور خود جناب البنّاؒ کے اثرات نفوذ پذیر

Marfat.com

ہونے لگے ویسے ملکی سیاست کو بھی آپ نے اپنے دائرہ کار میں شامل کر لیا۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں شاہِ مصر، وزیر اعظم مصر اور دیگر عرب ممالک کے حکمرانوں کے نام ایک خط شائع کیا، کہ وہ اپنے غیر اسلامی طور اطوار بدل کر اپنے اپنے ممالک کو اسلامی رنگ میں ڈھالیں۔ ۱۹۳۸ء میں شاہ فاروق شاہِ مصر سے آپ نے ذاتی ملاقات کی اور اُس پر زور دیا کہ وہ تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دیں کہ یہ سب دوسری اغیار طاقتوں کی وظیفہ خوار اور ملک میں مختلف طریقوں سے انتشار کا باعث ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے کے بعد مصر میں برطانوی تسلط کے خلاف مختلف جماعتوں کی طرف سے متشددانہ تحریک کی لہر اُٹھی، جس میں ''اخوان'' نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ مزید برآں اپنے مخالفین کے خلاف وہی طریقے استعمال میں لائے، جو مخالفین اُن کے خلاف بروئے کار لا رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں ایک اخوانی کارکن نے وزیر اعظم مصر کو قتل کر دیا۔ جس کا بدلہ مصری انتظامیہ نے اِس شکل میں لیا، کہ خفیہ پولیس کے ایک اہل کار نے خود جناب حسن البناؒ کو ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کے روز شہید کر دیا۔ اِس لحاظ سے شہادت کے وقت آپ کی عمر صرف ۴۳ سال تھی۔

جناب حسن البناؒ شہیدؒ کی فکر و خیالات:

اپنے مقدمین جناب سید جمال الدین افغانیؒ اور جناب محمد عبدہٗ کی طرح آپ اِس رائے کے مالک تھے، کہ یورپی ممالک کی مسلم ممالک پر برتری کی بنیادی وجہ خود مسلمانوں کا اِسلام سے راہِ عمل پر فرار ہونا ہے۔ جس نے اُن کو کمزور اور محتاج بنا دیا ہے۔ اب مصر کو دوبارہ اپنا مقام بحال کرنے کے لیے ضروری ہے، کہ اِن غیر ملکی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مصری عوام اپنی زندگیاں قرآنِ کریم اور سنت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ڈھالیں، اور اِس کے بعد سلفِ صالحین کی پہلی نسل کا نمونہ بن کر دُنیا کو یہ سبق دیا کہ اسلام ہی انسانوں کے لیے امن و مساوات کا دین ہے۔ بالخصوص خلافتِ راشدہ کا تو وہ سنہری دور ہے کہ دُشمنانِ اسلام بھی اِس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ اِس سے بہتر دور دُنیا نے کبھی نہیں دیکھا۔ اِس کے بعد بتدریج زوال کا باعث مندرجہ ذیل امور ہیں۔

Marfat.com

الف۔ حصولِ اقتدار کے لیے باہمی کش مکش

ب۔ معمولی اختلاف رائے (جن کی کوئی حیثیت نہیں) مذہبی افتراق پھیلانا

ج۔ حکمرانوں کا عیش وعشرت کی زندگیوں میں مبتلا ہونا

د۔ تُرک اور ایرانی غیر عرب بادشاہتیں جنہوں نے کبھی (سوائے اسلامی نام) صحیح اِسلامی تعلیمات حاصل نہیں کیں۔

ر۔ سائنسی علوم کے حصول میں عدم دلچسپی

س۔ حکومتوں کی اندھی فرمانبرداری

تیرھویں صدی تک یہ تمام کمزوریاں اُمت میں جڑ پکڑ چکی تھیں کہ منگولوں اور صلیبی جنگوں نے ایک طرح سے اُمتِ مسلمہ کی کمر توڑ دی۔ اِس کے بعد مشرقِ وسطیٰ نے خاندانِ مملوک اور خلافتِ عثمانیہ کے حکمرانوں نے ایک بار اُمتِ اسلام کا وقار پھر بحال کر دیا۔ لیکن اُمتِ مسلمہ، اِس کے بعد ترقی کے جن میدانوں میں قدم رکھنا ضروری تھا، اُس سے غیر متعلق رہی۔ چنانچہ یورپ نے سائنس اور سیاست میں جو ترقی کی تھی، اُمتِ مسلمہ کے حکمرانوں اور دانشوروں نے اِس میں غفلت برتی، جس نے یورپ کو بیسویں صدی کے آغاز تک تیونس والجزائر سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممالک پر پوری طرح غالب کر دیا۔

اُمتِ مسلمہ پر یورپی سیاست اور تہذیب وتمدن کے غلبہ کو رد کرتے ہوئے جس کی بنیادیں الحاد، بداخلاقیات، انفرادی اور اجتماعی خودغرضی اور سُود خوری پر ہیں جبکہ یورپی کلچر ایک مادی کلچر ہے اور مسلم ممالک کو اپنے سُودی قرضوں میں جکڑ کر اُن کی اقتصادیات پر قبضہ کر لیتا ہے۔ آپ نے قرار دیا کہ اولاً مصر ان برائیوں بالخصوص سُودی قرضوں سے نجات پا کر اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو۔ یورپ کے اِس سیاسی تسلط نے مصر کو شراب خوری، ناچ گانا اور خواتین کو نیم برہنگی کے لباس کی برائیوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ مزید برآں اُنہوں نے جگہ جگہ مغربی معیار کے وہ سکول قائم کیے ہیں، جن میں جوان ہونے سے پہلے شہوانی جذبات بھڑکیں۔ جو اِسلام کو ایک ناقص مذہب قرار دیں۔ بجائے اس کے کہ اِن خرابیوں کی وجہ سے مسلمان یورپین تہذیب وتمدن

Marfat.com

کو اپنے حق میں نقصان خیال کریں، خود مسلمان اسلام کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ غلط فہمی کا شکار مسلمان یہ خیال کرتے کہ اسلام صرف چند عبادات، چند اخلاق اور زندگی میں چند روحانی پہلوؤں کا مذہب ہے۔ حسن البنّاؒ نے اِن ناقص خیالات کا ملزم ''الازہر'' کے علماء کو گردانا، جنہوں نے مسلم عوام کو اِس کیفیت سے دوچار کیا، جس میں عملی قدم کی بجائے یاس و قنوطیت ہے، اور دین کی غلط تدبیر کرتے ہیں اور ماضی کے اُس دور کی داستانیں دُہراتے ہیں، جب مسلمان زوال کا شکار ہوئے۔

جناب البنّاؒ کے نزدیک اِن تمام سیاسی، اقتصادی اور تہذیب و ارتقا کا واحد حل صرف اور صرف اِسلام کی طرف دوبارہ لوٹنا تھا، جو انسان کی بقا کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ آپ کا یقین تھا کہ اِسلام بطور مذہب کامل دینِ اسلام کا ایک حصہ ہے (اِس کا یہ مطلب ہوا کہ مذہب اور کامل دین اسلام میں بڑا فرق ہے، چنانچہ قرآن میں مذہب کی بجائے اِسلام کے لیے جگہ جگہ لفظ ''دین'' استعمال کیا گیا ہے) اور دین روزمرہ کی انسانی زندگی کے پہلوؤں پر گہری نظر رکھنے کا نام ہے۔ اگرچہ آمدِ اسلام کو چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ اِس کے اصولوں میں ایسی لچک ہے، جو بغیر تمیز وقت و مقام ہمہ وقت اپنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ فی الحقیقت اِسلام ہی ایک ایسا دین ہے، جو انسانوں کو خوشحالی اور مساوی درجہ دیتا ہے۔ اور تمام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، لہٰذا نہ صرف اپنے طور سے مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ خود اِس دین کی اقدار اپنی زندگیوں میں اپنائیں، بلکہ اُن پر عمل پیرا ہو کر تمام دُنیا میں اُن کو پھیلائیں تاکہ اِس کی خوبیوں کی وجہ سے تمام دُنیا اِسلام قبول کرے۔

جناب حسن البنّاؒ کے نزدیک اِسلام کا فہم و شعور اِس امر کا متقاضی ہے کہ مسلمان قرآن و سنت کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہوں، اور ہر حالت میں اِسلامی اصولوں کی تعلیم ہر با اعتماد ذریعے سے حاصل کریں۔ مسلمان خود بھی قرآنِ کریم کا پوری سُوجھ بُوجھ کے ساتھ مطالعہ کریں۔ تاکہ اُن کا عمل بلاواسطہ خود قرآن فہمی کی بِنا پر نہ کہ بزعمِ خود ایک نمائشی عالم کی تابعداری، آپ نے تسلیم کیا کہ بعض معمولی امور پر اختلافات قدرتی امر ہے، لیکن اِن اختلافات کو دُشمن بن جانے کی

Marfat.com

شکل نہ دی جائے۔ اختلافات کو کم سے کم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بے سود بحث مباحثہ سے دُور رہا جائے اور آپس میں ایسے باہمی سوالات نہ اُٹھائے جائیں، جن کی کوئی عملی حیثیت نہ ہو۔

جناب البناؒ کا صحیح معنوں میں اسلام اپنانے کے بارے میں یہ مطالبہ تھا، کہ اُن کے اپنے دور میں مسلمان عوام وخواص میں جو خرابیاں جگہ پا گئی ہیں، اُن کو عملاً کیسے دُور کیا جائے۔ مسلمان اپنی عبادات کو قرآن وسنت کے رنگ میں ڈھالیں، لیکن فضول قسم کی تجاویز، نمود ونمائش، سستی وکاہلی اور نجومیوں کی قسمت وبدقسمتی کی پیش گوئیوں سے دُور رہیں۔ المختصر دین میں جو بدعتیں جن سے عمل کو نقصان پہنچا ہے، اُن کو اپنی زندگی سے خارج کیا جائے۔ آپ کا اِس سے انکار نہیں تھا کہ جن بزرگانِ دین اور اولیائے کرامؒ نے نیک کام کیے ہیں اور اُن میں بعض سے کرامات کا ظہور ہوا ہے، اُن کا عزت واحترام نہ کیا جائے، البتہ اِس کے ساتھ یہ یقین تھا کہ اُن کی یہ کرامات اپنے طور یہ قدرت نہ رکھتی تھیں کہ کسی کو فائدہ یا تکلیف پہنچا سکتیں۔ اِسی طرح آپ کو اکابرین کی قبور کی زیارت سے انکار نہیں تھا۔ لیکن، ہمارے ہاں اِن قبور پر ''چڑھاوے'' کی شکل میں جو بدعتیں پیدا ہو گئی ہیں، اُنہیں ممنوع قرار دیتے تھے۔ مثلاً قبور پر ''روشنیاں'' کرنا وغیرہ وغیرہ۔

کون شخص ''مومن'' کہلانے کا دعویدار ہے؟ آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھنا، نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے نبی آخر الزمان ہونے پر ایمان رکھنا اِن دو باتوں پر ایمان رکھنے کے ساتھ جو شخص دینی عبادات پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہ مسلمان ہے۔ البتہ جو شخص کھلے بندوں اِن کا انکار کرتا ہے اور اُن اعمال کا عقیدتاً انکار کرتا ہے، جن کا قرآن وسنت نے حکم دیا ہے، اور مسلمان عموماً ان پر عمل پیرا ہیں، یا قرآنِ کریم کے واضح حکموں کی غلط تعبیر کرتا ہے یا غلط معنیٰ کرتا ہے، ایسا شخص مسلمانوں میں ہوتے ہوئے کھلے معنوں میں مرتد ہے۔

اِس جذباتی قسم کے سوال پر کہ ''اللہ تعالیٰ کون ہے؟'' کہ ''اپنی ذات وہ واحد جس نے تمام کائنات پیدا کی، جبکہ تمام دیگر اُسی کی مخلوق ہیں اور اُس کا کوئی مثیل نہیں اور قرآنِ کریم کی کسی آیت کی کوئی ایسی تفسیر نہ کی جائے، کہ کوئی شخص اُس کو شفاعت کر سکتا ہے۔''

آپ نے بطور ایک ریفارمر اِس امر پر زور دیا، کہ اِسلام دُنیاوی معاملات میں عملاً

Marfat.com

حصہ لینے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جس میں قدرت کی سائنسی تحقیقات جس میں ٹیکنالوجی سائنس شامل ہیں۔ اسلام کا سائنسی تحقیقات اور ایجادات سے کوئی تصادم نہیں۔ مذہب اور سائنس دونوں اپنے اپنے دائرہ میں دو شعبہ جات ہیں اور دونوں کو باہمی طور پر مل جل کر کام کرنا ہے، یہ نہیں کہ سائنس کی خاطر دین کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ یہ فکر انیسویں صدی کی ریفارمسٹ فکر تھی۔

مذہب اور سیاست کے بارے میں آپ کی تحریریں اسلام کے ابتدائی دور کی مظہر ہیں۔ جن کے بارے میں کچھ مستقل اصول رکھے ہیں، لیکن سیاست کو مذہب سے علیحدہ نہیں کیا۔ ایسے دور میں جب آئینی حکومت، پارلیمنٹ، انتخابات کا پرچار بڑے زوروں پر تھا، اور جنہیں سیاست زدگان مصری روشن خیالیوں کی بڑی تائید حاصل تھی، جناب حسن البناؒ نے انہیں اسلامی اصولوں پر عملدرآمد پر زور دیا۔ آپ نے ایک آرٹیکل شائع کیا، کہ انتخابات کے ذریعہ ذمہ داریاں سنبھالنے والی حکومت ملک میں بے چینی اور انتشار پھیلانے والی نہ ہو۔ بلکہ انتخابات کے بغیر یا انتخابات کے نتیجہ میں جو بھی حکومت قائم ہو، وہ ان تین اصولوں کی پابند ہو۔

۱) حکمران اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور عوام کے سامنے اپنے جوابدہ سمجھے، کیونکہ وہ عوام کا خادم ہے نہ کہ (مغرور) حکمران۔

۲) اُمتِ مسلمہ ایک متحد قوم کے طور پر عمل کرے کیونکہ مسلمانوں میں باہمی اُخوت اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

۳) اُمتِ مسلمہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکمران کی غلطی کی گرفت کرے۔ اُسے غلطی کو دُرست کرنے کے لیے صحیح مشورہ دے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ حکمران اس مشورے کا احترام کرتے ہوئے اُس پر عمل کرے۔ کیونکہ یہ اصول وسیع الحکمت ہیں۔ چنانچہ ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے خواہ وہ آئینی پارلیمنٹری جمہوریت کے نام سے ہو، اسلامی مملکت کے لیے ہر طرح کی شکلیں ان اصولوں کی ماتحتی میں ہیں۔ ان اصولوں پر بتدریج عمل کرتے ہوئے آپ نے بالآخر "احیائے خلافت" کو ضروری سمجھا اور یہ مقصد ظاہر

Marfat.com

کیا، کہ اگر مسلم ممالک اپنی اپنی جگہ اپنے ممالک کو اِن اصولوں کے تابع اپنی حکومتیں قائم کرلیں، تو بعدازاں باہمی معاہدوں اور اتحادوں کے نتیجہ میں ایک موثر اسلامک لیگ آف نیشنز ظہور میں آسکتی ہے۔

آپ ۱۹۲۳ء کے مصری آئین کی حمایت میں تھے، کیونکہ اِس آئین کی اہم شق یہ تھی، کہ تمام قانون سازی اِسلامی اصولوں کے مطابق ہوگی۔ اِس حمایت میں وہ اِس حد تک تھے، کہ آئینی حکومت اِسلامی حکومت کے موجودہ سیاسی نظام کے نزدیک تھی۔ آئین میں انفرادی حقِ آزادی بھی ایک عمدہ آئینی ضمانت تھی۔ آئین میں مشورے کی شق اور حکمران کی عوام کے سامنے جوابدہی بھی تھی۔ لیکن اِس کے برعکس اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے نظرثانی کے ساتھ بعض ترامیم بھی ضروری ہیں۔ جن میں بنیادی نقص آئین کے ماتحت قوانین اِسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جس وجہ سے ایک اِسلامی ملک میں اِس آئین کو آئین کا نام دیا جانا ہی غلط تھا۔ مثال کے طور پر اِس آئین میں اِسلامی قوانین کو ایک طرف کرتے ہوئے شراب، حرام کاری، جُوا اور سٹہ بازی اور سُود خوری وغیرہ کی کھلی اجازت تھی۔ اِن اخلاقی اقدار سے ہٹ کر آپ اُن قوانین پر بھی معترض تھے، جن میں اقتصادیات اور تجارت میں بھی اغیار کے قوانین کو بھی اپنایا گیا تھا، حالانکہ اِسلام اِس بارے میں پوری رہنمائی کرتا ہے۔

اِسلام کے مطابق پارلیمنٹری جمہوریت کو تسلیم کرتے ہوئے آپ نے ریاست میں کثیر الجماعتی نظام مسترد کیا۔ آپ نے تسلیم کیا، کہ پارلیمانی جمہوریت میں ایک، دو یا اِس سے زائد جماعتوں کا ہونا جمہوریت کا حصہ ہے، لیکن مصر میں یہ تجربہ ناکام نظر آتا ہے، کیونکہ اِس نظام نے ملک کو اتحاد کی بجائے تفرقہ بازی کی لعنت میں مبتلا کیا ہے۔ اِس تفرقہ بازی کی بنیادی وجوہات ملک کی معروف شخصیات کے درمیان واقتدار پرستی کی خاطر، ذاتی اختلافات ہیں، جسے ذرا بھی مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا، لہٰذا ملک کی سلامتی کی خاطر تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جائے، اور ایک ایسی واحد سیاسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے جو ملک کی آزادی اور خودمختاری کو یقینی بناتے ہوئے اندرونِ ملک اصلاحات کرے۔

Marfat.com

اگرچہ انتخابات قوم کی خواہشات کا مظہر ہوتے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے، کہ رائے دہندگی نظام میں کچھ اصطلاحات کی جائیں۔ ۱۹۲۳ء کے آئین کے تحت انتخابات اور بعدازاں ۱۹۳۰ء میں دومرحلہ انتخابات قوم کے حق میں بُری طرح ناکام ہوئے، کیونکہ اِن کے نتیجہ میں جن افراد نے حکومت سازی کی، وہ انتہائی غیر مقبول تھے۔ جن پر قابو پانے کے لیے جناب البنّاؒ نے اِس کا یہ علاج تجویز کیا، کہ ایسے قوانینِ انتخابات عمل میں لائے جائیں، کہ منتخب افراد حکومت چلانے کے اہل ہوں، اور الیکشن کے لیے ایسے اشخاص اُمیدوار ہوں، جن کو مذہبی امور اور عوامی معاملات پر عبور ہو۔ معاشرہ میں ''مقبول'' ہوں، نہ کہ قبائل، خاندانوں اور تنظیموں کے سربراہ ہوں۔ مزید برآں جو الیکشن مہم ہو، اس میں ایک دوسرے کی ذات پر حملے نہ کیے جائیں۔

آپ کا دور مصری تاریخ کا وہ دور ہے، کہ مصر اسلام سے کہیں دُور جا چکا تھا اور دُور دُور تک بطور دینِ اسلام کے اُبھرنے کے نشان نہ تھے، جبکہ یہ ملک ہی عالمِ اسلام کے قلب میں اُس وقت واحد اِسلامی ملک تھا کہ یہاں ایسی شخصیت اُبھرے، جو اغیار کے لیے تحریک کی شکل میں ایک مؤثر چیلنج ہو، اگرچہ جناب محمد عبدہٗ کی شخصیت نظرانداز نہیں کی جا سکتی، جن کا کام پیشتر ازیں بیان ہو چکا ہے، لیکن ضرورت اِس سے کہیں زیادہ مؤثر شخصیت کی تھی، کہ مشیت ایزدی نے جناب حسن البنّاؒ کو اِس دور کے لیے پیدا کیا اور آپ نے حکومت سے کسی تصادم کے بغیر اپنے نظریات کو عوام میں مقبول بنانے پر توجہ دی۔ اپنے نظریات کو ایک خصوصی شکل دینے سے احتراز کرتے ہوئے آپ نے وقتاً فوقتاً مختلف انداز اپنایا۔ ایک موقعہ پر آپ نے تحریر کیا، کہ ایک حکومت اُس وقت تک اِسلامی ہے، جب تک اُس کے ارا کین پابند ارا کینِ اسلام ہوں اور اِسلامی احکامات کے نافذ کرنے والے ہوں۔ اِسلامی حکومت کے فرائض میں:

۱) لوگوں کے جان و مال کا تحفظ

۲) نفاذِ قانون

۳) اشاعتِ تعلیم

۴) عوامی بہبود کو ترقی دینا

Marfat.com

۵) عوام کے اخلاق کو مضبوط بنانا

۶) اغیار سے قوم کا دفاع

۷) اشاعتِ اسلام

شامل ہیں۔ جب کوئی حکومت اِن فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام ہو جاتی ہے تو عوام کو چاہیے کہ وہ حکومت کو مناسب مشورہ دے کر اُسے عمل کا قائل کریں۔ اگر یہ امر بھی نتیجہ خیز نہ ہو تو عوام کو چاہیے، ایسی حکومت سے نجات پائیں کیونکہ مسلم عوام پر ایسی حکومت کی تابعداری لازم نہیں، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمان ہو۔ یہ تبدیلی کیونکر عمل میں لائی جائے، اِس بارے میں آپ نے کوئی عندیہ نہیں دیا۔

گو آپ بہر صورت مصر میں ایک اِسلامی حکومت کے سب سے زبردست داعی تھے، جبکہ ایک اسلامی حکومت کے اصول و خصائص بھی واضح کرنے میں کوئی کمی نہ روا رکھی تھی، لیکن کسی طور بھی حکومت کا تختہ اُلٹنا روا نہ رکھتے تھے، ماسوائے اِس کے کہ کیسے اُس کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے مصر کے سیاسی لیڈروں کو ایک خط کے ذریعہ دعوت دی، کہ حکومت جس غلط انداز سے عوامی تائید سے محرومیت کا شکار ہے اور عوام کو مصائب و مشکلات میں مبتلا رکھ کر اپنا نظام چلا رہی ہے، کس طرح عوام میں اِسلامی روح بیدار کر کے حکومت کو اپنی اصلاح پر مجبور کریں، اور حکومت میں سول ملازمین اپنے آپ اسلامی تعلیمات اپنا کر سادگی اختیار کریں، اور حکومت کے اہلکاروں میں مزید دینی جذبہ کو فروغ دے کر حکام ''الازہر'' کے فارغ التحصیل گریجوایٹس کو ملٹری اور سول بیوروکریسی میں مقام دیں۔

مصر کے لیے ایک اسلامی ریاست کا ہونا دینی اقدار سے دُور اُن قوم پرستوں کے لیے باعثِ تشویش تھا، جو حکومت اور عوام پر حاوی تھے۔ چنانچہ آپ نے ''اخوان'' میں حُب الوطنی اور قوم پرستی کے موضوع پر بحث کے دروازے کھولے۔ آپ نے مصر کو ایک خالص اسلامی ریاست کی شکل دینے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور مصریوں میں حُب الوطنی کے جذبہ کی بڑی تحسین کی کہ بطور مسلمان اپنے وطن کے لیے محبت بھی دین کی آزادی کا مظہر ہے۔ آپ نے ایک

Marfat.com

مرتبہ تحریر کیا، کہ اِسلام ایسے جذبات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، کہ مسلم ممالک آزاد اور طاقتور ہوں۔ باہمی اتحاد کو ترقی دیتے ہوں تاکہ اسلام ایک کامیاب دین ہو۔ ایک موقع پر جب نیشنلزم نے ماضی کی مثال دے کر اُن کی تاریخ میں شہریوں میں استحکام بیان کیا، تو آپ نے اِس کی تعریف کی۔ یہ مثالیں اجتماعی اتحاد اور ڈسپلن کی غمازی کرتی ہیں کہ عوام ایک عوامی مقصد کے لیے مل کر جدوجہد کریں۔ اِس کے برخلاف آپ نے اُس ''نیشنلزم'' کی سخت مذمت کی، جس کا مقصد قبل از اسلام غیر اسلامی کافرانہ تہذیب کا احیا اور اُس پر فخر کا مظہر تھا۔ آپ ایسے نیشنلزم کے سخت خلاف (بلکہ دُشمن) تھے، جو قبل ازیں اِسلام کفار کی تہذیب وتمدن، رسوم ورواج کو ملک میں رائج کرنا چاہتی ہو۔ جو مصر میں فرعونی دور کی، شام اور لبنان میں فونیقی کی تہذیب نیشنلزم کے نام پر پروان چڑھانا چاہتی تھیں۔ آپ نے اُس نیشنلزم کی بھی مذمت کی، جس میں ایک قوم دُوسری قوم کو بزورِ قوت اپنا ماتحت بنانا چاہتی ہو، جیسا جرمن قوم کی فاشزم نیشنلزم کے نام پر دُنیا پر غلبہ چاہتی تھی۔ جہاں آپ نے حب الوطنی اور نیشنلزم کو سراہا، وہاں آپ کا اِس بات پر بھی زور تھا، کہ اِسلام کی حکمت عملی کسی قوم کو کہیں بہتر سوشل استحکام بخشتی ہے۔

جناب البنّاؒ کو اِس امر کا احساس تھا کہ سیکولر معترضین مذہب کے بارے میں بھی یہ اعتراض کریں گے، کہ جس طرح سیاسی جماعتیں اپنے اپنے نظریات منوانا چاہتی ہیں، مذہب کا طرزِ عمل اِس سے مختلف نہ ہوگا۔ چنانچہ آپ نے تسلیم کیا، کہ اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے، جس کی وجہ سے اختلاف کرنے والوں کا اپنا اپنا علم اور اپنے متاثرین کا حلقہ ہونا ہے۔ نتیجتاً مسلمان اجتماعی طور پر ایک وحدانیت قائم کر نہ سکے اور بعض معاملات پر متحد نہ ہو سکے۔ لیکن اُن کے ایمان اور معمول میں جو بنیادی باتیں ہیں، اُن میں وہ پوری طرح متحد ہیں، اور بعض ایسی باتیں ہیں، کہ جن امور میں اختلاف ہے، اُن کو نظر انداز کرتے ہوئے بنیادی عقائد کو اپنا کر باہمی اتحاد سے ترقی کی منازل طے کریں۔

اِسلام اور سیاست کے بارے میں سابق مصلحین کی طرح آپ نے اپنے دور کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقتصادی اور سوشل موضوعات کو اِسلام کے سانچے میں ڈھالنے پر

Marfat.com

زور دیا۔ یہ موضوعات صدی کے تیسرے عشرے سے مصری معاشرے میں بحث کا موضوع بن چکے تھے، بالخصوص ٹریڈ یونینیں اور سوشلزم، ۱۹۴۱ء میں ''اخوان'' کی چھٹی کانگریس میں خاص طور پر آپ نے ملک کی ''اقتصادی بدحالی'' کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا۔ آپ نے فرمایا، کہ مصر کے چالیس لاکھ دہقانوں کے پاس ایک معمولی قطعہ اراضی نہیں، جبکہ مزید غربت کے شکار دس لاکھ دہقانوں کے پاس نصف فیضان (مصری سکہ) تک نہیں۔ جبکہ شہری آبادی کے عوام بری طرح بیروزگاری، معمولی اُجرت کے علاوہ انتہائی خطرناک حالت میں مبتلا ہیں۔ ملک کے اغیار جو ملک کی اقتصادیات پر قابض ہیں، اُن کے قبضہ میں پانی کی سپلائی، بجلی، نمک اور ٹرانسپورٹ جیسی عوامی ضروریات ہیں۔ مجموعی طور ۳۲۰ غیر ملکی کمپنیاں عوام کو ہر طرح کی سہولتوں سے محروم کر کے مصر کی دولت لوٹ کر اپنے ممالک میں لے جاتی ہیں۔ جبکہ سہولتوں کی محرومی کی وجہ سے مصر Hood wink (گنڈویا) Opthalmic، Bilharzia جیسی بیماریوں کا شکار ہے۔

مغرب کی طرف سے سوشل موضوعات پر اسلام کو جو چیلنج تھے، جناب البنّاؒ اُن سے بخوبی واقف تھے، اور اِس امر کا بھی احساس تھا، کہ عالمِ اسلام کیپٹلزم، کمیونزم اور فاشزم کے خلاف خاموشی سے جنگ کی حالت میں ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم اِن میں سے کوئی ایک نظام اپنائیں، اِس بارے میں آپ کا کہنا تھا کہ اِن میں ہر نظام میں کچھ خوبیاں اور کچھ نقائص ہیں۔ نازی ازم اپنے اندر ڈسپلن اور فرماں برداری کے خصائص رکھتا ہے، لیکن اُس کی نسل پرستی قابلِ مذمت ہے۔ اب جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے، اُس کا عالم گیر بھائی چارہ قابلِ تحسین ہے، اور طبقاتی کش مکش سے بھی آزاد ہے (اگرچہ معاشرہ میں طبقات کا ہونا ضروری ہے) لیکن الحاد اور حقِ ملکیت سے محرومی دونوں قابلِ مذمت ہیں۔ رہا سرمایہ داری (کیپٹلزم) کا معاملہ۔ یہ نظام جمہوریت اور آزادیٔ فرد کا بہانہ لے کر معاشرے میں انتشار اور بے راہ روی کی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔ یہ ہیں اِن تینوں نظاموں کی خرابیاں۔ لہٰذا اُمتِ مسلمہ کو کسی بیرونی نظام کو اپنانے کی ضرورت نہیں، کہ اِسلام ایک کامل نظام حیات ہے، جو خالقِ کائنات کا عظیم عطیہ ہے۔ چنانچہ اِسلامی ریاست کا یہ فرض ہے، کہ جو شخص کام کرنے کا اہل ہے، اُسے روزگار مہیا کرے۔ جس سے ریاست

Marfat.com

صنعتی کارکنوں اور کسانوں کی اہلیت پیداوار میں اضافہ کرے گی۔ ورکرز کے حقوق میں ملازمت کی ضمانت، مناسب معاوضہ، فی ہفتہ متعینہ اوقاتِ کار، صحت کی انشورنس دیئے جانے کے علاوہ بچوں سے محنت نہیں لی جائے گی۔ بیروزگاری کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت ملکی پیشوں ملبوسات، صابن سازی، خوشبویات، اشیائے خوردونوش کی حوصلہ افزائی کرے گی، اِس کے نتیجہ میں خواتین اور بچے ملکی صنعتی پیداوار میں حصہ لے کر گھریلو آمدن میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔ مزید برآں ریاست امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنانے کی تقسیم پر قابو پانے کا لائحہ عمل تیار کرے۔ خود مالدار لوگ بھی عیاشانہ زندگی ترک کر کے سادہ زندگی اپنائیں، یہ عمل اپنانے سے وہ معاشرے کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کریں گے، اور اُن کے خلاف نفرت دُور ہوگی۔ سرکاری اہل کار حرام ذرائع آمدنی مثلاً شراب، سُور کا گوشت اور منشیات کی فروخت سے باز آئیں۔ جبکہ ریاست قدرتی وسائل کی دریافت اور اُن کو اپنی ذریعہ آمدن بنانے پر توجہ دے۔ اِسلام میں ''زکوٰۃ'' صرف جائز ٹیکس ہے۔ جو ذخیرہ اندوزی اور افراطِ زر کو روکنے کے علاوہ غریب عوام پر کسی قسم کے ٹیکس کے بوجھ کا متحمل نہیں رکھتی۔ زکوٰۃ کی آمدنی سے مسلح افواج، غریب اور یتامیٰ مستفید ہوسکیں گے۔ متوسط طبقہ کے ملازمین کے بارے میں آپ کی تجویز تھی، کہ اُن کی تنخواہ میں مناسب اضافہ اور اعلیٰ سول ملازمین کی تنخواہوں میں مناسب کمی کی جانی چاہیے۔

اِسلام سرمایہ اور جائیداد کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، بشرطیکہ اُن کا ذریعہ حصول جائز طریقوں سے ہو، اور عمدگی سے اُن کا انتظام اور مزید ذریعہ آمدن بنایا جائے (مثلاً جائیداد کو کرایہ پر دینا) معمولی جائیداد کے مالکان کو مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں، جبکہ بڑی جائیداد کے مالکان کو ذخیرہ اندوزی جیسی لعنتوں سے روکنے کے لیے مناسب پابندیاں عائد کی جائیں۔ پرائیویٹ پراپرٹی کی مناسب حد بندی یہ ہونی چاہیے، کہ اِس سے عوامی خیر و بہبود متاثر نہ ہو۔ جہاں تک مالی اداروں کا تعلق ہے۔ اُنہیں چاہیے کہ اُن کا عمل ''سود'' کو روا نہ رکھ کر متوازن اور پاکیزہ ہو۔ اِسلامی اقتصادیات میں مسلمان سماجی بہتری کے کاموں میں خرچ کریں گے اور خیراتی اداروں میں رقومات ادا کریں گے۔ اِس اصول کو بروئے کار لانے کی خاطر ''اخوان'' ماہِ رمضان میں

Marfat.com

باقاعدگی سے خیراتی رقومات اکٹھا کرتے اور مستحقین کی مالی اور اشیائے خوردنی سے مدد کرتے۔ غربا کی تدفین کے قبرستان نہ ہونے کی وجہ سے ''اخوان'' نے قبرستان بھی بنائے اور یتیموں کی پرورش کا بھی انتظام کیا۔

اِسلامی اقتصادیات کے لحاظ سے آپ کا نظریہ ملک گیر اقتصادیات تھا۔ اس بارے میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ مصر برطانیہ کے سٹرلنگ سے تعلق ختم کر کے مصری کرنسی سونے کے ذخائر پر اپنی کرنسی کی بنا ڈالے۔ اِس طرح مصری کرنسی کا صحیح انتظام افراطِ زر کو کنٹرول میں لا کر غیر ملکی تبادلۂ زر کے ساتھ اپنے حق میں فضا پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اِس کا ملکی مفاد میں ایک پہلو یہ بھی تھا، کہ پرائیویٹ فرمیں اپنے اثاثوں کے ساتھ، ٹرانسپورٹ اور دیگر یوٹیلیٹیاں ازخود قومی بن جائیں۔ اسلامی اقتصادیات کے حق میں عملی شکل دینے کی خاطر ''اخوان'' نے

۱۔ دھاگہ ساز اور بافندگی کمپنی

۲۔ کمرشل اینڈ انجینئرنگ ورکس کمپنی

۳۔ اِسلامک پریس

قائم کیے، اگرچہ اِن اداروں نے بڑی کامیابی تو حاصل نہ کی لیکن جتنی کامیابی حاصل کی، اُس نے اُن معترضین کے منہ بند کر دیئے، کہ میدانِ عمل میں مغربی اقتصادیات اور مذہبی نظریات کوئی ہم آہنگی نہیں، لیکن ''اخوان'' کے معمولی پیمانے نے مغرب کے بڑے مادی وسائل کے مقابل ہو کر ثابت کر دیا کہ ''اقتصادی سرگرمی اور اِسلامی نظریہ'' کے درمیان کامل ہم آہنگی ہے۔

جناب حسن البنّاؒ کی نظر میں جو اسلامی ریاست کا تصور تھا، وہ فی الحقیقت اِسلام کا تہذیبی نظام تھا۔ ایک حکمران جو عوام کو اُن کی ضروری سہولتیں فراہم کرنے کے ساتھ اُن کو اخلاقی اقدار کی ضمانت دے۔ موجودہ دور کی اصلاحی تحریکوں سے کہیں درجہ اعلیٰ تھا۔ مسلم حکمرانوں نے کئی صدیاں اخلاقیات کے ساتھ لوگوں کے جان و مال کے لیے ''محتسب'' کا عہدہ قائم کیے رکھا۔ تاہم جناب حسن البنّاؒ دورِ جدید کی بعض تبدیلیوں سے اتفاق کرتے ہوئے ریاست/حکمران کو اِس امر کا ذمہ دار گردانتے تھے کہ اصلاحات کے نام پر بنیادی احکامات سے سرِ مُو انحراف نہ کیا جائے۔

Marfat.com

زنا کار کو زنا کا جُرم ثابت ہونے پر کوڑوں کی سزا دی جائے، قحبہ خانوں اور شراب پر پابندی عائد کی جائے، ناچ گھر بند کیے جائیں، لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے اُن کی جنس کے مطابق اُن کے سکول علیحدہ علیحدہ اور نصابی تعلیم بھی علیحدہ ہوگی۔ اسی طرح ریاست گانوں، فلموں، ڈراموں اور فحاشی فروغ دینے والی کتابوں کو سنسر کرنے کی پابند ہوگی۔

ریاست اِس امر کی پابند ہوگی، کہ مذہب کے نام پر معاشرے میں غیر دینی رسم و رواج فروغ پا گئے ہیں، اُن کو ختم کرے۔ مثلاً شادیوں کی تقریبات میں غیر معمولی اسراف کے ساتھ بعض فضول رسومات، سالگرہیں اور تعطیلات ختم کی جائیں۔ اسلام کی صحیح تعلیمات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے لیے پرائمری سکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک دینی ہدایات پر عمل طلباء میں لازم قرار دیا جائے۔ اِن ہدایات میں حفظ قرآن، عربی گرامر، اسلام کی تاریخ، شہریت کے مضامین از خود اخوت اسلامی کی بنیاد پر حب الوطنی اور اخلاق کی پابندی کو فروغ دیں گی۔ المختصر ریاست مصر میں مغربی اقدار سے جان چھڑا کر مصریوں کو اپنے گھروں اور گھر سے باہر کی زندگی میں دورِ اسلامی کی اقدار اپنائے (جو کوئی شرم کی بات نہیں)۔

آپ نے مصر میں یہ تمام معاملات ریاست پر نہیں چھوڑے اور نہ اُس سے بہت زیادہ اُمیدیں قائم کیں۔ چنانچہ آپ کی صوفیانہ زندگی کی ابتدا فرد کی اصلاح پر تھی۔ جس کو آپ نے ''الاخوان المسلمون'' کے ابتدائی ایجنڈے میں مقدم رکھا۔ آپ کو یہ اُمید تھی، کہ ایک مسلمان کو صحیح اسلام پر عمل پیرا بنانا ہوگا جس کے نتیجہ میں ملک میں اِسلام پر عمل پیرا شخصیات اُبھریں گی۔ نتیجتاً ایک اسلامی معاشرہ کی طرف پیش رفت ہوگی جو ریاست کو اِسلامی شکل دینے کی راہ ہموار کرے گی۔ اِس بارے میں آپ اپنے حلقہ کے لوگوں کی زندگیاں اور ذہن اِسلام میں ڈھالنے ایسی راہ جو شرعی ذہن کے تصوف اور حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مطابق ہو جس کے بارے میں ہزاروں احادیث ہیں، اور اُن کی بنیادوں پر ''سنت'' ہے۔

آپ نے اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا، کہ ایک مسلمان کیونکر اپنا ایمان مضبوط رکھ سکتا اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اِس کا بنیادی اصول ''ذکر'' پر عمل ہے۔ ''ذکر'' کا

Marfat.com

مطلب ''یادِ الٰہی'' اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ عمل جان کر اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ اُس کے مطابق بنانے کی کوشش کرنا۔ جب اپنے دل کی گہرائیوں سے اِن دو باتوں پر عمل ہو، تو ''ذکر'' ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ پوری طرح اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بن جاتا ہے جو اِسلام کی اصل رُوح ہے۔ یہ الفاظِ دیگر اپنا سر ہر انداز سے بارگاہِ الٰہی کے آگے جھکا دینا۔ جب ذکرِ الٰہی کیا جائے، نہایت آہستہ آواز میں، کہ جو الفاظ ذِکرِ الٰہی میں ادا کر رہا ہے، اُن کے معنی سمجھتا ہے۔ اگر ''ذکر'' اجتماعی طور پر کیا جا رہا ہو، تو سب مل کر اِس انداز سے ذکر کریں، کہ اُس میں یکسانیت اور یک جہتی محسوس ہوتی ہو۔ یہ افراد دورانِ فکر صاف ستھرے پن کا خاص خیال رکھیں، اور کسی طرح کی ناپاکی کو جگہ نہ دیں۔ اجتماعی ذِکر خلوص و محبت کا رشتہ مستحکم کرتا ہے۔ یہ طریقہ فالتو وقت کو قربتِ الٰہی کا ذریعہ بناتا ہے اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ تعلیم یافتہ لوگ کے ساتھ مل کر اُن میں علم و شعور پیدا کرنے کا باعث ہے۔ اِس کے برعکس اگر ''ذکر'' کسی دیگر شخص کی عبادت میں خلل ڈالتا ہے، یا اِس میں ہنسی کا جزو ہے یا مسنون دعائیں تبدیل کی جاتی ہیں، تو یہ جائز نہیں۔ اجتماعی ذکر کے بارے میں آپ کا مشورہ تھا کہ یہ ''اخوان'' کے دفاتر مین یا صبح کے اوقات میں کام پر جانے سے قبل یا شام کو کام سے آنے کے بعد ہو۔

''ذکر'' کی ایک بڑی خوبی یہ ہے، کہ ایک مسلمان روزانہ قرآنِ پاک کا کچھ حصہ تلاوت کرنے سے جو فیض حاصل کرتا ہے، اُس کی قدر و قیمت بے حساب ہے۔ ''سلفِ صالحین'' کو اس کا پورا احساس تھا، اور یہ اُن کی ''کثرتِ تلاوتِ قرآنِ کریم'' کی برکت تھی، کہ اُن کا یہ معمول اُن کی زندگیوں کا سرچشمہ بن گیا، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو دُنیا کی حکومت کا انعام بخشا۔ بعد کی صدیوں میں مسلمانوں نے قرآن سے غفلت برتی، جس کے نتیجہ میں کمزور ہو گئے۔ چنانچہ اگر مسلمان دوبارہ اپنا عروج چاہتے ہیں، تو بطورِ اُمت تمام مسلمان روزانہ قرآنِ پاک کی تلاوت کا کچھ حصہ اپنا معمول بنائیں۔ زیادہ سے زیادہ تلاوت کتنی کی جائے، یہ ''اخوان'' کے حالات پر منحصر ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین دن میں اور کم سے کم ایک ماہ ختم قرآنِ پاک کیا جائے، ورنہ اگر حالات اجازت دیں، تو درمیانی راہ یہ ہے، کہ ہفتہ میں ختم کیا جائے۔ اَن پڑھ

Marfat.com

بھائی تلاوت سے مبرا ہیں۔لیکن کوشش کریں کہ دوسروں سے سنیں اور کچھ سورتیں حفظ کر کے اُن کو تلاوت کیا کریں۔ اگر کوئی بھائی تلاوت کرے (زبانی یا خاموشی سے) تو با معنی سمجھ کر تلاوت کرے۔ جناب البناؒ اِس امر کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، کہ جب ''اخوان'' ایک مجلس کی شکل میں جمع ہوں، تو ایک بھائی زور سے تلاوت کرے۔ جسے سب سنیں اور معنی سمجھ کر سنیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہیں۔

آپ نے ''احادیث'' کی دعاہائے ماثورات کا ایسا مجموعہ مرتب کیا، جو ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دُعائیں صبح سویرے اُٹھنے سے لے کر لباس بدلنے، گھر سے باہر نکلنے اور گھر میں داخل ہونے، چلتے پھرتے، مسجد میں داخل ہونے اور اُس سے باہر نکلنے، بے خوابی اور رویائے غیر صالحہ سب امور سے متعلق ہیں۔ دوسری دُعائیں وہ ہیں جو انسان کی ذاتی حاجت روائی، ہدایتِ ربانی اور کسی طوفان کے وقت مانگی جانے والی ہیں۔

المختصر! آپ نے ''اخوان'' بھائیوں کی روزمرہ کی دُعاؤں اور تسبیحوں کا خلاصہ تجویز کیا، ''رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوبَنَا'' کی ایک تسبیح یک صد مرتبہ ''ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ'' ایک صد مرتبہ۔ یہ دونوں تسبیحیں صبح کی نماز کے بعد ایک ایک مرتبہ اور نمازِ مغرب یا عشا کے بعد ایک ایک مرتبہ۔ پھر رات کو سونے سے قبل اپنے اُس روز کا احتساب اور اللہ تعالیٰ کے حضور حصول انعامِ الٰہی کی دُعا۔

ہر ''اخوانی'' کے دل میں ایک دینی جذبہ انگیخت کرنے کے لیے آپ کا زور تھا کہ وہ ہر وقت خوشنودیٔ الٰہی مقدم رکھیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں، جو اِس کے برخلاف ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کے لیے خصوصی عبادات میں نمازِ تہجد کے علاوہ ''ذکر'' ایک مہینے میں تین روزے اور زیادہ ''ذکر'' کا اہتمام شامل ہیں۔ ہر وقت ''باوضو'' رہنا بھی پاکیزگی جسم کے ساتھ خوشنودیٔ الٰہی کا باعث ہے۔ بحیثیت ایک مسلمان ہر ''اخوان'' بھائی کے لیے دیگر فرائض کے علاوہ پنج وقتہ نماز کی پابندی لازمی ہے، جبکہ جس قدر ممکن ہے، نماز مساجد میں ادا کی جائیں۔ آپ نے ''اخوان'' کے لیے روزمرہ کی زندگی کے جو مشاغل تجویز کیے وہ یہ ہیں۔

۱۔ روزانہ قرآنِ کریم کا کچھ حصہ تلاوت کرنا اپنا معمول بنائیں اور کم از کم ۴۰

Marfat.com

احادیث یاد ہوں۔

۲۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کا مطالعہ۔

۳۔ شرعی قوانین کے بنیادی اصولوں کا علم۔

۴۔ ''اخوان'' اپنی صحت کا خاص خیال رکھیں اور اپنی جسمانی قوت کو مضبوط بنائیں۔

۵۔ کافی اور چائے کم سے کم استعمال کریں، جبکہ تمباکو نوشی سے مکمل احتراز کریں۔

۶۔ وسیع مطالعہ، بالخصوص معاشرتی مضامین، بین الاقوامی امور پر اخبارات اور میگزینوں کے مضامین، اپنی استطاعت کے مطابق اپنی ذاتی لائبریری کے ذریعہ اپنے علم کو ترقی دینا، بالخصوص ٹیکنیکی مہارت۔

۷۔ اپنی ذاتی زندگی میں بڑے گناہوں سے احتراز تو ضروری ہے ہی، لیکن چھوٹی نوعیت کے گناہوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود اپنی زندگی میں ہر طرح کی برائی کے خلاف ''جہاد'' کیا جائے جن میں اولین ''ترکِ خواہشات نفسانی'' کی جگہ جائز باتوں پر عمل ہے۔

۸۔ ایسے افراد کی صحبت سے احتراز کیا جائے، جو شراب کے عادی اور دیگر بداعمالیوں میں مبتلا ہوں (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکے دور میں مصری معاشرہ میں شراب نوشی عام ہو چکی تھی، اس میں وہ رشتہ دار خاندان اور نام نہاد دوست شامل ہیں۔

۹۔ ضیاعِ وقت سے بچا جائے کہ وقت ہی زندگی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وقت کا استعمال نفع بخش سرگرمیوں میں گزارا جائے۔

۱۰۔ ''اخوان'' کو حق گو ہونا چاہیے جو اپنے عہد کی پاسداری بھی کریں۔ سچ کہنے میں بے باک ہوں، اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے، تو اُس کے تسلیم کرنے میں کوئی شرم نہ ہو اور غضبناک ہونے سے بچا جائے۔

۱۱۔ کوئی خوش مزاجی کی بات ہو، تو بڑی سنجیدگی سے لطف اندوز ہونے میں

Marfat.com

کوئی ہرج نہیں۔

۱۲۔ دوسروں کی خدمت، مصیبت میں کسی کا ساتھ دینے میں اور کسی غم زدہ کے ساتھ اُس کے غم میں شریک ہونے میں ایک طرح رُوحانی خوشی محسوس کریں۔
المختصر! ''اخوان'' لوگوں اور جانوروں کے حق میں رحم دل اور منکسر المزاج ہوں۔
آپ کی رائے میں اگر کوئی بھی بھائی مالدار ہو، پھر بھی اُسے کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا چاہیے۔ وہ خود سرکاری ملازمت کا متلاشی نہ ہو، تاہم اگر اُسے کوئی ملازمت پیش کی جائے، جس کے قبول کرنے میں اُس کے مشن پر کوئی زد نہ پڑتی ہو، تو یہ ملازمت قبول کر لینی چاہیے، اور اپنے مشن کے ساتھ پوری یکسوئی سے ملازمت کی ذمہ داریاں پوری کی جائیں۔

۱۳) ''اخوان'' اپنی دولت کے کچھ حصہ سے مشن کی مالی مدد کریں اور ایمرجنسی کے کاموں کے لیے کچھ رقم بچائے رکھیں۔

۱۴) مسلمان اِسلام کی اِس طرح سے بھی خدمت کر سکتے ہیں، کہ اشیائے خوردنی، ملبوسات اور دیگر ضروریات اِسلامی ممالک کی پیداوار ہوں۔

۱۵) معاشرے میں خواتین کے کردار کے بارے میں آپ عصمت کی حفاظت قرونِ اولیٰ کی خواتین کی تقلید کریں، یہ آپ کا سختی سے نظریہ تھا۔ خواتین کے بارے میں آپ نے ایک مضمون تحریر کیا، کہ اسلام خواتین کو پورے ذاتی اور سیاسی حقوق دیتا ہے۔ لیکن معاشرے میں عورت و مرد دونوں کا کردار جُدا جُدا ہے۔ جس کی بنیاد فطری اور جسمانی علیحدہ علیحدہ بناوٹ کے لحاظ سے ہے۔ اِسلامی خواتین کو اللہ تعالیٰ اپنی ہدایات کے تحت (اپنی بناوٹ کے لحاظ سے) معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی ہدایات دیتا ہے اور ایسی ذمہ داریاں ادا کرنے سے روکتا ہے، جس کی وہ اہل نہیں، بہ الفاظِ دیگر اُس کا اصل مقام گھر ہے، بحیثیت ایک والدہ، ایک بیوی اور گھر

Marfat.com

کی مالکہ۔ چنانچہ مسلمان بچیاں، اپنے مستقبل کی زندگیاں اِس طور تیار کی جائیں، کہ وہ بالغ ہو کر تعلیمی لحاظ سے مطالعہ، تحریر اور حساب دانی کے علاوہ، دین کی اقدار، اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ، گھر کو صاف ستھرا رکھنا، بچوں کی پرورش و تربیت اور گھر کا انتظام سنبھالنے والی ہوں۔ عورتوں کو قانون دانی، غیر ملکی زبانیں اور دیگر ٹیکنیکی سائنسی علوم سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اُن کا اصل مقام اُن کا گھر اور اُن کا انتظام ہے۔

ایک اور بنیادی اصول جو مسلمان خواتین پر لاگو ہے اور مسلمانوں میں متفق علیہ ہے؛ کہ جنسی کشش مرد و عورت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ چنانچہ دونوں کی عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے اسلام (حرام رشتوں کے علاوہ) مخلوط میل جول سے منع کرتا ہے۔ بصورت دیگر معاشرہ بداخلاقی کا شکار ہوگا اور زنا کاری میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ ازدواجی زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی، خاندانوں کی عزت و احترام کی کوئی حیثیت نہ رہے گی اِن خرابیوں سے روکنے کے لیے اسلام کسی عورت کے کسی اجنبی سے علیحدگی میں میل جول کی ممانعت کرتا ہے، اور اُسے زیادہ سے زیادہ اپنے گھر میں رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ مزید برآں جب عورتیں گھروں سے باہر نکلیں، تو اُن کا لباس سادہ ہو اور وہ مردوں سے آنکھیں نہ ملائیں۔

اِن تمام باتوں کا مطلب یہ ہے، کہ جناب البناؒ لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط تعلیم اور پبلک پارکوں میں مرد و عورت کے یک جا ہونے کو اسلام کے خلاف غیر ملکی تہذیب کا حصہ قرار دیتے تھے۔ اِن کے جواز میں آپ نے کئی احادیث کا حوالہ دیا۔ ایک حدیث شریف کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا، کہ کوئی عورت کسی محرم مرد کے ساتھ کے بغیر تین دن یا اُس سے زائد سفر نہ کرے۔ ایک اور حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ ''کوئی عورت جب گھر سے باہر ہو تو محض چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوں'' ایک اور حدیث کے حوالے سے آپ نے کہا کہ ''خواتین مساجد کی بجائے گھر پر عبادت کریں۔''

یہ تھا آپ کا اگرچہ طویل مگر ''ذکر'' کا ملخص، ''اخوان'' بھائیوں اور بہنوں کے لیے۔

Marfat.com

اگرچہ ہر ملک میں دینی اور سیاست سے وابستہ دینی جماعتیں اپنے اراکین کو دین پر عمل کرنے کی ہدایات دیتی ہیں، لیکن جس تفصیل سے آپ نے ''اخوان'' کے بھائی بہنوں کو ''ذکر'' کے عنوان سے ہدایات دی ہیں۔ وہ بالکل منفرد ہیں، اور آپ کی زندگی پر یہ مضمون تعجب ہے کہ ایک غیر مسلم مغربی سکالر کے قلم سے ہے، کہ اُس نے کتنے قریب سے آپ کی زندگی کا مشاہدہ اور اِسلام کا مطالعہ کیا۔ جس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی، جو ذرا بھی خلافِ اسلام ہو، اور اگر کوئی شخص کسی سیاست سے وابستہ کسی مذہبی جماعت کا رُکن ہو، تو وہ اُسے ''صوفی'' اور سیاستدان دونوں بنادیتا ہے۔

جدید دور میں اِسلامی تحریک کو میدانِ عمل میں لانے کے لیے جناب حسن البنّاؒ کے لیے ایک ایسی تنظیم کو عملی شکل دینا ضروری تھا، جو عملی صلاحیتوں کی مالک ہو۔ جب آپ ''دار العلوم'' قاہرہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ آپ نے زوالِ اُمت کے بارے میں جو پہلا سبق محسوس کیا کہ ماضی میں جو بزرگ چاہتے تھے کہ اُمت عروج حاصل کرے، اُن کے نیک عزائم اور نیک نیتی سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی مؤثر ذرائع اختیار نہ کرسکے۔ چنانچہ اِس پر قابو پانے کے لیے آپ نے مصمم ارادہ کرلیا کہ ایک ایسی سرگرم تنظیم قائم کی جائے، جو وہ اصلاحات نافذ العمل کرسکے، جو اسلام کا بنیادی تقاضا ہیں۔ ایسی تنظیم کے ڈھانچے کے لیے آپ نے سرکاری ملازمتوں کے لیے جس کا دائرہ فوج اور سول تک پھیلا ہوا تھا، کچھ اصول وضع کیے، جبکہ آپ خود بھی محکمہ تعلیم کی نوکرشاہی میں ایک عہدہ کے مالک رہ چکے تھے، چنانچہ یہ قدرتی امر ہے، کہ مذکورہ اداروں کے لیے اصول وضع کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

''اخوان المسلمون'' کے لیے آپ کوئی ایسا منظّم ڈھانچہ مرتب نہ کرسکے، تا آنکہ آپ کا تبادلہ ۱۹۳۲ء میں اسماعیلیہ سے قاہرہ کردیا گیا۔ اگرچہ تبادلہ سے ایک سال قبل اپنے آپریشن کو عمل میں لانے کے قواعد وضوابط مرتب کرلیے تھے۔ قاہرہ آنے کے بعد آپ نے ہمہ وقتی بمعہ ضروری عملہ ''مرکز'' قائم کرلیا، اور ایک قلیل عرصہ میں صوبائی دفاتر قائم کرلیے گئے، جبکہ ہر صوبائی دفتر کی ایک انتظامی کونسل اور جنرل اسمبلی تھی۔ یہ صوبائی دفاتر اپنی ماتحت برانچوں کو شیڈول ارسال کرتے تھے، کہ وہ کیا سرگرمیاں عمل میں لائیں اور بعدازاں اپنی کارکردگیوں کی رپورٹ مراکز ارسال کریں۔

Marfat.com

قاہرہ آنے کے بعد ''اخوان'' کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اب ضروری ہو گیا، کہ اِس بڑھتی تعداد کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے کیا طریقہ اپنایا جائے۔ ۱۹۴۶ء میں ''اخوان'' مصر بھر میں سیاسی اور مذہبی حیثیت سے ایک ایسی مضبوط پارٹی بن گئی تھی، جس کا تنظیمی ڈھانچہ قابلِ رشک تھا اور پارٹی میں آپ کی شخصیت غیر متنازعہ فیہ تھی، چنانچہ آپ تاحیات ''اخوان'' کے ''قائدِ عوام'' قرار پائے اور آپ کی پالیسیوں کی حمایت یا قدرے تبدیلی کے لیے بارہ افراد کی کونسل قائم ہوئی۔ پھر بڑے پیمانے پر ایک اور مجلس شوریٰ قائم ہوئی، جس کی تعداد یکصد تا یکصد پچاس کے درمیان تھی۔ اِس مجلس شوریٰ کے بارے میں طے پایا، کہ جناب حسن البنّاؒ کی سربراہی میں اس کا سالانہ اجلاس ہوا کرے گا۔ جو کونسل کے اراکین منتخب کریں گے۔

مزید برآں آپ نے اضلاعی درجہ کی شاخوں سے نچلے درجہ کی شاخوں کے لیے جن کو آپ نے ''فیملی'' کا نام دیا، سرکردہ تنظیموں کی شکل دی۔ جبکہ اِن کی ذمہ داریوں میں اقتصادی، قانونی اور دیگر عوامی بہبود کے امور شامل تھے۔

تیسرے تنظیمی ڈھانچہ میں مصری معاشرے میں نچلے درجے کے شہری ورکر، کسان، طلبا اور عام کاریگر طبقہ تھا کہ ''اخوان'' اُن کے مسائل میں کیا خاطر خواہ تعاون کریں۔ جبکہ ڈھانچہ کے آخری حصہ میں پریس، اور ''اخوان'' کی تعلیمات سے دوسرے مسلم ممالک کو متعارف کرانا تھا۔

آپ نے تنظیم کے ایک ایک جزو کو بروئے کار لانے کیلئے اپنا ایک ایک لمحہ وقف کر دیا (یہ کام کوئی مخلص ترین دیانتدار ہی کر سکتا ہے) لفظ ''فیملی'' جو عربی میں ''العسرۃ'' کے معنوں میں ہے، اور چھوٹی سے چھوٹی یونٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ اِسکے بارے میں آپ نے لکھا، کہ اِسکے تین ستون ہیں۔

۱۔ ایک دوسرے سے باہمی تعارف، جو اراکین میں اخوت و اتحاد قائم کرے۔

۲۔ باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ ایک دوسرے کے مسائل سمجھنا اور مشورہ دینا۔

۳۔ ایک دوسرے کی مدد کے ذریعہ اتحاد مستحکم کرنا۔

اراکین کا ہر ہفتہ اجتماع ہو، اور اراکین ایک دوسرے کی بیماری اور مالی ضروریات کا معلوم کر کے اپنی حد تک ساتھ دیں۔

Marfat.com

''العسرۃ'' یا فیملی کے افراد اپنے مسائل سنجیدگی ومتانت اور باہمی اعتماد وتعاون کی فضا میں حل کرنے میں کسی کوشش میں کمی نہ چھوڑیں گے۔ ''اخوان'' نے مرکزی قیادت کے عام اسلامی امور کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا۔ لیکن آپ نے محض بحث برائے بحث کی حوصلہ شکنی کی اور اختلاف کی شکل میں ''فیملی'' کا سربراہ اختلاف دُور کرنے کیلئے معاملہ قیادت کے سامنے پیش کرے گا۔ جبکہ ہفتہ وار اجتماعات ایسا مواقع ہونگے، جن میں مفید کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا جاسکے۔

یہ ہفتہ وار اجتماعات وقتاً فوقتاً سیر وتفریح کے ذریعہ باہمی میل جول کو استحکام بخشنے کے علاوہ کھیل کود کا ذریعہ بھی بن سکیں گے۔ جناب البناؒ نے بالخصوص "Cano Trip" پہاڑیوں پر چڑھائی، صحرائی سفر اور سائیکل سواری کا اِن ہفتہ وار سیر وتفریح کے بارے میں خاص طور پر ذکر کیا۔ آپ نے ''اخوان'' کو خاص طور پر اس امر کی بھی تلقین کی کہ وہ کم از کم ہفتہ میں ایک شب نمازِ سحر اور ایک روزہ کا اہتمام کریں۔ اِن تمام امور کو بجالانے میں جناب البناؒ کے ذہن میں یہ حکمت تھی، کہ ''اخوان'' ایک ایسے مثالی خاندان کی شکل اختیار کرلیں، کہ اُن میں اُونچ نیچ کی تمیز ختم ہو جائے، اور زندگی کے دینی، سماجی، معاشی معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں۔

جسمانی تعلیم Physical Education میں آپ کی دلچسپی کا اظہار اخوان میں ''سکاؤٹس'' اور ''روورز'' جیسی تنظیمیں تھیں۔ اخوان میں یہ شعبہ ''وفد پارٹی'' اور ''ینگ پارٹی'' کے نوجوانوں سے مماثلت رکھتا تھا۔ اِس طرح یہ تینوں جماعتیں نوجوانوں میں ڈسپلن، عسکریت اور ملکی استحکام پر زور دیتی تھیں۔ ''روورز'' Rovers کے شعبہ میں پہلوانی، باکسنگ، فٹ بال اور باسکٹ بال جیسے کھیل شامل تھے، جبکہ ہفتہ میں ایک مرتبہ تفریحی سفر میں عوام میں تعلیم حاصل کرنے کا ذوق پیدا کرنا اور خود صفائی اور دوا دارُو کے ذریعہ عوام کی خدمت کرنا تھا۔ روورز بٹالینز Rovers Battalians قائم کرکے آپ نے ان بٹالینوں کے اراکین کو ہدایت کی، کہ وہ ایک دوسرے سے پوری طرح متعارف ہوں اور باقاعدگی سے میٹنگوں میں شامل ہوں، اور ہر اُس تنظیم یا جماعت سے باز رہیں، جنکے اصول ''اخوان المسلمون'' کے اصولوں سے مماثلت نہ رکھتے ہوں۔

Rovers سسٹم صدی کے تیسرے عشرے کی نازی ازم یا فاشزم کی عسکریت کا

Marfat.com

عکاس تھا، جس میں بزور بازو دوسروں کو اپنا غلام بنانا تھا، جسے جناب البنّاؒ نے مسترد کیا، آپ کے سامنے اُس کا صرف یہ پہلو قابلِ قبول تھا، کہ کسی کو غلام بنانے کے پہلو سے ہٹ کر محض اِسلام کا عسکری پہلو سامنے رکھیں۔ اِس طرح Rovers نے جناب البنّاؒ کے لیے ایک اور شعبہ میں بھرتی ہونے کے افراد کو جگہ دی، جسے ''آلات خصوصی'' Special Apparalies کا نام دیا گیا۔ اِس شعبہ کو جو افراد اپنے جذبہ اور صلاحیت سے قوی تر بنا سکتے تھے۔ تو اُن کو اِس کی رُکنیت دی جا سکتی تھی۔ اِس کے اراکین ایک حلف لیتے تھے، کہ وہ زیادہ منظم طریقہ سے اپنی ہر طرح کی کوشش کریں گے اور کچھ قرآنی رکوع حفظ اور تلاوت کیا کریں گے۔ اپنی جسمانی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھیں گے جس کے لیے وہ کچھ محنت و مشقت کریں گے۔ آپ نے اراکین کے لیے خاص نصاب کا بھی اہتمام کیا، جس میں دینی شعور، قانون، فرسٹ ایڈ اور ہتھیار کے استعمال کا بھی اہتمام کیا۔ اِن کو اِسلام کے ''جہادی دستے'' کا نام دیا جا سکتا ہے، کہ بوقتِ جہاد اُن کے اندر رُوحانیت اور عسکریت دونوں پہلو کارفرما ہوں۔ جس میں ''حلفِ وفاداری'' تکمیلِ مقصد کی خاطر تھا۔ یہ حلف ایک تاریک کمرے میں قرآنِ کریم پر ہاتھ رکھ کر ایک پستول ہاتھ میں لے کر لیا جاتا تھا۔ جہاد کا یہ جذبہ، جس میں حلف لینے والے کے دل میں جذبۂ شہادت کارفرما تھا، جہاد کے بارے میں قرآنِ کریم کی ایک آیت کے حوالے سے لیا جاتا تھا۔ جس میں دُنیاوی محبت پر جذبۂ شہادت حاوی تھا۔

جناب البنّاؒ کی نظر میں ایک تنظیم ضروری تھی، لیکن ''اخوان'' کے سامنے جو مقاصد آپ نے اپنے طور مرتب کیے تھے، وہ محسوس کرتے تھے کہ تمام تر کوشش کے باوجود سو فیصد ایسی تنظیم وجود میں نہیں آ سکتی آپ اِس امر پر زور دیتے تھے کہ ''اخوان'' کے لیے ہر ممکن حد تک زندگی کے ہر شعبہ میں جو اِسلام کی عملی تعبیر ہو۔ انفرادی اور اجتماعی سرگرمیاں کارفرما ہونی چاہئیں۔ فی الحقیقت آپ کی زندگی عملی طور پر آپ کے حصولِ مقصد کا ایسا عملی نمونہ تھی، جس نے ''اخوان'' کے ہر رُکن میں اُس کی عملی رُوح پھونک دی۔ مثال کے طور پر جب آپ اسماعیلیہ میں تھے، تو ایک دوسرے قصبہ میں ایک دوسری برانچ قائم کرنے کے لیے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ نکل پڑے۔ اِس سے قبل وہاں کوئی شخص ''اخوان'' سے وابستہ نہیں تھا۔ آپ قصبہ کی گلی گلی میں ہر کافی

Marfat.com

ہاؤس اور چائے خانہ گئے کہ کوئی آپ کی بات سُن کر آپ کا مقصد سمجھ سکے۔ بالآخر آپ کو ایک دکاندار مل گیا اور آپ کی باتیں توجہ سے سُن کر آپ کا قائل ہو گیا اور آپ نے اُسے جماعت کا رُکن بھرتی کر لیا۔ آپ نے ایک مضبوط جماعت قائم کرنے کے لیے بذریعہ ٹرین، بذریعہ بس، بذریعہ گدھا گاڑی قصبہ در قصبہ، شہر تا شہر سینکڑوں سفر کیے۔ جس گاؤں میں جاتے، گاؤں کی مسجد میں نماز ادا کرتے اور حاضرین سے اپنی آمد کا مقصد اور مذہب کے بارے میں دل پذیر بات کرتے۔ اس طرح آپ نے مصر بھر میں ذاتی تعلقات کا ایک ایسا وسیع سلسلہ قائم کر لیا، جس نے ایک ایسی قیادت کو جنم دیا کہ ہر مخلص مصری آپ کو اپنا ذاتی دوست شمار کرنے لگا۔ جب تک آپ قاہرہ میں مقیم رہے، آپ کے روزمرہ کے یہ معمولات تھے:

۱۔ صبح کے وقت آپ ''اخوان'' کے مرکزی دفتر جاتے۔

۲۔ اس کے بعد ایک سکول میں سبق دیتے۔

۳۔ سکول سے مرکز واپس جاتے اور خطوط وغیرہ کے جواب دیتے۔

۴۔ دوپہر کے وقت کچھ دیر کے لیے آرام کے لیے گھر آتے۔

۵۔ شام کے وقت قرآنِ کریم کے حوالوں سے مرکز میں جمع افراد سے خطاب کرتے، بالخصوص روزمرہ کی زندگی کے حوالہ سے۔

آپ کا ''اخوان'' پر یہ زور تھا، کہ اُن کی زندگیاں معاشرے میں ہر شعبہ میں اسلامی احکامات کا مظہر ہوں۔ ۱۹۳۴ء میں آپ نے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ جو مصر کے کونے کونے میں پھیلایا گیا۔ کہ ''اخوان'' کی کیا کیا سرگرمیاں ہیں۔ جن کی مختصراً تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ بچوں، بچیوں اور روزکروں کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سکول کھولنا

۲۔ مساجد اور چھوٹے پیمانے پر ٹیکسٹائل فیکٹریوں کا قیام

۳۔ محتاجوں کے لیے خیراتی ادارے قائم کرنا

۴۔ کافی ہاؤسوں، پبلک مقامات اور مجالس میں دعوت کا کام

۵۔ رضاکارانہ طور پر مساجد، گلیوں اور دیہات میں روشنی کا اہتمام

Marfat.com

۶۔ عوام میں بُری عادتوں اور توہمات کے خلاف مہم

۷۔ اناج کی شکل میں ''زکوۃ'' جمع کرنا اور اُس کا محتاجوں میں تقسیم کرنا

۸۔ غریبوں کی اپنے لیے چھوٹے چھوٹے مکانات کی تعمیر میں ممکن مدد کرنا

۹۔ عیسائی مشنریوں کے پرچار کا اخبارات شائع کر کے مقابلہ کرنا

المختصر ''اخوان'' کا ایک مضبوط جماعت کے ذریعہ جناب البناؒ کا مرکزی نقطہ نگاہ صحیح معنوں میں اشاعتِ اسلام تھا اور یہ تمام باتیں بطور ایک تعلیم تھیں۔ جناب البناؒ بطور ایک انتھک سکول ماسٹر مصر بھر کے دورے کرتے، جن میں آپ خطاب اور تبلیغ کرتے۔ اسماعیلیہ میں پہلی مرتبہ ایک مسجد اور ایک سکول دونوں بیک وقت تعمیر کرنے کے لیے آپ نے رقومات جمع کیں۔ اسماعیلیہ میں آپ نے جو پہلا سکول تعمیر کیا، اُس کے طلباء کے لیے ایک یونیفارم لازمی قرار دی، جس کے جزو ایک لمبا کُرتہ، ایک مصری کوٹ، ایک ٹوپی اور خاص جوتے تھے۔ جو نصاب آپ نے تعلیم کا حصہ بنایا۔ اُس میں دینی اور صنعتی تعلیم دونوں تھیں۔ بعدازاں ''اخوان'' نے جگہ جگہ پرائمری، سیکنڈری اور ٹیکنیکل سکول قائم کیے۔ بتدریج لڑکیوں کے لیے بھی سکول علیحدہ قائم کیے گئے، آپ ''تعلیمِ بالغاں'' کے بھی بڑے داعی تھے، چنانچہ ''اخوان'' نے صنعتی کارکنوں اور کسانوں کی تعلیم کے لیے بھی سکول قائم کیے، جن میں دینی تعلیم اور پڑھنا لکھنا دونوں سکھائے جاتے تھے۔ ''اخوان'' نے یونیورسٹی طلباء کے لیے سپیشل کورس مرتب کیے، جو امتحانات میں کامیابی میں مدد دیتے تھے۔ مسلم عوام میں اسلامی احکامات کی تبلیغ کرتے وقت آپ سادہ انداز اختیار کرتے، نماز ادا کرنے سے قبل جب یہ دیکھتے کہ کوئی نمازی صحیح طریقہ سے وضو نہیں کر رہا ہے تو آپ بڑی سادگی سے اُسے صحیح طریقہ وُضو سکھاتے، اور نمازیوں کو بھی سنت کی بنیادی باتوں کی تشریح کرتے۔ آپ کا اپنا منفرد انداز تھا، جس میں آپ ایسی مثالیں اور پہیلیاں بیان کرتے، کہ سامعین سب باتوں کو چھوڑ کر آپ کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ جبکہ آپ پندرہ منٹ سے زائد اپنی بات نہ بڑھاتے، اور آپ جو بات بھی عوام کے سامنے پیش کرتے، وہ دِل لگنے والی ہوتی، اور حق کے پردے میں لپٹی ہوتی۔ تلاوتِ قرآنِ پاک کے کورسوں، تاریخ اسلام اور اِسلامی قوانین کے

Marfat.com

بارے میں آپ تقریر کرتے وقت قصداً متنازعہ فیہ باتوں سے اغماض اختیار کرتے، جو وہ علماء خصوصاً بیان کرتے، جنہوں نے ''الازہر'' میں تعلیم حاصل کی اور اُمت کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ جناب البنّاؒ کا یقین تھا کہ ان بحثوں کی فضول ''چھیڑ خوانی'' سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں تھی، جو اُمتِ مسلمہ کو اصل راہِ منزل سے دُور لے جانے والی تھیں۔

آپ عوامی تعلق کی طرف خاص توجہ دیتے، اِس سے آپ نہ صرف اپنے زورِ خطابت کو موثر بناتے، بلکہ دوسرے افراد کو بھی خطاب کرنے کا آسان طریقہ بتاتے۔ عام مصری عوام سے گھل مِل جانے کی خاطر آپ متوسط طبقے سے وہ افراد اپنے ساتھ شامل کرتے، جسے زبان پر اختیار ہو اور مصری عوام کو اپنے ساتھ اپنی تقریر سے متاثر کر سکے۔ آپ کا عوام سے گھل مل جانا آپ کی تقریروں اور تحریروں سے کہیں زیادہ مؤثر تھا اور یہ تسلیم کرتے تھے، کہ یہ طریقہ تبلیغ اُنھوں نے یورپینوں سے اپنایا ہے۔ جو ''اخوان'' کے لیے ایک ایسا ''آلہ'' Apparatus ہے۔ جو باہمی مراسلت سے شروع ہوا، بعد ازاں ایک ہفتہ وار میگزین اور اُس کے بعد ایک روزنامہ اخبار اور بالآخر علامہ رشید رضا کے ماہنامہ ''المنار'' کی شکل میں۔

جہاں تک جناب البنّاؒ کا اپنے مقصد کے لیے عمل اور تنظیم کا تعلق ہے، اُن کی اصل منزل واضح نہیں نظر آتی۔ کہ مصر کو کیسے اِسلامی ملک کی شکل دی جائے، تاہم آپ نے جہاں تک ممکن ہے، ہر ممکن عام طریقہ تجویز فرمایا۔ اور آپ نے پہلا طریقہ جو تجویز فرمایا وہ اپنا پیغام عوام سے بلاواسطہ خطاب، عوامی تقاریب کے مواقع پر عوام کو مخاطب کرنا اور اپنے پیغام کی نشر و اشاعت تھا۔

دوسرا طریقہ ''روورز'' Rovers کی طرح ''گروپس'' Groups کی شکل میں ''اخوان'' عمل کریں، جس میں ایک دینی نظم نظر آتا ہو اور وہ اپنے آپ کو جسمانی طور پر مضبوط بنا کر عسکری ہوں۔

ان پر عمل بالآخر پھل پھول لائے گا اور اِسلامی نظام کے لیے راہ ہموار کرے گا۔

آپ نے تشدد کو مرض کا علاج قرار نہیں دیا، لیکن طبقہ اقتدار نے جو شریفانہ راہ اپنائی ہے وہ از خود عوام کو اُن کے خلاف ایک بھڑکتی آگ کی طرح اُٹھا دے گا۔ اقتدار کے بارے میں

Marfat.com

آپ نے اپنا اور ''اخوان'' کا موقف بیان کیا۔ کہ وہ اور اُن کی جماعت ذرا بھی اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند نہیں، لیکن ایسی حکومت چاہتے ہیں، جو اِسلام اور اِسلامی احکامات کے مطابق ہو۔

آپ نے کبھی یہ وضاحت نہیں کی کہ کس وقت ''اخوان'' طاقت استعمال کریں۔ بلکہ بعض مقتدر اخوان جو حکمرانوں کے جابرانہ اقدامات کی وجہ سے اپنی طاقت کا نسخہ استعمال کرنے کی تجویز دیتے تھے، اِس سے اختلاف کرتے ہوئے، یہ رائے دیتے تھے کہ کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ صبر کے ساتھ کامیاب منصوبہ بندی ہو، نا کہ ایسا عمل، جو ناکامی پر منتج ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اولاً قوم کو اِسلامی رنگ میں ڈھال دیا جائے جو ایک صحیح اِسلامی حکومت کی حمایت کرنے والی ہو۔

جنابِ حسن البناؒ کی زندگی کے بارے میں حرفِ آخر:

جن عمدہ الفاظ میں آپ کی زندگی پر مغربی مضمون نگار ''ڈیوڈ کومنز'' David Commins نے ''حرفِ آخر'' میں آپ کی تحسین فرمائی ہے، اُس پر

''بوئے گُل نالہ دِل، دُودِ چراغِ محفل''

مصرعہ صادق آتا ہے۔

خود اِس کتاب کا مرتب حیران ہے کہ بائیس سال کی عمر میں تو مدرسوں اور کالجوں سے طلباء فارغ التحصیل ہو کر باہر نہیں آتے، جو بعد ازاں ڈاکٹر اور پروفیسر کی ڈگریاں سالوں بعد پاتے ہیں، چہ جائیکہ کوئی عوامی لیڈر کی حیثیت حاصل کر سکیں۔ آپ کا سالِ پیدائش ۱۹۰۶ء ہے اور ''الاخوان المسلمون'' کا قیام ۱۹۲۸ء میں عمل میں آیا۔ جبکہ قیامِ جماعت کے بعد جب آپ کی عمر صرف ۴۳ سال تھی، وقت کے حکمران نے آپ کی عوامی مقبولیت سے خائف ہو کر ۱۹۴۹ء میں ایک خفیہ سازش کے ذریعہ شہید کرا دیا، جبکہ نہ آپ خود حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے خواہاں تھے نہ ''الاخوان المسلمون'' بطور جماعت حکومت کا تختہ اُلٹ کر برسرِ اقتدار آنا چاہتی تھی، جس کا گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔

آپ شروع سے ''صوفی'' مزاج تھے، جس میں سنجیدگی و متانت، اخوت و محبت، ذکر و عبادت، خلوص و نیک نیتی، دوسروں کے غم و خوشی میں شامل کے علاوہ تمام ایسی خوبیاں شامل ہیں،

Marfat.com

جو ایک صالح مسلمان کی نشانی ہیں۔ آپ رہبانیت کی راہ کے ''صوفی'' نہ تھے بلکہ ''تصوف'' کے ذریعہ اس راہ کے داعی تھے، کہ جسکی آخری منزل خشوع و خضوع کی عبادات، جس کا مقصد خوشنودیٔ الٰہی اور یومِ آخرت کی جوابدہی کے ساتھ ''اجتماعی طور پر'' خلافت راشدہ کا طرزِ حکومت ہے، جس میں اُونچ نیچ کی تمیز کے بغیر پاکیزہ زندگی کی حکمرانی ہے۔ چنانچہ آپ نے ''الاخوان المسلمون'' کیلئے ''صوفیانہ'' زندگی کے ساتھ ۲۱ سالہ قائدانہ حیثیت میں وقتاً فوقتاً راہِ سلوک کے ساتھ ''اخوان'' کو گلیوں کی صفائی سے لیکر حاکمیت کے اُن طور طریقوں سے عملاً خود اپنی زندگی ایک نمونہ بن کر متعارف کرایا، جو مذہب کے نام پر کسی اسلامی ملک میں اسلامی نظام کرنے کی داعی ہیں چنانچہ مضمون نگار آپکی زندگی کے ''حرف آخر'' کے طور پر جو لکھتے ہیں وہ ان الفاظ میں ہے:

''جناب حسن البنّاؒ نے بطور مصلح ایک اسلامی معاشرہ کی تبدیلی کا کام کسی فلسفیانہ انداز میں نہیں بلکہ ایک مقبولِ عوام لیڈر کی حیثیت میں شروع کیا۔ البتہ یہ تعین کرنا مشکل ہے، کہ اُن کا صحیح تصور کیونکر اِس تبدیلی کا تھا، کیونکہ جس عمر سے آپ نے یہ کام شروع کیا، وہ عمر کسی پختہ عمر فلسفیانہ اور دین پر عبور کے حامل کی نہ تھی، جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے، بلکہ جیسے جیسے حالات آپ کے سامنے آتے گئے اور آپ کو اُن سے مقابلہ درپیش آیا، ویسے ویسے آپ حالات کو شکل دیتے گئے۔ آپ کی تحریریں ضخیم کتابوں کی بجائے مختصر مضامین ہیں، جو اُس اِسلامی نظام کی عکاس ہیں، جو آپ کے زیرِ نظر ہے۔ ہمیں آپ کی سادگی ایک نقص خیال کرنے کی بجائے اِس نظر سے دیکھنا چاہیے، کہ آپ کی سادہ زندگی ہی نے آپ کو مقبولیتِ عوام دی۔ جناب حسن البنّاؒ کے مقابلے میں جناب محمد عبدہٗ اور علامہ رشید رضا نے زیادہ ذہنی اور طریقہ زندگی کی نشوونما کی راہ بخشی تھی، لیکن اپنے خیالات کو وہ عوام میں مقبول نہ بنا سکے۔ حسن البنّاؒ کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ آپ نے دورِ جدید میں احیائے اسلام کو بطور ایک عملی مقبولِ عوام تنظیم کی شکل دی۔ ''الاخوان المسلمون'' کی بنیاد رکھنے کے ساتھ آپ نے جس طور اُسے مقبول بنایا، آپ نے اِس تنظیم کی تمام دنیائے عرب اور عالمِ اسلام میں احیائے اسلام کی جانب ایک نمونہ کی شکل دے دی۔

اِس کامیابی کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے، کہ ماضی کے مفکرین کے مقابلہ میں جو ماضی کے

Marfat.com

معمول کے مدرسوں میں تعلیم پا کر قدرے پختہ عمر کے مفکرین بن جاتے تھے، آپ کی تعلیم جدید طرز کے سکولوں میں ہوئی۔ چنانچہ صدی کے دوسرے نصف حصے میں جناب البنّاؒ کی سرکاری سکولوں میں تعلیم دورِ جدید اور دورِ ماضی دونوں نوجوان طلباء میں احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھانے میں کارگر ثابت ہوئی۔ سرکاری سکولوں میں بطور ایک ٹیچر تعلیم حاصل کرنے کے نتیجہ میں آپ نے فلسفہ، نفسیات، اقتصادیات اور فزیکل ایجوکیشن جیسے علوم پر عبور حاصل کیا، جن کے بارے میں آپ ''الازہر'' میں تصور بھی نہ کر سکتے تھے جبکہ اِن علوم کے حصول نے بعدازاں خود اپنے طور قانون، ایجوکیشن اور پولیٹیکل سائنس کی تعلیم آسان بنادیں۔

غالبًا یہی وجہ ہے کہ جسکے باعث جناب البنّاؒ اور آپ کے ہم خیال داعیانِ اسلام نے اِسلامی نظامِ حق کے نفاذ کو اپنا منشور قرار دیا۔ جسکی دورِ جدید میں ضرورت ہے اور اِن داعیان نے مغربی مفکرین کے اُن تمام اعتراضات کو جڑوں سے اُکھاڑ دیا ہے، جو وہ اِسلام کے خلاف کرتے ہیں اور اُن کی وہ تمام خرابیاں اور کمزوریاں اُن پر واضح کر دی ہیں، جو خود اُنکی خرابیوں کی جڑیں ہیں۔ یہ مغربی معترضین محض اپنی مادی قوت کی بنا پر اسلام کو مسلمانوں کی پس ماندگی کا سبب قرار دیتے ہیں، یہ پس ماندگی خود ماڈرن سیاست، اقتصادیات اور تہذیب وتمدن کا تجزیہ کرنے کی متقاضی ہیں۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کے پرابلم پر جناب البنّاؒ اجتماعی اور سماجی سطح دونوں طور پر غور کرتے تھے۔ جسکے نتیجہ میں اِن سے عہدہ برآ ہونے کیلئے کوئی شکل نکال سکیں۔ آپکے دور میں مغربی مفکرین نے مسلمانوں کی پس ماندگی کے جو اسباب بیان کیے اور آپ نے اُنکے جواب میں جو اقدامات کیے، اگر پچاس سال قبل آپ یہ اقدامات کرتے، تو اُن سے وہ نتائج برآمد نہ ہوتے، جو آپ کے اقدامات سے ہوئے (اِس بات کو ایک ''صوفیانہ'' کرامت ہی قرار دیا جاسکتا ہے)۔

آپ کی قیادت کو ''شرعی مزاج تصوف'' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جسے آپ نے ''ذِکر'' کا نام دے کر صوفیانہ رنگ دیا ہے، اور ہر وقت ''اخوان'' پر ہی زور دیا ہے کہ کوئی بھی کام کرتے وقت ''خوفِ خدا'' ملحوظ رکھیں، اور خیال رکھیں کہ اُن کا یہ کام ''ہدایتِ الٰہی'' کے خلاف تو نہیں ہے۔ البتہ اُس کو نیا رنگ یہ دیا، کہ اغیار نے سیاست دوسرے الفاظ میں اپنے مکر وفریب کے

Marfat.com

ذریعہ اُمتِ مسلمہ کو جو غلام بنانے کا عمل اپنایا ہے، اُس سے بے خبر نہ رہیں اور ''صوفی'' رہتے ہوئے اُس توڑ میں کوئی کمی نہ آنے دیں۔ جس کیلئے آپ نے ایک ایسی منظّم جماعت تشکیل کی۔ جس کی بناوٹ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی بنیاد پر ہوئی، جس کا مطلب خود پاکیزہ زندگی ہے، اغیار کی سازشوں سے بے خبر نہ رہیں ''راہِ تصوف'' کی بنیاد ''متابعتِ شیخ'' ہے، کہ شیخ جو ہدایت دے اُس پر عمل کیا جائے۔ کہ اِس میں ''ڈسپلن'' کی رُوح کار فرما ہے۔ چنانچہ بطور شیخ یہ آپ کی کمال لیڈر شپ تھی کہ نہ صرف آپ کے معتقدین آپ کے معترف ہیں، بلکہ آپ کے معترضین بھی، کہ آپ کی زندگی اِس دور میں ''صوفیت'' کا نمونہ تھی۔ چنانچہ ''تصوف'' کے رنگ میں آپ نے صدی کے عشرے میں ''اخوان'' کی بنیاد رکھی، تو آپ کی ایک ہم عصر شخصیت نے اُسے ''تصوف'' کی ایک نئی شکل ہی خیال کیا۔ آپ کی زندگی پر ایک مصری نقاد نے آپ کے معتقدین کے بارے میں تحریر کیا، کہ وہ محض ایک صوفی کے مرید ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے اثرات محض آپ کی تحریروں اور تقریروں کے الفاظ میں محدود کیے جا سکتے ہیں، اور نہ آپ کے بارے میں مؤرخین کے تجزیوں یا ترجمانی میں۔ بلکہ دورِ جدید کی اُمتِ مسلمہ کی تاریخ سمجھنے کے لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ آپ کی شخصیت ایک مقناطیسی شخصیت تھی۔ ایسی مقناطیسیت جو آپ کی فکر پر دیوانہ وار عمل کرے، کہ آپ کی لیڈر شپ بے عیب ہے، اور ایسی بے مثال زندگی جو ماضی کے صوفیا اور اولیائے کرام کی یاد تازہ کرتی ہے۔

اِن ''حروفِ آخر'' کے ساتھ آپکے بارے میں بطور ایک ''صوفی''، بطور ایک دینی لیڈر، بطور ایک سیاسی لیڈر، بطور ایک اُستاد، بطور ایک سماجی کارکن، نہ صرف مصر میں بلکہ عالمِ اسلام میں، دُنیا میں اِسلام کو غالب کرنے کیلئے یہ مضمون ختم ہوتا ہے، جبکہ یہ مضمون کسی مسلمان قلم کار کا نہیں، بلکہ ایک مغربی معروف مضمون نگار کا ہے۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو عالمِ اسلام کے دیگر کئی ممالک میں اِسلامی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ لیکن اِس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوا، کہ ''اخوان المسلمون'' کا جو عملاً منشور ہے وہ دیگر ممالک کی اِسلامی تنظیموں میں نہیں ملتا۔ جبکہ ضرورت ہے کہ یہ منشور اپنا کر ایک اِسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی جائے۔

Marfat.com

۴

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۹۰۳ء تا ۱۹۷۹ء

سید ولی رضا نصر

مولانا مودودیؒ کی شخصیت، نظریات اور عالمِ اسلام پر اُس کے اثرات پر یہ مضمون جناب سید ولی رضا نصر کا مرہون ہے۔ جو یقیناً ایک سکالر ہونے کے علاوہ جماعتِ اسلامی سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اصل کتاب سے یہ معلوم نہ ہو سکا، کہ آیا آپ پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش میں سے کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم آپ کو اُردو زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ اِس مضمون کی تیاری میں انگریزی اور اُردو کتابوں کے ۷۰ سے زائد حوالہ جات ہیں، جن میں مولانا مودودیؒ کی تمام مطبوعات کے حوالہ جات کے علاوہ متعدد مغربی مصنفین کی انگریزی مطبوعات ہیں اور متعدد آپ کی ذاتی زندگی پر اُردو میں ہیں۔ اِن اہم انگریزی مطبوعات اور اُن کے مصنفین اور اُردو کتابوں کے نام ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔ جن سے نہ صرف آپ کی عالم گیر شخصیت اور نظریات کا علم ہو سکے گا بلکہ اثرات کا بھی۔

1) The Islamic Threat: Myth or Reality
(By John L. Esposito)

2) Mawodoodi and the Islamic State
(By John L. Esposito)

3) Radicals Islam: Modiveal Theology & Muslim Politics

Marfat.com

(By Emmavel Siuan

4) Islamic Militancy and Social Movement

(By Saiduddin Ibrahim)

5) Islamic Resurgence in the Arab World

(By Ali E. Hillal Dossuki)

6) Fundamental Influence in Egypt

(By Abdul Azim Ramadan)

7) Fundamentalists and the State

(By Martin E. Marty and Robert S. Apple-----)

8) Long March from Lahore to Khartoum

(By Abdul Wahab El-Affendi

9) Islam and Resistance in Afghanistan

(By Oliver Roy)

10) Islamic Resistance in Malaysia

(By Zainab Anwer - Kualalumpur

11) Jamaat-i-Islamia of India and Bangladesh

(By Visllette Graffe)

12) Jamaat-i-Islami and Tablighi Jamaat

(By Martin K. Marty and Robert S. Applet)

13) Maudoodi - Thought and Movement

(By Syed Asad Gilani)

14) The Ideology of Maulana Maudoodi

Marfat.com

(By Charles Adams)

15) Vanguard of Islamic Revolution

(By Vali Reza Nasr)

16) An Islamic Vision of Islamic & Islamic Revolution

(By Khurshid Ahmed & Zafar Ishaq......)

17) Three Eminent Ulema

(By Chrbtian W. Traee)

اور یہ ہے ذیل میں اُردو مطبوعات کی فہرست جو آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں مختلف اصحاب کی تصنیف ہیں:

۱) ہمارا خاندان (ابومحمود مودودی)

۲) خودنوشت (سید ابوالاعلیٰ مودودی)

۳) مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں (محمد یوسف بھٹہ)

۴) مفکرِ اسلام (منظور الحق)

۵) ایوب خان، مولانا مودودی اور میں (الطاف گوہر)

۶) پھر مارشل لا آ گیا (پروفیسر عبدالغفور)

۷) اور لائن کٹ گئی (کوثر نیازی)

۸) ذوالفقار علی بھٹو (کوثر نیازی)

۹) حیاتِ جاوداں (عبدالغنی فاروق)

۱۰) مردِ حق آگاہ (محمد احمد اللہ والا)

۱۱) ہمہ پہلو شخصیات (جمیل احمد رانا اور سلیم منصور خالد)

۱۲) تصوف اور تعمیر سیرت (عاصم نعمانی)

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی زندگی پر آپ کی پیدائش، بچپن اور وفات تک پر

Marfat.com

سید ولی رضا کا یہ مضمون جس کا آغاز شروع سے مولانا کی زندگی، دین کے ساتھ سیاست سے جُدا نہیں ہے، لیکن ایک اہم وجہ خداداد صلاحیتوں کے ساتھ آپ کے آباؤ اجداد کا سلسلۂ ''تصوف'' سے منسلک ہونا ہے۔ جبکہ اِسے مقامِ تعجب کا نام دیا جانا چاہئے یا مشیتِ ایزدی، کہ اِس کتاب کی تحریکِ احیائے اسلام کی تمام شخصیات جن میں پانچ سنی مسلک اور تین شیعہ مسلک، اپنے اپنے طور سبھی سلسلہ ''تصوف'' سے منسلک نظر آتی ہیں۔ اور سبھی کا تعلق درمیانہ درجہ کے شرفا سے ہے۔ جبکہ اسلام کی یہ بھی ایک خوبی ہے، کہ دعوتِ دین کے کام کے لیے جو شخصیت آگے نظر آتی ہے، وہ خداداد صلاحیتوں کے ساتھ درمیانہ درجہ کے طبقہ سے شرفا خاندان کی ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا مودودی کے والدِ گرامی سید احمد حسن مودودی کی زندگی انتہائی پاکیزہ اور صوفیانہ ہے۔ جو سر سید احمد خان کے قائم کردہ مسلم اینگلو اورینٹل کالج، علیگڑھ کے گریجوایٹ تھے، جسے اُس وقت تک یونیورسٹی کا درجہ نہیں ملا تھا۔ لہٰذا آپ یہاں سے گریجوایٹ ہو کر الہ آباد آئے اور یہاں سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر طرح کے عالمانہ و فاضلانہ علوم حاصل کرنے کے حامی تھے، جو اُس دور کے دینی خاندانوں میں معدوم تھا۔ اِس لحاظ سے مولانا مودودی کی پیدائش اُس دور میں اُس گھر میں ہوئی، کہ جس میں عربی اور فارسی زبانوں سے ہٹ کر انگریزی زبان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن آپ کے والد نے نہ صرف انگریزی زبان میں گریجوایشن کی، بلکہ ''لاء'' کی ڈگری بھی حاصل کی، اور مولانا مودودیؒ نے کسی معروف تعلیم گاہ میں تعلیم حاصل کیے بغیر محض اپنے گھریلو علمی ماحول اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے تحریکِ احیائے اسلام کا نمایاں لیڈر ہونے کے لیے عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی چاروں اہم زبانوں پر عبور حاصل کیا۔

ایک ''صوفی'' کی زندگی اِس خصوصیت کی مالک ہوتی ہے، کہ بلا تعصب ہر کسی کے لیے محبت اور نہایت خاموشی سے شب و روز عابدانہ ہو۔ جبکہ اِس دور میں ضرورت تھی، کہ کفر و لادینیت و الحاد کے خلاف پاکیزہ ''صوفیانہ'' کے ساتھ ایسی شخصیتیں اُبھریں۔ جو کفر کی تمام تر مادی طاقت کے باوجود بلا کسی اسلحہ نا قابلِ شکست چیلنج ہوں۔

جس دور میں یہ تمام شخصیات منصۂ شہود پر آئی ہیں، یہ وہ دور ہے، کہ اسلام ہر جگہ انتہائی

Marfat.com

مظلوم نظر آتا ہے، جبکہ اِسلام تمام دُنیا کے لیے اپنے غلبہ کے ساتھ عملاً امن کا پیغامبر ہے۔ لیکن اِسے اُمتِ مسلمہ کی بدقسمتی قرار دیا جائے، یا بحیثیت مجموعی اُس کا اپنے آپ کو ہر جگہ اغیار سے چند ہزار اپنے جلب زر کی تعداد میں اقتدارِ ہوس کے حوالہ کر دینا۔ جو

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کا مصداق نہ ہوں۔ جن کو غیرت و شرم تک کی ہوا تک نہ لگی ہو۔

ایسے میں ''تحریک احیائے اسلام'' کا غالب آنا یقیناً ایک طویل عمل ہے، جو سید جمال الدین افغانی کے دور سے ۱۸۳۸ء سے شروع ہو کر اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، کہ مقابلہ اغیار سے کم، بحیثیت مجموعی اُمتِ مسلمہ کی ماسوائے اِسلام اور اِسلامی تعلیمات سے بے خبری اور ثالثاً ہر جگہ جلب زر اور اقتدار کے دل دادہ جبکہ یہ طبقہ بالخصوص اُمتِ مسلمہ کی مظلومیت کا ذمہ دار ہے۔ جسے قوم و ملت سے غدارانہ عمل کہا جائے گا، کہ جس قوم میں ایک شخص کی غداری بھی تمام قوم کی غلامی اور مظلومیت کا باعث ہو سکتی ہے، جیسا کہ علامہ اقبالؒ کے اِس شعر سے ظاہر ہے

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگِ دیں، ننگِ زمیں، ننگِ وطن

اور اسی طرح پہلی جنگ عالمگیر میں شریف مکہ کی خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت، کہ اِن تین افراد کی غداری نے مراکش تا برصغیر ہند دو صد سال سے زائد عرصہ کے لیے کروڑوں مسلمانوں کے گلے میں ایک لاکھ سے بھی کم تعداد کی فوج کی غلامی کا پھندا ڈال دیا، جس کی دُنیا میں کوئی مثال نہیں، اور جب آمریت کی شکل یا جمہوریت کے نام پر چند ہزار غدار اغیار کو مل جائیں، ایسے میں تحریک احیائے اسلام کے لیے بلا کسی اسلحہ اغیار کے خلاف مقابلہ کتنا طویل ہو گا، از خود کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ تاہم اِن مقتدر شخصیات نے تحریک احیائے اسلام کی جو بنیاد رکھی وہ بھی علامہ اقبال کے اِس شعر کے مصداق ہے

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، چراغ اپنا جلا رہا ہے

Marfat.com

وہ مردِ کامل کہ جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ مومنانہ

کہ تحریکِ احیائے اسلام میں مولانا مودودی کی شخصیت از منڈاناؤ Mindanao (فلپائن) تامراکش اتنی معروف ہو چکی ہے، کہ دیگر کوئی شخصیت اُن کی مقابل نہیں، اِس کے باوجود دیگر شخصیات بھی کم اہم نہیں ہیں۔ جبکہ سید قطب شہیدؒ اور دیگر اِسلامی ممالک کی اِسلامی تحریکیں بھی بیشتر طور پر مولانا مودودی کی تحریک کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی شخصیت اور آپ کی جماعتِ اسلامی کے اثرات:

آپ کی شخصیت کا تو بعدازیں تفصیل سے ذکر کیا جائے گا، لیکن آپ کی قائم کردہ جماعتِ اسلامی کا اولاً مختصر بیان کیا جاتا ہے۔ آپ نے جس انداز میں اِسلام کی ترجمانی کی ہے، اُس نے آپ کی ہم عصر دیگر اِسلامی تحریکوں کو بھی تقویت بخشی ہے۔ بالخصوص جنوبی ایشیا میں آپ کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں (غالباً اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن ممالک میں انگریزی زبان ملکی زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے جبکہ مولانا مودودیؒ کی تمام تصانیف کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے) آپ کی قائم کردہ تنظیم جو آپ کے خیالات اور نظریات کا مظہر ہے، اور جس کا نام جماعتِ اسلامی ہے اور جسے قائم ہوئے ساٹھ سال سے زائد عرصہ ہو چلا ہے۔ پاکستان، اِنڈیا، بنگلہ دیش، سری لنکا کے علاوہ خلیجی ریاستوں اور یورپ کے ممالک میں بھی اِسی نام سے اُس کی بڑی مؤثر شاخیں ہیں۔ جبکہ آپ کی اور آپ کی جماعت کے کارکنوں میں ذہنی فکر کے ساتھ سیاسی سوجھ اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب اور ایک غلام قوم کو اس سوچ وفکر کے ساتھ آزادی سے ہمکنار کرنا لازمی امور ہیں، جو ایک طویل جدوجہد کی متقاضی ہیں۔

اِسلامی انقلاب کے بعد اسلامی ریاست کے قیام کے بارے میں آپ کی سوچ اور میدانِ سیاست میں جماعتِ اِسلامی کا کردار یہ تمام ایسے امور ہیں، جو اِس مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی زندگی، تعلیم اور تحریک احیائے اسلام:

آپ انڈیا کی ریاست حیدر آباد (دکن) کے شہر اورنگ آباد میں ۲۵ ر ستمبر ۱۹۰۳ مطابق

Marfat.com

۳ رجب ۱۳۲۱ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا خاندان ''شرفا'' کا خاندان شمار ہوتا تھا، جو دہلی سے تارکِ وطن ہو کر مسلمان ریاست حیدر آباد (دکن) میں منتقل ہو گیا تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب صوفیائے کرام کے چشتی خاندان سے جا ملتا ہے، جنہوں نے اِنڈیا میں اِسلام کے بیج بوئے، جنہوں نے مغلیہ خاندان کی بادشاہتوں میں ملازمت کی خدمات سر انجام دیں اور آخری مغل فرماں روا ابوظفر بہادر شاہ کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر متعین تھے۔ ۱۸۵۷ء کے نام نہاد ''غدر'' کے نام پر مسلمانوں کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجہ میں جہاں اِس سے قبل آپ کے جدِّ اعلیٰ کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ سبکدوش ہو کر بڑے مصائب کا شکار ہو گئے، مسلمان حکمرانوں کے دور میں آپ کے آباؤ اجداد کا خاندان جو صوفیا اور اولیاء کرام کا خاندان تھا، اور عوام مسلمانوں میں اُن کی عزت و احترام تھا، وہاں اپنے علم کی وجہ سے بلند عہدوں پر فائز ہوتے تھے، لہٰذا مغلیہ خاندان کی حکومت کے خاتمہ کے باوجود اُن میں جو تصوف کی وجہ سے برطانوی حاکمیت کو دِل و ضمیر سے قبول نہ کر سکے، اور یہ خاندان دہلی سے منتقل ہو کر حیدر آباد (دکن) آباد ہو گیا اور یہاں منتقل ہو کر نظام حیدر آباد کی ملازمتیں اختیار کر لیں۔ مولانا مودودی کی ننھیال بھی شمالی ہند سے تھیں اور وہ بھی حیدر آباد میں آباد ہو گئی تھیں۔ اِس لحاظ سے صدیوں سے آپ کے آباؤ اجداد کا مسلمان حکمرانوں کی عزت مندانہ خدمات، ان کی برصغیر کے بلند مرتبہ ولی اللہ خواجہ معین الدین چشتی کی ذریت ہونا یہ سب ایسی باتیں تھیں، جو کسی کافر اور غیر ملکی حکمرانی کو دل سے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ خاندان کی برطانوی حکمرانی آبائی نفرت نے بھی آپ کو کسی طرح کی غلامی قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔

قبل ازیں آپ کے والد سید احمد حسن سے وراثتاً گھریلو تعلیم کے ذریعہ علمی وراثت کا آپ کی زندگی میں منتقل ہونے کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ گھر پر ہی آپ عربی اور فارسی زبانوں پر حاوی ہو چکے تھے، یہاں تک کہ چودہ سال کی عمر میں آپ نے مصری مصنف قاسم امین کے عربی کتابچہ ''المرأۃ الجدید'' Madern Woman کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا (جو آپ پر خداداد عنایت کی ترجمانی کہی جا سکتی ہے) تاہم گیارہ سال کی عمر میں آپ کو اورنگ آباد کے مقامی سکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں آپ نے پہلی مرتبہ جدید علوم بالخصوص سائنسی علوم کی تعلیم حاصل کی۔

Marfat.com

لیکن آپ ابھی زیرِ تعلیم تھے اور آپ کی عمر سولہ سال تھی کہ آپ کے والد گرامی بیمار ہو کر وفات پا گئے اور آپ کو سکول کی تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔ تاہم اِس سے آپ کا علمی ذوق متاثر نہیں ہوا اور آپ نے معمول کی دینی تعلیم کی بجائے سیاسی ذوق اپنایا۔ اُن دنوں انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے انڈین نیشنلزم کی تحریک زوروں پر تھی اور آپ بھی اُس سے متاثر ہوئے۔ اور ۱۹۱۸۔۱۹۱۹ میں انڈین نیشنلزم کے حق میں مضامین تحریر کرنے شروع کیے، حتیٰ کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالویہ کی تعریف میں بھی مضامین لکھے۔ ۱۹۱۸ء میں آپ اپنے بڑے بھائی ابو الخیر صاحب کے پاس بجنور چلے آئے اور یہاں آکر باقاعدہ صحافت کا آغاز کیا۔

تھوڑا عرصہ بعد دونوں بھائی دہلی چلے آئے، اور یہاں مسلمانوں کا جو معروف علمی طبقہ تھا، اُس سے تعلقات قائم کیے اور اُن کے ساتھ آزادی کی تحریک میں شریک ہو گئے۔ اُن دِنوں جبل پور (جواب مدھیہ پردیش کا شہر ہے) سے کانگریس کا حامی ہفت روزہ ''تاج'' شائع ہوتا تھا۔ آپ ۱۹۱۹ء میں جبل پور چلے آئے اور اِس ہفت روزہ کے ادارتی عملہ میں شامل ہو گئے۔ اُن دِنوں خلافتِ عثمانیہ کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست اور خلافت کے خاتمہ کے نتیجہ میں تحریک ''خلافت'' شروع ہو چکی تھی، اور آپ کانگریس کی حمایت میں لکھ رہے تھے، کہ یہ ہفت روزہ بحران کا شکار ہو کر بند ہو گیا اور آپ دہلی چلے آئے اور یہاں تحریک خلافت اور تحریک کے سربراہ مولانا محمد علی جوہر اور دیگر رہنماؤں سے ذاتی تعلقات قائم ہوئے اور ایک مختصر عرصہ روزنامہ ''ہمدرد'' جو مولانا محمد علی کی ملکیت تھا۔ اُس سے تعاون کیا۔ لیکن اِس کے بعد آپ پر نیشنلزم کی بجائے دینی جذبات غالب آ گئے۔

تحریکِ خلافت کے بعد اِنڈیا میں مسلمانوں میں ''تحریک ہجرت'' کا آغاز ہوا کہ بعض علماء نے انڈیا پر انگریزوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے انڈیا کو ''دارالحرب'' قرار دیا اور فتویٰ جاری کیا کہ مسلمان ''دارالحرب'' سے ہجرت کر کے کسی مسلمان ملک ہجرت کریں۔ کیونکہ افغانستان ایک ہمسایہ مسلم ملک تھا۔ لہٰذا اِس فتویٰ کے نتیجہ میں اکثر مسلمان اِنڈیا سے افغانستان ہجرت کر گئے۔

یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے، اُن دنوں مسلمانوں میں ایک دینی جماعت ''جمعیۃ العلمائے

Marfat.com

ہند'' بھی سیاسی طور پر میدانِ عمل میں تھی، جس کے لیڈر مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید تھے، اور وہ مولانا مودودی کی صحافتی تحریروں سے متاثر ہوئے اور آپ کو اپنے روزنامہ ''مسلم'' اور بعدازاں ''الجمعیۃ'' کی ذمہ داریاں سپرد کر دیں۔ آپ نے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۴ء یکے بعد دیگرے جمعیۃ العلمائے ہند کے ان اخبارات کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ جس کے نتیجہ میں آپ کا سیاسی ذہن پختہ ہو گیا اور کھل کر دینی شعور کے ساتھ سیاست میں حصہ لینے لگے۔ جن میں آپ کے سامنے اہم موضوعات برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل، تُرکیہ سے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اُس پر یورپی سامراج کی بالادستی اور برصغیر میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کی یادیں تھیں۔ اگرچہ اِن تحریروں میں لہجہ قدرے سخت تھا، لیکن اُن میں احیائے اسلام کا تصور نہ تھا۔

دہلی میں قیام نے آپ کے علمی ذوق کو جلا بخشی اور آپ نے انگریزی زباندانی پر عبور حاصل کرنے کے علاوہ اِس قوم کی سیاست اور اسلام دشمنی کا مطالعہ کیا، جبکہ جمعیۃ العلمائے ہند کے ساتھ تعلق نے دینی تعلیم پروان چڑھائی، جس میں آپ نے ''درسِ نظامی'' جو گزشتہ ڈیڑھ صدی سے دینی مدارس کا نصاب بن چکا تھا۔ اُس کی تعلیم بھی حاصل کرنی شروع کر دی۔ اِس میں آپ کے اول اُستاد عبدالسلام نیازی تھے، بعدازاں دہلی میں فتح پور سیکری مسجد کے دیوبندی سکول میں تکمیلِ علم کرنے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں اس ادارہ سے ایک ''عالم'' کی سند جسے ''اجازت'' کا نام دیا گیا ہے، ملی اور اِس طرح آپ باقاعدہ ایک ''عالمِ دین'' ہو گئے۔ لیکن آپ نے زندگی بھر ''عالم'' ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، تا آنکہ آپ کی وفات کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ آپ دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ آپ کے بارے میں آپ کے بیشتر مورخ یہی رائے رکھتے ہیں، کہ محض آپ ایک صحافی تھے اور دینی تعلیم خود اپنی ذہنی محنت تھی۔

۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد آپ کی زندگی نے ایک نیا رُخ اختیار کیا اور مسلمان ممالک تُرکیہ اور مصر میں ''اخوۃ اسلامیہ'' ترک کر کے قوم پرستی نے جنم لے لیا تھا۔ نہ صرف اِن ممالک میں اِس کو سختی سے مسترد کر دیا، بلکہ برصغیر میں اِنڈین نیشنلزم کے نام پر کانگریس پارٹی ہندو مسلمانوں کو ایک قوم بنا کر جو سیاست کھیل رہی تھی اُسے بھی مسترد کر دیا کہ یہ پارٹی ایک ہندو

Marfat.com

جماعت ہے۔ جو مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنا کر ہندو بالادستی چاہتی ہے۔ اِس کے بعد جمعیۃ العلمائے ہند کے مخالف ہو گئے۔ جو بزعمِ خود برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہی تھی، لیکن برطانیہ کے رُخصت ہونے کے بعد انڈیا میں ہندوؤں کی حکومت کی علمبردار تھی۔ کانگریس پارٹی کی حمایت سے انکار آپ کا دیوبندی علما سے اختلاف کا باعث بن گیا، جو انڈین نیشنلزم کے نام پر ہندوؤں کے ہم نوا تھے۔ تاہم جمعیۃ العلماء سے علیحدگی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ برطانوی راج کے بھی حق میں ہیں۔ بلکہ اپنے بارے میں یہ واضح کر دیا کہ آپ اولاً اور آخراً ایک مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے مفاد کی خاطر دونوں کے خلاف صف آرا ہوں گے۔ دوسرے معنوں میں اِس کا یہ مطلب تھا کہ آپکے سامنے اب احیائے اسلام مقصد تھا اور دینی اور سیاسی دونوں پلیٹ فارموں پر کام کرنا ہے۔

جہاں ایک طرف برطانیہ کے خلاف کانگریس کے پلیٹ فارم سے انڈین نیشنلزم کے پردے میں مکار برہمنیت مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا اِنسان سمجھتی تھی۔ وہاں نیچی جاتی کے ہندو "شودر" لوگوں میں اِسلام مقبول ہو رہا تھا اور وہ اِسلام قبول کر رہے تھے، جو کٹر ہندو لیڈروں کو منظور نہ تھا، ایسے میں ایک کٹر ہندو لیڈر سوامی شردھانند نے اُن نومسلم ہندوؤں کے خلاف تحریک چلائی کہ وہ دوبارہ ہندو مت اختیار کریں اور اِس تحریک میں وہ حضورِ اکرم ﷺ کی شان میں اور اِسلام کے خلاف گستاخانہ الفاظ استعمال کرنے لگا۔ جس پر مشتعل ہو کر ایک مسلمان نے ۱۹۲۵ میں اُسے قتل کر دیا۔ سوامی کے قتل پر انڈین پریس نے، جس پر ہندو حاوی تھے، بحیثیت مجموعی اسلام کو تشدد اور ظلم کا مذہب قرار دیا۔ جسے مولانا محمد علی جوہر جیسے مسلمان لیڈر برداشت نہ کر سکے، اور آپ نے مسلمان اہلِ قلم افراد سے اپیل کی کہ "ہے کوئی! جو اُن کو منہ توڑ جواب دے سکے۔" ایسے میں آپ کی وہ خداداد صلاحیت تھی، کہ آپ نے مشہورِ زمانہ کتاب "الجہاد فی الاسلام" تصنیف فرمائی، جس کے تراجم عربی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں، اور اِس کا جواب مغربی مفکرین کے پاس بھی نہیں جو اسلام کو تشدد کا مذہب قرار دیتے ہیں، کہ اسلام میں "جہاد" کا کیا مطلب ہے اور امن و جنگ کے کیا قوانین ہیں۔ غیر مسلموں کے "جہاد" کے بارے میں ناشائستہ اور غلط زبان کے استعمال کے جواب میں یہ اِسلام کی اہم ترین کتاب ہے،

Marfat.com

جو اُردو میں تحریر کی گئی اور عربی اور انگریزی زبانوں میں دُنیا بھر کے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم معترضین نے اسکی پذیرائی کی اور اِسکے ساتھ ہی اُمتِ مسلمہ کی لیڈر شپ کی خصوصیات بھی آپ کی شخصیت میں نمایاں ہوگئیں، اور آپ نے اِسکے بعد اپنی زندگی اِس مقصد کے لیے وقف کر دی، کہ دینی اور سیاسی شعبوں میں اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل حل کرنے میں کیا راہ اختیار کی جائے۔

۱۹۲۸ء میں ایک بار پھر واپس حیدر آباد چلے آئے اور مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین تحریر میں لانے کا سلسلہ شروع کیا۔ مزید برآں عربی زبان کی بعض فلسفیانہ کتب کا اُردو ترجمہ کیا۔ ریاست حیدر آباد کی تاریخ مرتب کی، اور نظامِ حیدر آباد کی تجویز پر آپ نے مسلمانوں میں اسلام کی صحیح تعلیمات پر مطبوعات تحریر میں لانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں اہم ترین کتابچہ رسالہ ''دینیات'' ہے، جس کا انگریزی ترجمہ Towards Understanding Islam ہے۔

(نـــوٹ:...... اصل اُردو کتابچہ اور اِس کے انگریزی تراجم سالِ اشاعت غالباً ۱۹۳۰ء سے نہ صرف اِن دو زبانوں میں لکھوکھا کی تعداد میں شائع ہو کر کئی لاکھ افراد نے قبولِ اسلام کیا، بلکہ اِس کے علاوہ بھی ۳۰ سے زائد زبانوں میں تراجم شائع ہو کر اپنے اپنے ممالک میں وسعتِ اسلام کا باعث ہوا۔)

خود راقم الحروف کی اِن بارے میں یہ مثال ہے کہ ۵۳-۱۹۵۱ء میں جنوبی کوریا جو دوسری عالم گیر کے خاتمہ کے بعد امریکی مقبوضہ تھا، اُس پر ۱۹۵۱ء میں شمالی کوریا نے اپنے ساتھ متحد کرنے کے لیے رُوس اور چین کی حمایت پر حملہ کر دیا۔ اِس جارحیت کے خلاف امریکہ کی مدد کے لیے ترکیہ کی حکومت نے تبلیغ اسلام کے لیے نہیں، امریکہ سے کچھ مالی مدد حاصل کرنے کے لیے ایک تُرک بریگیڈ امریکہ کی مدد کے لیے جنوبی کوریا بھیج دیا۔ یہ اِس سرزمین پر کسی مسلمان جماعت کا پہلا قدم تھا، جبکہ جنگ شرکی دو قوتوں کے درمیان تھی۔ جنگ ۱۹۵۳ء میں شمالی کوریا کی ناکامی پر ختم ہوگئی اور شمالی کوریا کی افواج واپس ہوگئیں۔ جبکہ جن ممالک کی افواج امریکہ کی مدد کے لیے جنوبی کوریا گئی تھیں۔ دوسرے ممالک سمیت تُرک بریگیڈ بھی وہاں مزید دس سال مقیم رہا۔ اِس تُرک بریگیڈ کے ہمراہ دو تُرک امام عبدالرحمان اور زُبیر قوچ بھی تھے اور انگریزی زبان

Marfat.com

جانتے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد حالتِ امن میں یہ بریگیڈ جنوبی کوریا کے دارالخلافہ سیول میں مقیم تھا۔ چنانچہ جو تُرک فوجی مسلمان ہونے کی وجہ سے نمازوں کے پابند تھے، وہ اِن اماموں کی امامت میں پنج وقتہ نمازوں کے پابند تھے، جو سیول کے کسی پارک میں نماز ادا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا، کہ کوریا کے لوگوں نے نہ صرف مسلمانوں کو دیکھا، بلکہ بڑی خاموشی سے ایک امام کے پیچھے بڑے ڈسپلن کے ساتھ عبادت کرتے دیکھا۔ نہ صرف دن میں ایک مرتبہ، بلکہ بعض وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے راہِ ہدایت بخشی تھی، اُنہوں نے ہر روز کئی مرتبہ اِن غیر ملکی فوجیوں کو یہ عمل کرتے دیکھا۔ تو اُن میں سے بعض تعلیم یافتہ افراد نے اماموں سے رابطہ قائم کیا اور اُن سے اُن کے دین یعنی اِسلام اور عبادات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں، اور حضرت محمد ﷺ اُس خدا کے آخری پیغمبر ہیں جو انسانوں کو اُس خدا تعالیٰ کا فرماں بردار بنانے اور راہِ ہدایت دکھانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور تمام انسان مرنے کے بعد دوبارہ اپنے اچھے اور بُرے اعمال کی جوابدہی کے لیے اُٹھائے جائیں گے اور جو انسان اِن تین باتوں پر ایمان کے ساتھ نیک اعمال کریں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو بُرے اعمال کریں گے خواہ وہ زبانی ایمان رکھتے ہوں، اُن کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

اِن سادہ تعلیمات کے ساتھ بعض نے اِسلام قبول کر لیا، اور آہستہ آہستہ اُن کی دیکھا دیکھی جن کی قسمت میں ایمان لکھا تھا وہ اسلام قبول کرنے لگے۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ میں اپنے کاروبار کے ساتھ جماعتِ اسلامی کے اخبار روزنامہ ''تسنیم'' کی منڈی بہاؤالدین میں رپورٹنگ کرتا تھا کہ ایک اشاعت میں میں نے کوریا سے تُرک امام کے ایڈریس کے ساتھ اُسے انگریزی میں اِسلامی لٹریچر اِرسال کرنے کی اپیل پڑھی۔ جو تُرکیہ سے دستیاب نہیں تھا۔ یہ اپیل ''تسنیم'' کے علاوہ دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ سعادت صرف اِس خاکسار کو حاصل ہے کہ یہ اپیل پڑھ کر میں نے امام زبیر قوچ کو Towards Understanding Islam کے چھ نسخے اِرسال کر دیئے۔ جو اُس نے اکنالجمنٹ کے ساتھ بڑے پسند کیے اور ساتھ یہ لکھا کہ جب تک بریگیڈ کوریا میں مقیم ہے، میں اُن کو مزید اِسلامی لٹریچر

Marfat.com

ارسال کرتا رہوں اور مراسلت کا سلسلہ قائم رکھوں۔ جو نہ صرف میں نے بریگیڈ کے قیام تک دس سال جاری رکھا، بلکہ بعدازاں وہاں اسلام اتنی تیزی سے پھیلا، کہ دورِ حاضر میں اُس کی کوئی مثال نہیں۔ اِس میں کئی امور قابلِ ذکر ہیں۔

۱) جب تُرک امام کو Towards Understanding Islam کا پہلا پیکٹ ملا۔ تو فوراً اِس کا کورین زبان میں ترجمہ کر کے کورین نومسلموں نے بڑی تعداد میں پھیلایا۔

۲) ۱۹۶۰ء میں سیول شہر میں ایک بڑی مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ جس کی تعمیر میں راقم الحروف نے بھی کچھ ڈالرز سٹیٹ بنک آف پاکستان کی منظوری سے اِرسال کیے کہ اُن دنوں ایک ڈالر کی رقم بھی باہر نہ بھیجی جا سکتی تھی۔ جبکہ اُن دنوں پاکستانی کرنسی اتنی مضبوط تھی کہ ایک ڈالر ساڑھے چار روپے کے برابر تھا۔

۳) کورین اِسلامی سوسائٹی نے مجھے سیول کی زیرِ تعمیر مسجد کی چند تصاویر اِرسال کیں، جواب بھی میرے پاس موجود ہیں۔

۴) سیول کی یہ پہلی سنٹرل مسجد آج انتہائی وسیع خوبصورت مسجد کا بہترین نمونہ ہے۔

۵) تُرک بریگیڈ کے قیام کے دوران ہی اتنی زیادہ تعداد میں کورین غیر مسلموں نے اِسلام قبول کر لیا تھا، کہ اُنہوں نے ''کوریا اِسلامک سوسائٹی'' قائم کر لی تھی۔ اِسکے صدر کا اِسلامی ''عمر کم جن کیو'' Umar Kingjin Kyu تھے، اور بعدازاں فریضہ حج ادا کرنے کے بعد Haji Umar Kinjin Kyu کہلائے۔

۶) کوریا اسلامک سوسائٹی بعدازاں کوریا مسلم فیڈریشن بن گئی۔ جس نے نومبر ۲۰۰۵ء میں کوریا میں اشاعتِ اسلام کی پچاسویں گولڈن سال گرہ منانے کے لئے سیول کے سب سے بڑے ہوٹل میں اہتمام کیا۔ جس میں

Marfat.com

کوریا میں ۳۰ اِسلامی ممالک کے سفیروں نے شرکت کی۔ اُس میں راقم الحروف اور تُرک امام زبیر قوچ خصوصی مدعوئین تھے اور ہم دونوں شامل ہوئے، اور مجھے خطاب کرنے کا موقعہ ملا۔

۷) سال گرہ کے موقعہ تک کورین نومسلموں کی تعداد ۴۵ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی، اور مختلف شہروں میں آٹھ خوبصورت مساجد کی تعمیر ہو چکی تھی جبکہ نویں مسجد کا افتتاح سال گرہ کے موقعہ پر ہوا۔

۸) کوریا میں کورین نومسلموں کے علاوہ ایک لاکھ سے زائد غیر ملکی ملازم پیشہ مسلمان ہیں، جن میں اکثریت بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی ہے۔ جبکہ نویں مسجد کی تعمیر بھی زیادہ تر بنگلہ دیشی مسلمانوں کے تعاون سے ہے۔

۹) سیول میں ''ہانکوک یونیورسٹی'' Hankuk University بڑی یونیورسٹی ہے۔ جس میں نومسلم کورین مسلمانوں کی اولاد نے ینگ مسلم فیڈریشن قائم کی ہے۔

۱۰) بالآخر کورین نومسلموں کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کوریا میں اشاعتِ اسلام میں Towards Understanding Islam کا بڑا حصہ ہے، جس کا کورین زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ آج کل کوریا مسلم فیڈریشن کے پریذیڈنٹ حاجی عبدالرازق سوہن Haji Abdul Raziq Sohan ہیں۔

مولانا مودودیؒ کے بارے میں ''کوریا میں اشاعتِ اسلام'' کا ذکر Towards Understanding Islam کے حوالہ سے ضروری تھا۔ اب مولانا کی زندگی کے بارے میں تحریر کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔

رسالہ ''دینیات'' ۱۹۲۸ء میں دہلی سے حیدر آباد منتقل ہونے کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوا۔ غالباً ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کے عرصہ میں شائع ہوا۔ جبکہ انگریزی ترجمہ کے پہلے ایڈیشن

Marfat.com

کے سالِ اشاعت بھی معلوم نہیں۔لیکن ''اُردو'' سے زیادہ انگریزی ترجمہ نے اشاعتِ اسلام میں جو کام کیا ہے اُس کی مثال نہیں اور نہیں معلوم کتنے اشاعتی ادارے اپنے طور انگریزی ترجمہ شائع کررہے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ امریکہ میں دوتین ادارے یہ ترجمہ شائع کررہے ہیں۔

حیدرآباد (دکن) میں آپ کا قیام ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۸ء غالباً دس سال رہا، اور اِس عرصہ میں آپ کی سوچ کا محور نہ صرف زوالِ اسبابِ اُمت سمجھنے اور خود اُن اسباب کی روشنی میں دوبارہ اِسلام کے عروج کے لیے راہ ہموار کی جائے، اور اِس مقصد کے حصول کے لیے آپ نے اپنی تمام زندگی وقف کردی۔ آپ نے اپنی داڑھی بڑھالی اور اپنا لباس بھی برصغیر میں رائج اِسلامی لباس اپنا لیا جسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں جبکہ آپ نے اِسلام کو زبانی کلامی نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر دل ونگاہ سے صحیح طور پر قبول کرلیا تھا۔ جس میں ایک نئی سوچ وفکر تھی اور اِس سے ملکی اور بین الاقوامی سیاست اِسلامی نقطہ نگاہ سے خارج نہ تھی۔

اِس دورانِ قیام حیدرآباد (جیسا ہندو نیشنلزم خوب زور پکڑتی جارہی تھی) آپ نے اندازہ لگالیا تھا، کہ ریاست کا مستقبل غیریقینی ہے۔ اُس کی اکثریتی ہندو آبادی میں نظام اور مسلمانوں کے خلاف بے چینی بڑھتی جارہی تھی، اور نظام کا اقتدار ڈھیلا پڑتا جارہا تھا۔ آپ نے ریاست میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب بھی معلوم کرنے کی کوشش کی، اور کوشش کے بعد معلوم پایا کہ یہاں کے مسلمانوں نے صدیوں کے غیر اِسلامی رسوم ورواج کے ساتھ بدعنوانیوں کو بھی اُن کے ساتھ شامل کردیا ہے۔ اب اِن خرابیوں کو دُور کرنے کا ایک حل یہ ہے، کہ ریاست میں جو ادارے اِسلام کے نام پر کام کررہے ہیں اور اُن میں ہر طرح کی خرابیاں جڑ پکڑ گئی ہیں، اُن کو پاک کیا جائے، چنانچہ آپ نے نظام کو اِن اداروں کی اصلاح کیلئے مناسب تجاویز دیں جو اِسلام کے تقاضوں کے مطابق تھیں۔ ایک بدعنوان نوکر شاہی کیسے ایسی اصلاحات روا رکھ سکتی ہے؟ چنانچہ نظام کی حکومت نے اِن سفارشات کو اپنانے سے انکار کردیا۔ جس نے آپ کو بددِل کردیا اور محسوس کیا کہ مسلمانوں میں جو سیاسی ڈھانچے کام کررہے ہیں، وہ مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی مفادات کا تحفظ کرنے کی بجائے حرص وخودغرضی کا شکار ہوکر نقصان پہنچارہے ہیں۔

Marfat.com

مسلمانوں کے مفاد کے لیے مولاناؒ کے دل میں اِس جذبہ حُریت نے یہ تحریک کی، کہ اُن کے حقوق کا کیسے تحفظ کیا جائے۔ جس کا اوّلین تقاضا یہ ہے، کہ اُن میں جو ہندوؤں کی مشرکانہ اور غیر اسلامی رسوم و رواج داخل ہو گئے ہیں۔ اُن کو دُور کر کے خالصتاً اسلام کے مطابق اُن کو پاکیزہ بنایا جائے۔ یہیں سے آپ کے دل میں یہ تحریک ہوئی، کہ ہندی مسلمانوں کا ایک علیحدہ ملک ہو جو اِسلامی ملک کا مظہر ہو اور دُنیا کے لیے اِسلام کا نمونہ ہو۔

۱۹۳۲ء میں آپ نے حیدر آباد سے ہی ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' شائع کرنا شروع کیا۔ جو آپ کی تاحیات ۱۹۷۹ء زیر ادارت بڑی سرکولیشن کے ساتھ شائع ہوتا رہا، اور اُس کے بعد بھی شائع ہو رہا ہے۔ آپ اب جان چکے تھے کہ برصغیر میں ہندوؤں کی بالادستی کے ساتھ جو سیاسی عمل جاری ہے، محض تحریروں سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے کوئی نتیجہ خیز نہ ہو گا۔ لہٰذا جہاں یہ ضرورت ہے کہ آپ کی یہ تحریریں برصغیر کے گھر گھر جائیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسی تنظیم بھی ہو، جو اُن کے نظریات کو عملی طور پر پروان چڑھائے۔ اِیہ بات ان کے پٹھان کوٹ سے سید ظفر الحسن کے نام ایک خط سے بھی ظاہر ہے جسکی نقل اس تصنیف کے آخر میں ہے۔

ایک علیحدہ خود مختار اِسلامی ملک کا نظریہ علامہ اقبالؒ بھی پیش کر چکے تھے، لیکن وہ ایک مفکر اور شاعر تھے جبکہ ضرورت اِس امر کی تھی کہ کوئی پختہ شخصیت اُن کے نظریات کے مطابق میدانِ عمل میں آئے۔ (نوٹ: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' اُن کے نام باقاعدگی سے جاری تھا اور اُنہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مولانا مودودی کی شخصیت اور نظریات اُن کے خواب کی تعبیر ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا مولانا مودودی کی ملاقات علامہ اقبالؒ سے کیسے ہوئی) چنانچہ مولانا مودودیؒ ۱۹۳۸ء میں پنجاب آئے، لاہور میں علامہ اقبالؒ کی وفات سے قبل مولاناؒ کی اُن سے ملاقات ہوئی اور اُسی سال پٹھان کوٹ کے مقام پر ''دارالاسلام'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ جو ایک علمی ادارہ تھا۔ لیکن یہ محض ایک علمی ادارہ نہ تھا، بلکہ چند افراد کی تعداد کے ساتھ وہ لوگ جو آپ کے نظریات کے ساتھ آپ کے خلوص اور دعوتِ اِسلام سے محبت کا جذبہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے، ترکِ مکانی کر کے پٹھان کوٹ آ گئے اور اِس طرح اِس مقام پر

Marfat.com

ایک اِسلامی برادری کی بنا پڑ گئی، جو بعدازاں ایک اِسلامی جماعت کے قیام کا داعیہ اپنے اندر رکھتی تھی، خواہ اُس کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔لیکن اِس کے ساتھ آپ خاموشی کے ساتھ برصغیر میں مسلمانوں کی سیاست اور اُن کی سیاسی جماعتوں پر بھی کڑی نظر رکھے رہے اور دیکھا کہ ایک طرف تقسیم ہند کے ساتھ تحریکِ پاکستان ہے، جس کی قیادت مسلم لیگ نام کی ایک جماعت میں ہے اور دوسری طرف کانگریس کے حامی مسلمانوں کی ہے اور اُس کے قائدین ''جمعیۃ العلمائے ہند'' اور اُس کے علماء ہیں۔ مولانا مودودی چاہتے تھے، کہ اِن جماعتوں کے قائدین اور برصغیر کے مستقبل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ لیکن محتاط رویہ اپنائے رکھا۔ البتہ کانگریسی علما اور اُن کے خلاف سخت رویہ کا اظہار کیا۔ آپ نے ''جمعیۃ العلما'' کو اِس امر کا ملزم گردانا، کہ اُس نے برصغیر کے مسلمانوں کو برطانوی راج کی مخالفت کے ساتھ دوسری اِسلام دُشمن ملکی نسل پرست ہندو قوم کا ساتھ دیا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ جلد ہی آپ نے مسلم لیگ کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا کہ اِس پر سیکولر ذہن کے مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ جس کے شواہد قیام پاکستان کے بعد فوراً سامنے آگئے اور آج تک مختلف اشخاص کی تبدیلی کے باوجود سیکولر اور زر پرست برسر اقتدار ہیں۔

اب آپ چونکہ پوری طرح میدانِ سیاست میں وارد ہو چکے تھے، لہٰذا ''دارالاسلام'' پٹھانکوٹ قائم کرنے کے بعد آپ کی وہاں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں، تاہم آپ کے نظریات کے جو لوگ وہاں ترکِ مکانی کر کے آبسے تھے، وہ وہاں ہی رہے، اور آپ سیاسی میدان میں زیادہ کام کرنے کے لیے ۱۹۳۹ء میں لاہور چلے آئے، جہاں آپ اسلامیہ کالج لاہور میں اِسلامک سٹڈیز کے پروفیسر ہو گئے، وہاں آپ برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مختلف مجلسوں میں بحثوں میں حصہ لینے لگے۔ اِن مباحث میں حصہ لینے کے بعد آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے نظریات کے مطابق ایک جماعت کا قیام لازمی ہے اور پٹھانکوٹ میں آپ کے ہم خیال افراد پہلے سے موجود ہیں، اور خود بھی وہاں آباد ہو چکے ہیں، لہٰذا آپ نے فیصلہ کیا، کہ اِسلامی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے، چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں آپ نے لاہور میں جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک جماعت قائم کی، جس کے دستور کے مطابق جماغت کا ایک امیر ہوگا،

Marfat.com

جس کی مدتِ امارت چار سال ہوگی۔ اِس طرح آپ ہر چار سال بعد امیر جماعت، جماعت کے دستور کے مطابق منتخب ہوئے، لیکن ۱۹۷۲ء میں آپ نے جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں ادا کرنے سے معذرت کر دی۔

لاہور میں ۱۹۴۱ء میں ''جماعتِ اسلامی'' کے نام سے جماعت قائم کرنے کے بعد آپ نے جلد ہی اِس کا مرکز پٹھان کوٹ منتقل کر دیا۔ جہاں آپ پہلے سے ''دارالاسلام'' نام سے ایک علمی ادارہ قائم کر چکے تھے اور خاصی تعداد میں آپکے رفقا وہاں موجود تھے، اور یہاں سے آپ نے اپنے نظریاتی، سیاسی ڈھانچہ کے ساتھ مستقبل کے لیے جماعت کی عملی پالیسی کا کام شروع کر دیا۔ اگر چہ کسی بڑے پیمانے پر جماعت کوئی بڑی حمایت حاصل نہ کر سکی (نوٹ: ویسے بھی خلوصِ نیت کے ساتھ جو لوگ خوفِ خدا اور خوفِ آخرت لیے اصلاح کے لیے اُٹھتے ہیں وہ چند ہی ہوتے ہیں کہ یہ پیغمبرانہ سنت ہے) لیکن اِس کے باوجود اِنڈیا میں جماعتِ اسلامی کا نام متعارف ہو گیا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ ارا کین جنہوں نے اِنڈیا سے ہجرت نہ کی اور انڈیا میں رہ کر اِسی نام سے بنیادی نظریات کے ساتھ اپنا علیحدہ دستور اور تنظیم کی شکل دے دی، اور ایک وہ ارا کین جو ہجرت کر سکتے تھے اور پاکستان کو ایک اِسلامی ریاست دینے کی عملی جدوجہد کر سکتے تھے وہ مولانا مودودیؒ کی قیادت میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ جن کی تعداد ۳۸۹ تھی۔ اچھرہ، لاہور میں جماعتِ اسلامی پاکستان کا مرکز قائم ہو گیا، جس کے ساتھ ہی مولانا نے اپنی رہائش گاہ بھی بنا لی۔ جبکہ مولانا مودودیؒ جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے لگے اور میاں طفیل محمد جنہوں نے مشرقی پنجاب کی ریاست کپورتھلہ سے ہجرت کی تھی' وہ جماعت کے سیکرٹری جنرل مقرر ہو گئے اور ۱۹۷۲ء تک مولانا مودودیؒ کے ماتحت جماعت کے سیکرٹری جنرل کے طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے، تا آنکہ مولاناؒ نے اِس سال بطور امیر جماعت کام کرنے سے معذرت کر دی اور میاں طفیل محمد امیرِ جماعت منتخب ہوئے۔

Marfat.com

مولانا مودودیؒ کی فکرِ اسلامی اور نظریات کا جائزہ:

جہاں مولاناؒ کی زندگی سے ہمیں ''احیائے اسلام'' کی بنیادیں علم میں آتی ہیں۔ وہاں آپ کی نظریاتی فکر بھی عملی طور پر اِسلام سے مکمل رشتہ جوڑتی نظر آتی ہے۔ آپ کی زندگی کا قابلِ رشک کمال یہ ہے کہ عمر بھر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ ضخیم کتابی تصانیف، طویل اور مختصر آرٹیکلز اور پمفلٹوں کی اشاعت کا کام بھی بہتے دریا کی طرح جاری ہے۔ جبکہ بڑا کمال یہ ہے، کہ اپنے ہم عصر دور میں اسلام کا مرکزی کردار نمایاں ہے، جس کے سامنے دیگر نظریات گھٹنے ٹیکتے نظر آتے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں آپ کی تحریروں نے بڑا اثر کیا ہے۔ اِس کی سب سے بڑی مثال آپ کی قرآنِ کریم کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' اُردو زبان میں ہے، جس پر ۱۹۴۲ء میں کام شروع کیا، اور ۳۰ سال کام کر کے چھ جلدوں میں اُسے مکمل کیا۔ یہ تفسیر اتنی مقبول ہوئی، کہ انگریزی اور عربی زبانوں میں اِس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اِس کا انگریزی ترجمہ بھی چھ جلدوں میں سیالکوٹ کے چودھری محمد اکبر نے مولانا کی اجازت اور آپ ہی کی ملکیت میں مرتب کی جو The Meaning of Quran کے عنوان سے انگریزی زبان کی ہمہ گیریت کی وجہ سے مقبول ہے، اور دُنیا بھر علم کے متلاشی انگریزی زبان سمجھنے والے مسلمانوں اور اغیار میں حوالہ جات کے نقطہ نظر سے کئی لاکھ کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے، جبکہ یہ تفسیر ''احیائے اسلام'' کے نقطہ نظر سے بے نظیر ہے۔

آپ نے اپنے بے شمار علمی کاموں میں اِسلام کی صحیح تشریح کی۔ نظریہ، قانون، فلسفہ، تصوف، معاشرہ، اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ کونسا شعبہ ہے، جس میں آپ کا علمی کام موجود نہیں! آپ زندگی کے ہر شعبہ میں دینی احکامات پر عمل کرنے کے ساتھ اس امر پر بھی زور دیتے تھے، جو سماجی مسائل کا حل ہوں۔ آپ مغربی نظریات کی مانند اسلام کو ایک تاریخی نظریہ قرار دیتے تھے۔ اِسلامی نظریہ کے بارے میں آپ کی فکر احیائے اسلام کو موثر بنانے کے لیے، تاریخی طور پر، ایک نہایت واضح شکل دینے میں تمام عالمِ اسلام میں واحد فکر کہی جا سکتی ہے۔

مولانا کے اِس نظریہ کی طاقت سوشلزم اور کیپٹلزم کے غیر اسلامی نظریات مسترد کرتے ہوئے ایک درمیانی راہ ہے، جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اِس لحاظ سے اِس درمیانی راہ کو اِسلامی ذہن

Marfat.com

کے ممالک عالمِ اسلام کے رہنماؤں کو آپ نے صحیح موثر راہ دکھائی۔ اغیار کی اِن دونوں راہوں میں اُمتِ مسلمہ کے لیے نہ صرف بُری طرح اجنبیت تھی، بلکہ اُس کے مفاد میں ایک سنگین خطرہ۔ کیپٹلزم یا سرمایہ دارانہ نظام آپ کے نزدیک انڈیا میں ''برطانوی راج'' کا نمونہ تھا۔ جو انڈیا میں مسلمانوں کے زوال کا باعث ہوا۔ جبکہ ریاست حیدر آباد (جہاں آپ نے پیدائش پائی) وہاں کمیونزم کی تلنگانہ تحریک ۴۰۔۱۹۳۰ میں نظام کی حکومت کے لیے ایک سنگین خطرہ تھی۔ تاہم آپ نے اِن دونوں مادہ پرستانہ نظریات پر دُنیا میں قائم نظاموں کا مقابلہ کرنے کے لیے احیائے اسلام کے نظریہ پر قائم نظام کا عملی کام شروع کر دیا۔ جسے مغربی اصطلاحات میں ''اِسلامی انقلاب''، ''اِسلامی ریاست'' یا ''نظریۂ اسلام'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

آپ نے نفاذِ اسلام کو عملی شکل دینے کے لیے ایک خاموش انقلاب لانے کے لیے کام شروع کیا۔ جس کو ''اِسلام اور کفر کے درمیان جنگ'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جو مغرب اور برصغیر کے مسلمانوں میں غیر اسلامی رسومات اختیار کر گئی تھیں، دونوں کے خلاف یہ خاموش جنگ تھی۔ آپ شروع میں برصغیر میں ''تصوف'' کے نام پر معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں آپ بڑی سختی سے اُن کے خلاف تھے، بالخصوص اولیائے کرام کے مزاروں پر جو بدعات رواج پا گئی تھیں اور برصغیر کے مسلمانوں نے (جن میں رُوحانیت نام کو نہ تھی) محض حاضری اور غیر شرعی رسوم اپنالی تھیں۔ آپ حسن البنّاؒ کی طرح ''تصوف'' سے روحانیت کا عمل خارج کرنے کے روادار نہ تھے۔ بلکہ مناسب اصلاح کے حق میں تھے، جس میں اِسلام کی رُوح ہو۔ چنانچہ آپ کی تحریروں میں ''تصوف'' کے بارے میں غیر اسلامی روایات کی بجائے اُسے پاکیزہ بنانا ہے۔

''اسلام اور غیر اسلام کے درمیان جنگ'' کی جدوجہد کے بارے میں آپ کا اِس امر پر زور تھا کہ بالآخر سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ یہ جنگ اِسلامی انقلاب کی شکل میں رُونما ہو گی اور ایک اسلامی ریاست قائم ہو گی۔ جو بڑے پیمانے پر معاشرے میں اسلامی اصلاحات نافذ کرے گی، اور عوام اُس اِسلامی نظام کا عملی منظر دیکھ پائیں گے، جو اُن کے ''رویائے صالحہ'' کی تعبیر ہو۔

آپ آیت اللہ خمینی کی طرح اولاً اقتدار جو اِسلامی نظام قائم کرے، کے حق میں نہ تھے۔ بلکہ آپ کی رائے یہ تھی کہ اولاً مسلمانوں کو نظامِ اسلام سے پوری طرح باخبر کر کے اُن کے اندر

Marfat.com

اِسلام کی رُوح پھونک کر ''انقلابِ اسلامی'' کی راہ ہموار کریں، اور اِس کی بنیاد ''شریعت'' تھی۔

آپ کی یہ فکر ''اِسلام اور سیاست'' کا موضوعِ بحث بن گئی۔ اِس موضوع پر بحث میں اِس حد تک چلے گئے، کہ موجودہ ریاستی نظام مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اِس بحث میں دوسرے مفکرین کے مقابلے میں آپ کی فکر جو آپ کو ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے، کہ اولاً انتظامی صلاحیتوں کے مالک ایسے افراد کی ٹیم ہو، جو انقلاب کے بعد اِسلامی ریاست کو دستورِ اسلامی کے مطابق چلا سکے۔ اِس سے آپ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا، کہ اگر اِن صلاحیتوں کے مالک افراد پر مشتمل جو اِسلامی ریاست ظہور پذیر ہوگی، اُس کے سامنے سوشلزم اور کیپٹلزم ریاستیں ہیچ ہوں گی۔ اِس بارے میں آپ اِس امر پر یقین رکھتے تھے، کہ اِسلامی ریاست اپنی عملی صلاحیت اور بلند مرتبہ کی وجہ سے ایک ضرورت ہے نہ کہ کوئی مذہبی سفارش۔ لہٰذا یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے جیسا کہ حالات ہر طرح سے منفی ہیں، طویل جدوجہد کے متقاضی ہیں۔ لیکن یہ طویل جدوجہد بالآخر مصائب و مشکلات کے حل پر منتج ہوگی۔ آپ کی رائے میں اُمتِ مسلمہ اگر ایک مرتبہ اِسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس ہو جائے اور یہ جان لے کہ اِن کی بنیاد پر اِسلامی ریاست وجود میں آئے گی، تو سب مسلم عوام اِس کے حق میں اپنی رائے دیں گے۔ لیکن حالات ایسی راہ پر جا رہے تھے (کہ آپ پاکستان میں تھے اور حکومتی نظام شروع تا آخر انتہائی خود غرضیوں کا نمونہ) کہ آپ کے نظریات ایک ''دعوۃ'' کی شکل اختیار کر گئے، کہ عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اِسلامی ریاست کی برکات سے باخبر کیا جائے۔ جس سے وہ بے خبر ہیں، لہٰذا ایسی ریاست کی تشکیل گونا گوں مشکلات کی وجہ سے طویل عمل ہے۔ جس وجہ سے جماعت سیاسی سرگرمیوں میں دعوتی عمل کے ساتھ مصروف ہوگی، کہ ریاست اور معاشرہ دونوں کو اپنا مخاطب سمجھ کر کام کرے۔

اسلامی ریاست کی تشریح میں آپ نے مغرب سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ جس کا ماحصل یہ ہے، کہ اِسلامی ریاست کا انتظام ایک ایسی جدید مشینری ہاتھوں میں ہوگا، کہ اُس میں ایک منتخب صدر، ایک منتخب پارلیمنٹ اور کل اختیارات کی مالک عدلیہ، اِن تینوں کا احتساب اور اُس کی نگرانی کا ذکر آئین میں ہوگا۔ ایسی اسلامی ریاست کی کامیابی تبھی ممکن ہے، کہ معاشرہ کی

Marfat.com

نظروں میں اُسے مقبولیت ہو۔ یہی ایک ایسی وجہ تھی، کہ مولانا مودودیؒ اور اُن کے عقیدتمندوں نے دوسرے اسلامی مفکرین سے اختلاف کرتے ہوئے اسلامی ریاست کے قبل معاشرہ کو اسلامی بنانے پر زور دیا، اور اِس امر پر زور دیا کہ معاشرہ کو اِسلامی تعلیمات سے منور کیا جائے۔ جو اِسلامی انقلاب کی جانب کوشش کا ایک حصہ ہوگی۔ لیکن اگر معاشرہ کی ذہنی اِسلامی انقلاب سے قبل ''نام سے اِسلامی، عملاً خودغرضی'' ریاست وقوع پذیر ہوجائے۔ تو یہ ایک طرح ایسی آمریت ہوگی، جو اُس سے نالاں عوام پر اپنی مرضی مسلط کریگی، جو معاشرتی اور سیاسی بہتر تبدیلی پر نحوست کا ٹھپہ لگادیگی۔

تاہم اسلامی ریاست کی دینی اور عملی افادیت اور اُس کا ''الف لیلوی'' خوشنما تصور اِس امر پر منحصر ہوگا، کہ معاشرتی خواہشات اور نظریات میں کتنی عملی ہم آہنگی ہے۔ جو مولاناؒ کے نزدیک ضروری ہیں۔ جو ایک جمہوری طرزِ حکومت کے ذریعہ حاصل کیے جاسکتے ہیں، جن پر آپ کا زور ہے، کیونکہ مغرب میں جمہوری نظامِ حکومت نے لوگوں کی خواہشات کے ساتھ اُن کی ضروریات کو بھی پورا کیا ہے۔ اِس بارے میں قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت اِس وجہ سے ضروری نہیں۔ کہ یہ دوطرفہ سماجی اور سیاسی شعبوں کو تحفظ دے گا، بلکہ دوسرے سے متصادم موضوعات کے درمیان کوئی تفریق نہ ہوگی۔

آپ نے بخوبی یہ بھی محسوس کر لیا تھا، کہ (پاکستان جیسے ملک) جب تک اِسلامی ریاست اِسلامی قوانین اور مثالی جمہوریت آپس میں ہم آہنگی قائم نہ کرسکیں گے، اُس وقت تک عوام بخوشی اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اِسلامی ریاست بہ جبر ''شرعی قوانین'' کا نفاذ عمل میں نہ لائے، تا آنکہ عوام خود اِس کا مطالبہ نہ کریں اور ریاست پر اس کا بوجھ نہ ڈالیں، کہ حکومت ''غیر شرعی'' ہے۔ لہٰذا ریاست کو اِسلامی رنگ دینا عوام اور حکومت کے طرزِ عمل دونوں کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔

''حدود'' کے قوانین کے نفاذ میں بھی آپ کا رویہ بڑا محتاط ہے۔ ''حدود کی سزائیں'' نافذ کرنے کے بارے میں آپ کا موقف ہے کہ یہ سزائیں تبھی نافذ کی جائیں، جب معاشرہ اِسلامی شکل اختیار کرلے اور عوام اِسلام اور اُس کی تعلیمات سے بخوبی آگاہ ہوجائیں اور اِس

Marfat.com

کے بعد اُن کے پاس کوئی بہانہ نہ رہ جائے گا، کہ ''قوانین حدود نہ نافذ کیے جائیں''۔ چنانچہ اس بارے میں پاکستان کے جنرل ضیاء الحق کی حکومت اور ایران کے آیت اللہ خمینی کی حکومت کی مخالفت کی۔ بہ الفاظِ دیگر اِس کا مطلب یہ ہے کہ نہ معاشرہ مکمل طور پر اِسلامی ہوگا اور نہ شرعی حدود نافذ ہوں گی، کہ نہ مذہب میں جبر ہے اور نہ ریاست ''الف لیلوی'' خوشیاں دینے کی پابند آپ کے ذہن میں ''اِسلامی ریاست'' کا جو ایجنڈا تھا۔ آپ اسلام کے اِس نظریہ کی وکالت کرتے تھے، کہ دین سیاسی سرگرمیوں کو حرکت میں لائے۔ آپ نے اِسلام کو اپنے اُن تقاضوں کے ساتھ مربوط کیا، جن کا اوّلین تقاضہ مکمل طور پر خوشنودیٔ الٰہی کا حصول ہے اور وہ اطاعتِ احکاماتِ خداوندی میں مضمر ہے اور یہ اطاعت معاشرہ اور سیاست دونوں پر حاوی ہے۔ اِسکے چار کلیدی عناصر ہیں۔

۱) اِلٰہ ۲) ربّ ۳) عبادت ۴) دین

آپ نے ''ایمانِ مسلم'' کے مطلب کی اِن الفاظ میں وضاحت کی، کہ پاکیزہ زندگی ہی معاشرتی زندگی کا تقاضہ ہے۔ اپنی وجدانی نظر اور زندگی بھر اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کے ساتھ آپ نے سیاست کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ معاشرتی اور سماجی تبدیلی کے بارے میں آپ کی یہ پختہ رائے تھی، کہ یہ تبدیلی حکمرانوں کے نتیجے اُلٹنے کے نتیجہ میں نہیں آئے گی، بلکہ بڑے پیمانے پر سر سے پاؤں تک اصلاحات کا عمل اور سیاسی قوت حاصل کے ذریعہ آئے گی۔ آپ نے ہمیشہ تشدد کی مذمت کی، کہ اِسلام اِس کی اجازت نہیں دیتا اور اِس بارے میں ''جمہوری خلافت'' اور ''مذہبی جمہوریت'' کی تشریح کی جہاں تک اِسلامی انقلاب آنے کا معاملہ ہے، وہ حکمرانوں کا تختہ اُلٹنے کی بجائے خود اِن حکمرانوں کی بدعنوانیوں کو منظرِ عام پر لا کر انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ عوام میں غیر مقبول ہیں اور کسی حکمرانی کے لیے نا اہل۔ مزید برآں اِسلامی انقلاب لانے کے لیے تعلیم کا عام کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔ اِس بارے میں آپ نے جو موقف اختیار کیا، وہ ایران کے آیت اللہ خمینی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جو سیاست میں جماعتِ اسلامی کی سرگرمیوں سے ظاہر ہے، اور احیائے اِسلام کی سمت تبدیلی کی راہ دکھاتی ہے۔

اِسلامی ریاست کی خصوصیات کی پوری تشریح ہر شعبہ میں کام لینے میں اپنی طرف سے

Marfat.com

کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ اقتصادی معاملات بھی اُس میں شامل ہیں۔ اِس بارے میں آپ نے بڑھتی آبادی، اقتصادی ناہمواری اور سماجی انصاف وغیرہ کو زیادہ قابلِ توجہ نہیں سمجھا، کہ یہ مسائل اِس وجہ سے ہیں کہ یہ مغربی نظام کی ناکامی کا عکاس ہیں، جبکہ اِس کی جگہ اگر صحیح معنوں میں کوئی اِسلامی ریاست ہو، تو یہ مسائل پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ مسلمان اِن مسائل کو بحث کا موضوع نہ بنائیں، بلکہ معاشرہ کو اِسلامی اور اِسلامی ریاست کے قیام کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے پاکستان میں ''لینڈ ریفارمز'' کی مخالفت کی۔ اِس بارے میں آپ کا یقین تھا، کہ اِسلامی ریاست میں ''اقتصادی انصاف'' کا موضوع جگہ نہ پائے گا، تا آنکہ ایک اِسلامی ریاست وقوع میں آئے اور اُن احکامات کی خلاف ورزی نہ کی جائے، جس میں ذاتی جائداد رکھنے کی کوئی پابندی نہ ہو، کہ اس کی بنیادیں غیر اِسلامی تھیں، جن کی اصلاح وقت گزرنے کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ آپ کا زیادہ زور اِسلامی تعلیمات کے حصول پر تھا، بجائے اِس کے کہ جلد بازی میں سیاسی تنازعات میں اُلجھ جائیں۔ چنانچہ آپ نے ایران کے شیعی انقلاب کی راہ اختیار کرنے کی بجائے محتاط رویہ اختیار کیا۔ اِسی طرح جب ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں حکومت کی طرف سے ''لینڈ ریفارم بل'' پیش کیا گیا، آپ نے سختی سے اُس کی مخالفت کی۔ اِسی طرح ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ذوالفقار علی بھٹو کے صنعتوں کو قومیانے کے منصوبہ اور ''لینڈ ریفارمز تجاویز'' کی بھی مخالفت کی اور نہ ہی پاکستانیوں سے کبھی ''مادی منافع'' اور تقسیم دولت یا سرمایہ کا وعدہ کیا۔ اِس لحاظ سے اقتصادیات کے بارے میں آپ کی فکر قدامت پسندانہ تھی، جس کی بنیاد شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ آپ نے کبھی اُن اقتصادیات کی حمایت نہیں کی، جو عالمِ اسلام کے ممالک میں جاری ہے۔ بلکہ اِس امر کے حامی تھے، جیسا کہ دیگر اسلامی قوانین نافذ العمل ہوں، ویسے ہی اقتصادیات کے بارے میں اِسلام پوری رہنمائی کا حامل ہے۔ جس میں سُود خوری کا حرام قرار دیا جانا، قوانین وراثت اور محنت کشوں کے حقوق مستحکم اقتصادیات کی حامل ہیں۔ ثانیاً یہ کہ اقتصادی پالیسیوں کا تعلق ریاست سے تعلق ہے۔ ابھی تک اسلامی ریاست کا تخیل ''الف لیلوی'' ہے، لہٰذا جب کوئی اسلامی ریاست

Marfat.com

قائم ہوگی تو اسلام کے مطابق اُن کا نفاذ ایک مثالی حقیقت کے طور پر نمایاں ہوگا۔ چنانچہ اِس وجہ سے اسلامی اقتصادیات کے موضوع پر بیکار بحث کرنے کی بجائے اِس امر پر زور دیتے تھے، کہ اِس کا انحصار ایک اِسلامی ریاست پر ہے، جو اخلاقی اور وعدوں کے مطابق اُسے کامیاب بنائے۔

ایک اسلامی ریاست میں آپ نے خواتین اور اقلیتوں کے کردار کی بھی پوری طرح سے وضاحت کی، کہ اِسلامی نظام کسی مفروضہ کی بجائے ایک ایسی عملی حقیقت ہے، جو محض نفاذ کا متقاضی ہے اور اُس میں خواتین اور اقلیتوں اور محنت کشوں سب کے حقوق بلا کسی غیر ضروری بحث متعین ہیں۔

اِسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت ایک اقلیت کی ہے، جنہیں شریعت ''ذمی'' قرار دیتی ہے۔ جبکہ خواتین کا مختلف شعبوں میں ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ اُن کی عصمت اور اُن کے لباس پر زور دیا گیا ہے۔

آپ کا اِس بارے میں یقین تھا، مذکورہ باتوں میں آپ کی فکر آپ سے جوابات کا طلبگار ہوگی، کہ اسلامی ریاست کیسے اُن کی جمہوریت کی حمایت کے دعویٰ کے ساتھ ان تقاضوں کو پورا کرے گی۔ چنانچہ ان کے جواب میں کوئی معذرت خواہانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ آپ کا اِس بارے میں جواب یہ تھا، کہ اِسلامی ریاست کا ایک نظریاتی اور مثالی ہونا لازمی ہے۔ جو پاکیزگی رکھنے والی ہو اور اِس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ کسی کے حقوق پر زد نہ پڑے۔ شریعت نے اقلیتوں کو جو حقوق دیئے ہیں، اگر اُس سے زیادہ دیئے جائیں، تو خود ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا کہ اِس کے نتیجہ میں ریاست کی جو اِسلامی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے وہ متاثر ہوگی۔ لہٰذا ایک اسلامی ریاست میں اقلیتوں کا بحیثیت ایک ''ذمی'' قرار دیا جانا ریاست کے تحفظ اور بقا کی خاطر ہے۔ بوجہ اِس امر کے کہ سیکولر ریاستوں میں انسانی حقوق کو جس بُری طرح سے پامال کیا جاتا ہے، اِسلامی ریاست میں ''اقلیتوں کے حقوق کا پوری طرح خیال کر کے پابندیوں کا نام دیا جانا'' اگر بلاوجہ نہیں، تو منافقت کہا جاسکتا ہے۔

خواتین کے سماجی کردار ادا کرنے کے بارے میں آپ مکمل طور پر اِس کے مخالف نہ تھے، چنانچہ جماعتِ اسلامی میں خواتین کا اپنا علیحدہ شعبہ ہے اور جماعتِ اسلامی پاکستان

Marfat.com

(خواتین) نے آزادی سے کونسل آف اِسلامک آئیڈیالوجی کے ادارہ میں اپنی خدمات سرانجام دی ہیں، جو صدرِ پاکستان کو خواتین کے بارے میں قانون سازی کا مشورہ دیتی ہیں، اور وفاقی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلی میں بطور رُکن خواتین۔ تاہم سماجی اور سیاسی دائروں میں آپ نے خواتین کو مردوں کے مساوی حق نہیں دیا ہے اور اِس امر پر زیادہ زور دیا ہے کہ اُن کا سماجی کردار شرعی احکامات کے مطابق ہونا چاہیے۔ جو برصغیر ہندو پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ جس میں اہم چیز خواتین کا ''باپردہ'' ہونا لازمی ہے۔ جس کے باقاعدہ قواعد وضوابط ہیں، اور خواتین کو مردوں سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ ''پردہ'' کے حق میں دلائل دیتے وقت آپ حسبِ معمول اسلامی تعلیمات ملحوظ رکھتے ہیں، کہ خواتین کا ''باپردہ'' ہونا کسی اِسلامی ریاست کی بقا کا باعث ہے۔ آپ اِس امر پر زور دیتے ہیں، کہ شرعی قوانین سے زیادہ خواتین کو حقوق دینا بالخصوص شرعی حدود سے باہر مرد وزن کا باہمی اختلاط معاشرہ میں بے حیائی کے فروغ کا باعث ہوگا، اور اِسلامی ریاست کی تباہی اور زوال کا باعث ہوگا، جسکی مثالیں مشرق اور مغرب میں کئی بڑی سلطنتوں کے زوال کا باعث موجود ہیں۔ لٰہذا خواتین کا ''باپردہ'' رہنا اسلامی ریاست کی بقا کا ضامن ہے اور اُسے کسی عذاب سے بچاتا ہے۔

مضمون نگار سید ولی رضا نصر کی رائے میں خواتین کے بارے میں مولانا مودودیؒ کی فکر کمزور دلائل کی حامل ہے۔ کئی جگہ مبہم اور معذرت خواہانہ ہے اور عورت ایک ایسی کمزور مخلوق کہ پیشتر اس کے وہ مصیبت میں مبتلا ہو، وہ بے اختیار ہو۔ عورتوں کے بارے میں دیگر باتیں نظرانداز کر کے مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے، کہ آپ اِس بارے میں برصغیر کے قدامت پسندانہ رویہ سے باہر نہ تھے۔ ویسے بھی خواتین اور اقلیتوں کے بارے میں آپ نے یہ معاملہ اِسلامی ریاست پر چھوڑا ہے کہ یہ معاملات ایک ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ اور یہ رائے رکھتے تھے کہ اگر صحیح معنوں میں اِسلامی ریاست قائم ہو جائے تو یہ معاملات از خود حل ہو جائیں گے۔ آپ زیادہ تر سیاسی فکر کے مالک تھے جس میں خواتین وسماجی معاملات کمتر درجہ کے موضوع، اصل موضوع اِسلامی ریاست کا قیام ہے۔

جماعتِ اسلامی کا قیام:

جماعت اسلامی جو مولانا مودودیؒ کے نظریات کی عملی تعبیر ہے، اپنی طرز کی سب

Marfat.com

قدیم اسلامی دینی سیاسی جماعت کہلانے کی مستحق ہے۔ جبکہ عالمِ اسلام میں عموماً اور جنوبی ایشیا میں خصوصاً احیائے اسلام کی تعمیر سب سے زیادہ مؤثر تحریک ہے۔ سید مودودیؒ ۱۹۳۸ء میں اُمتِ مسلمہ کے مفاد کے تحفظ کی خاطر میدانِ سیاست میں داخل ہوئے تھے اور ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کے قیام سے قبل اپنے ہم خیال اصحاب کا ایک حلقہ بنا چلے تھے، جو یہ سمجھتے تھے، کہ وقت آ گیا ہے، کہ خواہ چند افراد ہی کیوں نہ ہوں، اِس سمت حصولِ مقصد کے لیے ایک جماعت قائم کی جائے۔ چنانچہ سید مودودیؒ کی دعوت پر ۲۶/ اگست ۱۹۴۰ء کے روز لاہور کے مقام جماعتِ اسلامی کے نام سے جماعت کا قیام عمل میں آیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ آل انڈیا کانگریس پارٹی کے مخالف تھے، کیونکہ آپ بخوبی یہ جان چکے تھے، کہ اِس جماعت کی قیادت اُن ہندو لیڈروں کے ہاتھ میں ہے، کہ جن کا مقصد سیکولرازم کے پردہ میں برصغیر پر ہندوؤں کی حکومت ہے۔ جس کے نتیجہ میں انڈیا سے اِسلام کا نام مٹ جائے گا۔ مزید برآں آپ کے ذہن میں نفاذِ شریعت کی بنیادوں پر اِسلامی ریاست کا قیام تھا، لہٰذا آپ اُن معنوں میں تو مسلم لیگ کے مخالف نہ تھے، جن معنوں میں آپ کانگریس کے مخالف تھے، لیکن مسلم لیگ کے کم وبیش تمام قائدین سیکولر ذہن کے مالک تھے، لہٰذا اُن سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اسلامی ریاست کا نظم شریعت کے مطابق چلائیں گے، چنانچہ آپ اِس جماعت کے بھی مخالف تھے، کہ ایک علیحدہ مسلم ملک قائم ہونے کے بعد اِس کا نظم ونسق سیکولر ذہن کے افراد کے ہاتھوں میں ہوگا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کا قیام ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے بعد عمل میں آیا، تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کو یہ توجہ دلائیں، کہ علیحدہ مسلم ریاست کا قیام لازمی ہے، لیکن اِس کے ساتھ وہ مسلم لیگ سے یہ مطالبہ بھی کریں کہ اُس کا قیام اِسلام کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔

ایک نئی اِسلامی جماعت کے قیام سے قبل ایک ایسی جماعت کا قیام مسلمانوں کے درپیش مسائل کا حل ہوگی، آپ نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں اس کی تبلیغ شروع کر دی۔ جسے بعض اِسلامی ذہن کے مالک نوجوانوں اور علماء کی تائید حاصل ہوئی۔ چنانچہ یہ سب افراد ۱۹۴۱ء میں لاہور کے مقام پر یک جا ہوئے، اِن میں سب سے زیادہ مخلص اور معروف

Marfat.com

شخصیتیں سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی ہیں، جن میں سے اول الذکر بعدازاں اِنڈیا اور عالمِ اسلام کی مشہور اسلامی یونیورسٹی ''ندوۃ العلماء'' کے ریکٹر Rector مقرر ہوئے اور موخر الذکر معروف ''دیوبندی'' فکر کے عالمِ دین ہیں۔

المختصر ۲۶/ اگست ۱۹۴۱ء کے روز لاہور میں جو جملہ اصحاب یک جا ہوئے، اُن کی تعداد ۷۵ تھی، جنہوں نے جماعتِ اسلامی کے قیام کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ کو جماعت کا امیر منتخب کیا۔ جبکہ آپ نے بعدازاں ۳۱ سال (۱۹۷۲ء) تک جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ جبکہ جماعت کے روزِ اول ہی جماعت کا دستور تیار ہو گیا تھا۔

لاہور میں جماعتِ اسلامی کے قیام کے بعد آپ نے جلد ہی اِس کا مرکز پٹھان کوٹ تبدیل کر دیا، کیونکہ لاہور اپنی گہما گہمیوں کی وجہ سے اِس لائق نہ تھا، کہ جماعت پوری یکسوئی سے یہاں اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے۔ مرکز کی لاہور سے پٹھان کوٹ تبدیلی نے جماعت کو یہ موقعہ دیا، کہ جماعت ایک ''اُمت'' کے طور پر کام کر سکے، اور جسے آپ نے ایک ''نمونہ'' قرار دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ تک ۱۹۴۷ اِس مقام سے آپ نے جماعت کا دعوتی کام بذریعہ لٹریچر، اجتماعات، جلسوں، جلوسوں اِنڈیا کے کونے کونے میں پھیلایا۔

جماعت کا ڈھانچہ:

جماعت نے اپنے قیام کے بعد سے مولانا مودودیؒ کے نظریات اور ہدایات کی پیروی کی ہے۔ جماعت کا وعدہ ہے کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کرنے کی خواہاں ہے جو عوام کو زندگی کی وہ سہولتیں مہیا کر سکے، جن کے بغیر چارہ نہیں ہے اور اُس انقلاب کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جس میں عوام اُس کا ساتھ دیں۔ بہ الفاظِ دیگر جماعت معاشرتی اور سیاسی طور پر اس انداز میں کام کرے، جس کی ترجمانی آپ کر رہے ہیں۔ مختصراً یہ کہ جماعت سیاست کے میدان میں اِسلامی مفادات کی بقا اور سیکولر ذہنوں کی قوتوں کے خلاف اپنی قوت مستحکم کرنے پر توجہ دے۔

جماعت کے تنظیمی ڈھانچہ کو جماعت کے روزِ قیام سے ہی ایک مستقل دستور کی شکل دے دی گئی تھی، جس میں وقتاً فوقتاً ۱۹۴۱ء میں اپنے روزِ قیام سے ترامیم اور نظر ثانی کی جاتی رہی

Marfat.com

ہے۔ اِس ڈھانچہ کی بنیاد ''رُکنیت'' ''متفق'' اور ''ہمدرد'' ہے۔ جبکہ یہ سب جماعت کے ''کارکن'' کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ''رُکنیت'' کے حامل صرف ''اراکین'' جماعت کا کوئی منصب سنبھال سکتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء میں ارکانِ جماعتِ اسلامی کی تعداد ۳۸۷ تھی، جو بڑھتے بڑھتے ۱۹۹۲ء میں ۷۸۶۱ ہوگئی، جبکہ اُس کے ہمدردوں کی تعداد اُسی سال ۲۲۹، ۳۵۷ کہی جاتی ہے، جماعت کا انتظام دستور کے مطابق مرکزی امیر کے بعد ہر مقام اور علاقہ میں مقامی اور علاقائی امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جبکہ ہر امیر کا معاون اُس کا قیم (سیکرٹری جنرل) ہوتا ہے۔ جماعت کی اِس قوت میں جیسے جیسے بے مثال میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے قومی سطح سے لے کر گاؤں گاؤں، بستی بستی اِس میں نظمی تبدیلیاں آتی گئیں۔ جس نے جماعت کو سرتا پاؤں قوی سے قوی تر بنایا۔ جس کے نتیجہ میں ہر شعبہ میں نئے ادارے مستحکم بنیادوں پر قائم ہوئے۔ صدی کے چھٹے عشرے میں خواتین نے اپنی علیحدہ تنظیم قائم کی، پھر اشاعتی ادارے، سفید پوش، وکلا، اِسلامی جمعیۃ الطلباء، جمعیۃ الطلباء العربیہ، اِسلامی جمعیۃ طالبات ایسی مضبوط تنظیمیں ہیں، جو دوسروں کے بَل بوتہ اور نفس پرست پارٹیوں کے مقابلہ میں محض اپنے بل بوتہ پر خوشنودیٔ الٰہی کے جذبہ کے ساتھ اپنوں اور اغیار کے خلاف ایک بڑا چیلنج ہیں۔

جماعت نے اپنے روزِ قیام سے ایک ''اخلاقی دینی جماعت'' کی شکل میں ایک ''اُمت'' کے طور پر کام کا آغاز کیا۔ اِنڈیا میں جب جماعت کا قیام عمل میں آیا، اِس کا مقصد دُنیا میں احیائے اسلام کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسی عملی تنظیم سے متعارف کرانا تھا، جو اُن کے سیاسی اور معاشرتی مطالبات کو تحفظ دینے کا کام کر سکے۔ اپنے پاکیزہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے ''ڈسپلن'' کا ہونا ضروری ہے، جو جماعت میں بہ فضلِ خدا شروع دن سے ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جماعت کے اراکین اپنے آپ کو ہر بُرائی سے بچاتے ہیں اور جماعت کے معیار کے مطابق پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ جماعت کے سامنے اراکین کی بڑی تعداد دکھانے کی بجائے اِسلامی زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا ہے۔ لہٰذا صرف نام لیوا اور دین سے بے خبر اور لاتعلق مسلمانوں کی عوامی پارٹی نہیں، بلکہ ایسے پختہ ذہن دین کے

Marfat.com

پیروکاروں کی جماعت ہے، کہ تمام معاشرہ اُن کی اخلاقی اقدار کا معترف ہے۔ جماعت نے اپنے طور عام مسلمانوں میں بھی یہ اقدار پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ اِسلامی اقدار اپنانے کے بعد وہ جماعت کے ساتھ مل کر اِسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرسکیں۔ چنانچہ سیاسی اصطلاح میں جماعتِ اسلامی صفِ اول کی وہ تنظیم ہے، جو اِسلامی انقلاب کی راہ ہموار کررہی ہے۔

جماعتِ اسلامی کی تاریخ اور اُس کا سیاست میں دخل:

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد جماعتِ اسلامی کے ارکان اِنڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور جماعتِ اسلامی کے جن ارکان نے پاکستان کو ترجیح دی، مولانا مودودیؒ کی امارت میں اُنہوں نے جماعتِ اسلامی پاکستان نام دے دیا، اور جنہوں نے اِنڈیا سے ہجرت نہیں کی، اُنہوں نے جماعتِ اسلامی انڈیا کا نام دے دیا، اور حالات کے مطابق اپنا علیحدہ امیر منتخب کر کے اپنا علیحدہ دستور تشکیل دے دیا۔ پٹھان کوٹ سے ہجرت کے بعد جماعتِ اسلامی پاکستان نے اپنا مرکزی دفتر مولانا مودودیؒ کی رہائش گاہ کے قریب اچھرہ، لاہور میں قائم کرلیا، پٹھان کوٹ میں جماعت کی زیادہ سرگرمیاں زیادہ تر علمی اور سیاسی طور پر کم تھیں۔ لیکن پٹھان کوٹ سے ہجرت کے بعد جماعت نے اپنی زیادہ سرگرمیاں پاکستان کی سیاست پر مرکوز کردیں، کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ جبکہ قیامِ پاکستان نے بھی جماعت کو یہ موقع عنایت کیا، کہ پاکستان کو اِسلامی ریاست کے طور پر کام کرنے کے لیے عملی طور پر پاکستانی سیاست میں حصہ لے۔ چنانچہ سیاست میں اُترنے کے لیے جماعت نے اپنے لیے میدان کھلا پایا۔ معاشرہ کو اپنی توجہ کا محور قرار دیا اور جلد ہی ایک اہم معروف سیاسی جماعت کی شکل اختیار کرلی۔

بطور ایک علیحدہ مسلمان ملک قیامِ پاکستان کا ظہور جس انداز میں عمل میں آیا، سوائے عوام کا اپنے آپ کو نام کے ساتھ مسلمان کہلانے کا دعویٰ ایک دوسرے سے مخالف گروہ اور برادریاں تھیں، جو ایک دوسرے کی غمی وخوشی میں حصہ لینے کی روادار نہ تھیں، اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لہٰذا بطور ایک پاکستانی ایک قوم کو پاکستان کا نام دیا جانا ایک مشکل ترین کام ہے، جو

Marfat.com

اُس کے روزِ قیام سے اَب تک جاری ہے۔ اُس کے قیام کے بعد اُس کے حکمرانوں نے جن میں بعض فوجی حکمران تھے، اُنہوں نے بحیثیت قوم عوام کی تربیت نہ کرنے کا جُرم کیا اور محض اپنی خدائی منوانے کی کوشش کی، جسکے نتیجہ میں ملک خانہ جنگی کا شکار ہوا اور اِس خانہ جنگی کے نتیجہ میں ۱۹۷۱ء میں زیادہ آبادی کا حصہ کٹ کر ایک علیحدہ ملک کی شکل اختیار کر گیا۔ البتہ اِس چیز نے وہ حصہ جو پاکستان کہلانے کا دعویدار ہے، یہاں اِسلام کو بطور دین اُبھرنے کا موقعہ بخشا ہے، جس میں مختلف اِسلامی جماعتیں اپنے اپنے طور قومی معاملات میں سیکولر حکمرانوں کیلئے ایک چیلنج بنی رہتی ہیں۔

جماعتِ اسلامی کا ایجنڈا شروع سے مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ پاکستان کو اِسلامی ریاست کی شکل دینا ہے، جس کو بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے۔ جماعت نے ملک میں اِسلام کو پوری جگہ دینے کو ہر لحاظ سے مقدم رکھا ہے۔ چنانچہ احیائے اسلام کے مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قومی سطح پر سفید پوش حلقہ کی تربیت پر خاص توجہ دیتی ہے۔ ایک لڑی میں مربوط اور ایک رشتہ میں مستحکم سرگرمیوں نے آپ کے ہمدردوں کو آپ کے نظریات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کو اپنا مطمحِ نظر خیال کیا ہے، بلکہ جماعت کو بھی استقامت بخشی ہے کہ سیاسی میدان میں اُس کے حریف اخلاقاً مایوس ہوں۔ ۱۹۴۱ء سے جب سے جماعت میدانِ عمل میں اُتری ہے، اُس کا پلیٹ فارم دین کے ساتھ سیاست ہے۔ جس میں جہاں جماعت کا عمل اِسلامی نقطہ نظر سے اصلاحی ہے، وہاں سیاسی حقائق اور سماجی معاملات کو مدِ نظر رکھنا ہے۔

جیسے ہی قیامِ پاکستان عمل میں آیا، روایتی اِسلام کو خیر باد کہہ کر مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی نے فوراً علماء کے ساتھ رشتہ قائم کیا اور جماعت اور دیگر اِسلامی جماعتوں نے اِسلامی دستور کا مطالبہ کیا اور دستور کے جو تقاضے تھے وہ دیگر اِسلامی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کے ساتھ حکومتوں کے سامنے رکھے جاتے رہے، یہ سلسلہ ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۶ء تک جاری رہا۔ لیکن اِسلامی دستور کی شکل ۱۹۴۹ء میں "قراردادِ مقاصد" سامنے آئی، جس پر سب علماء متفق تھے۔ جبکہ اِس قرارداد کو مولانا مودودیؒ نے مرتب کیا تھا، کہ اِس کے مطابق کوئی اسلامی حکومت کن اختیارات کی مالک ہے۔ جسکے نتیجہ میں جماعت کی سرگرمیاں کھل کر سامنے آگئیں، اور حکومت کے خلاف

Marfat.com

سیاست میں مذہب کی مداخلت باعثِ تنازعہ بن گئی، کہ مذہب میں سیاست اور مذہب یکجا ہیں۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست یک جا ہیں، چنانچہ جیسے ہی پاکستان قائم ہوا، مولانا مودودیؒ نے پاکستانیوں کو ہدایت کی کہ جب تک حکومت واضح الفاظ میں ریاست کے اسلامی ہونے کا اعلان نہ کرے، اُس سے وفاداری کا حلف نہ کیا جائے۔ اِس دلیل کے ساتھ کہ مسلمان بقائمی ہوش وحواس اولاً اور آخراً اللہ تعالیٰ کا وفادار ہے۔ اِس چیلنج سے حکومت کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی، بالخصوص اِس وجہ سے جب ممالک غیر سے معاملہ درپیش آیا۔

۱۹۴۸ء میں جب کشمیر میں انڈیا کے ساتھ جنگ بندی ہوئی اور پاکستان کو جنگ جاری رکھنے کی حمایت حاصل ہوگئی تھی اور پاکستان سے فوج کی حمایتی دستے کشمیر بھیجے گئے تھے، حکومت نے جنگ بندی کے اعلان کے ساتھ اِسے ''جہاد'' کا نام دیا۔ مولانا مودودیؒ نے اِسے ''جہاد'' تسلیم کرنے سے انکار کردیا، کہ ایک طرف جنگ بندی اور دوسری طرف جنگ منافقت ہے۔ لہٰذا وفاقی حکومت کے لیے ضروری ہے، کہ وہ کھل کر انڈیا کے خلاف اعلانِ جنگ کرے جن شرائط کے تحت جنگ بندی ہوئی ہے، اُن پر عمل ہو۔ لیکن حکومتِ پاکستان نے دوغلی پالیسی اپنائی، نہ انڈیا کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کیا، بلکہ جو عناصر انڈیا کے خلاف الحاقِ پاکستان کے لیے اپنے طور جنگ لڑرہے تھے اُن کے ساتھ بھی منافقانہ رویہ اختیار کیا، جس کی مولانا مودودیؒ نے مخالفت کی۔ حکومت نے مولانا مودودیؒ کے اِس رویہ کو حکومت کے خلاف ''بغاوت'' کا نام دے کر مولاناؒ اور جماعت کے بعض دیگر لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا۔

جہاں اپنے طور پر حکومت نے مولانا مودودیؒ کو جیل میں ڈال کر بڑی کامیابی خیال کیا، وہاں اُسے دفاعی انداز اپنانا پڑا، کہ مولانا مودودی نے اُس کی پوزیشن کو نقصان پہنچایا ہے۔ کشمیر حاصل کیے بغیر جنگ بندی حکمت کا تقاضہ نہ تھا (چنانچہ آج ۶۲ سال ہو چلے ہیں، کہ اُس وقت انڈیا کے خلاف حکومت پاکستان کے غلط غیر دانشمندانہ جنگ بندی کے فیصلہ نے کشمیری عوام کو ایک طویل جنگ آزادی میں مبتلا کر رکھا ہے) حکومت کے اِس جنگ بندی کے فیصلہ کو بعدازاں دیگر مذہبی رہنماؤں نے غلط قرار دیا۔ لیکن مولانا مودودیؒ کے اِس مؤقف نے جماعتِ اسلامی کی

Marfat.com

پوزیشن مستحکم کردی۔ بالخصوص کراچی (جو ابھی تک دارالحکومت تھا) میں آئین کے بارے میں جماعت کے موقف کو استحکام ملا۔

جماعتِ اسلامی پر حکومتی حملوں نے جماعت کو ذرا کمزور نہ کیا، اور نہ پاکستانی سیاست میں اسلام خارج کیا جا سکا۔ چنانچہ آپ نے جیل میں ہونے کے باوجود علمائے کرام اور دیگر مذہبی عناصر کو اپنے اعتماد میں لیا، اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو اسلامی دستور تدوین کرنے پر زور دیتے رہے۔

جب آپ ۱۹۵۰ء میں جیل سے رہا ہوئے تو جماعت کی سرگرمیوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ جماعت نے اسلامی اتحاد میں کامیابیاں حاصل کیں، اور پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے کے مباحث کو فروغ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا، گو کوئی نشست حاصل کرنا تو ممکنات میں سے نہ تھا، بلکہ ملکی سیاست میں اپنا کردار منوانا مقصود تھا، جو ممکن ہوا اور جماعت صوبہ کے گلی کوچوں میں ان معنوں میں معروف ہوگئی، کہ یہ واحد جماعت ہے، جو معاشرہ کو سُکھ کا سانس دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ جو حکومت کی پریشانی کا باعث ہے۔ پھر ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کی مہم شروع ہوئی۔ جو پنجاب کے علماء نے شروع کی۔ جس میں سر ظفر اللہ خان جو پاکستان کا وزیر خارجہ تھا اور مذہباً قادیانی تھا۔ اس مہم میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کے ساتھ ظفر اللہ خان کی بھی حکومت سے برطرفی کا مطالبہ تھا۔ ان کا تسلیم کیا جانا، ان مطالبات کا حکومت سے منظور کرائے جانے کا مقصد یہ تھا، کہ حکومت اسلام کے بارے میں مخلص ہے یا نہیں۔ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بارے میں یہ ایجی ٹیشن جو دیگر علماء کی حمایت کے ساتھ مجلس احرارِ اسلام کی حمایت کے ساتھ جاری تھا، جماعت کی حمایت اسے مزید فروغ دے رہی تھی، بالخصوص اس بارے میں مولانا کے رسالہ ''قادیانی مسئلہ'' کی اشاعت نے حکومتی حلقوں میں کھلبلی مچا دی، اور دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں جماعت کی ایجی ٹیشن کی حمایت اور ''قادیانی مسئلہ'' کی اشاعت کو اپنے لیے بڑا خطرہ قرار دیا، اور اس حد تک گھبرا اُٹھی، کہ مولانا مودودی اور جماعت کے خلاف بغاوت کا مقدمہ دائر کر کے کئی

Marfat.com

رہنماؤں کو سزائے قید اور مولانا کو سزائے موت سنا دی۔ جسے بالآخر ملک کی سپریم کورٹ نے ۱۹۵۵ء میں خارج کر دیا۔

حکومت کی جماعت کے خلاف اِس پالیسی نے جماعت کو عوام میں مزید مقبول بنا دیا، کہ عوام نے قادیانیوں کو کبھی مسلمان نہیں سمجھا تھا اور نہ وہ مسلمان ہیں۔ مزید برآں پاکستان کے دستور کے حوالہ سے ملک میں اِسلامی دستور کے حق میں بحث و مباحث کے دروازے کھل گئے، اور ملکی سیاست میں جماعت کے حق میں فضا مزید ہموار ہوگئی۔ چنانچہ جماعت بھی ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی، اور اس نے حکومت پر اپنا مزید دباؤ بڑھا دیا۔ جو ۱۹۵۶ء کے آئین کی شکل میں سامنے آیا۔

اب جبکہ قادیانیوں کے خلاف مہم کافی حد تک کامیاب ہوگئی تھی، حکومت کی جماعت کے خلاف کارروائیوں نے جماعت کو کہیں مضبوط اور مقبول بنا دیا تھا، کہ پاکستان کو اِسلامی ریاست ہونا چاہیے۔ حکومت کے خلاف یہی وہ عوامی رجحان تھا کہ بالآخر ۱۹۵۶ء کا اِسلامی دستور نافذ ہوا۔ جس میں جماعت اور اُس کی اتحادی جماعتوں کی کافی شقیں شامل تھیں۔ جماعت اور اُس کے حامی علماء نے اِس دستور کے نفاذ کو اپنی بڑی فتح قرار دیا، اور اِسے اِسلامی دستور کے طور پر قبول کر لیا تاکہ ریاستی اداروں کو کوشش کر کے اِسلامی رنگ میں ڈھالا جائے۔

۱۹۵۶ء کے دستور کی منظوری کے بعد جماعت بلاواسطہ ملکی سیاست کا حصہ بن گئی، کہ اسی دوران ۱۹۵۸ء میں الیکشن کا اعلان ہو گیا اور مولانا مودودی نے جماعت کا الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا، جماعت کے اندر بعض اصحاب نے آپ کے اِس فیصلہ کی مخالفت کی جبکہ آپ کا موقف یہ تھا کہ جب ہم نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو منظور کیا ہے تو پھر کیوں نہ ریاست کے سیاسی امور میں حصہ لیا جائے۔ لیکن ابھی انتخابات نہ ہو پائے تھے کہ ۱۹۵۶ء کی دستور کے بارے میں یہ فتح بڑی مختصر ثابت ہوئی اور ملک کی افواج کے آرمی چیف جنرل ایوب خان نے سیاسی جمہوری حکومت کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ اور بطور ایک ڈکٹیٹر حکومت کے نظم و نسق پر قابض ہو گیا، اور ۱۹۵۸ء میں اقتدار سنبھال کر ملک کو مغربی تہذیب کی ماڈرن ازم کے رنگ میں ڈھالنے کی راہ

Marfat.com

اختیار کی۔ جس میں مذہب اور مذہبی اقدار کو ملکی سیاست سے نکال دیا۔ (نوٹ: قائداعظم کی وفات کے بعد غلام محمد نے بطور گورنر جنرل جسٹس منیر کے "نظریۂ ضرورت" کے تحت خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمیٰ کو برطرف کر کے جمہوری حکومت کی بساط لپیٹ دی تھی، لیکن رہی سہی کسر جنرل ایوب خان نے پوری کردی۔")

جنرل ایوب خان کا یہ دورِ آمریت کوئی دس سال رہا، جس نے دین کو اسلامی ماڈرن ازم کے نام پر پاکستان اور پاکستان کی ملکی سیاست سے نکال باہر کرنا تھا۔ ایوب خان کی اِس آمریت کی ملک پر مسلط اغیار کی پروردہ ماڈرن نوکر شاہی نے پورے دس سال بڑی خدمت کی۔ جس کا مقصد جماعتِ اسلامی اور اُس کی اتحادی اِسلامی نظریاتی جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ دباؤ میں رکھ کر ماڈرن ازم کے نام سے اسلام کی ایسی تشریح کرنی تھی کہ صرف نام کا مسلمان ہونا ہی اِسلام ہے، اور پاکستان کو جو صحیح معنوں میں اِسلامی ریاست بنانا مقصود ہے، اِس سوچ کو ختم کیا جائے۔ جس کے نتیجہ میں جو عناصر ملک میں احیائے اسلام چاہتے تھے اور ریاست کو عملاً اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے، محض ذہنی طور پر دباؤ کا شکار نہ ہوئے بلکہ ایوب خان نے ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۷ء اپنے دورِ حکومت میں مولانا مودودیؒ کو دو مرتبہ جیل میں رکھا۔ اِس اُمید پر کہ شاید اُس کی حکومت کو مولانا مودودیؒ کے نظریات سے خلاصی نصیب ہو اور اُس کی حکومت کو بھی کوئی آنچ نہ آئے کہ وہ بھی ملک میں اِسلام چاہتا ہے مگر ماڈرن بنا کر۔ چنانچہ جماعت پر اُس نے اپنی سختیوں میں مزید اضافہ کر دیا، جس بنا پر جماعت کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ سیاسی میدان میں آزادی سے کام کر سکے، ماسوائے اِس کے کہ وہ عوام سے ایوب خان کے خلاف مہم چلانے کی تحریک چلائے۔ جو سیاسی موسم کی بحالی ہو اور مذہب و سیاست کے حق میں ہو۔ اب جماعت کے لیے دیگر چارۂ کار نہ رہا، کہ جو جماعتیں بھی جمہوریت کی بحالی چاہتی ہیں، اُن کے ساتھ بھی اتحاد کیا جائے۔ چنانچہ ایوب خان کو حکومت سے ہٹانے کے لیے دیگر جماعتوں سے بھی اتحاد کیا، جو جمہوریت کی بحالی چاہتی تھیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۶۵ء کے الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح کی بطور امیدوار صدارتِ پاکستان واضح حمایت کی۔ ایک طرف ایک آمر کی اپنے طور جماعت کو سیاست کو ہمیشہ کے لیے

Marfat.com

نکال دینے کی یہ کوششیں، جس میں اُسے سرکاری نوکر شاہی کے مشورے شامل ہیں۔ لیکن اِسے تائیدِ ایزدی کہنا چاہیئے کہ جو شخص تن تنہا یا جماعت اُس کو اخلاص کے ساتھ خوشنودیٔ الٰہی کے لیے میدانِ عمل میں ہو، تو اُسے کوئی اُس راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور آمریت کو یہ احساس ہوا، کہ اسلامی قوت کو کمزور کرنا اتنا آسان نہیں، جتنا وہ سمجھتی تھی۔ چنانچہ مجبوراً اسلامی سرگرمیوں کے بارے میں نرمی اختیار کرنی پڑی۔ جبکہ ملک ایسے قومی بحرانوں کا شکار ہو گیا تھا، جس کو حل کرنے میں مخالفت کے باوجود اسلام سے جس قدر ممکن ہوا، مصالحت کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ اِسلامی عناصر بالخصوص مولانا مودودیؒ سے مصالحت کی کوئی راہ نکالیں۔ مثال کے طور پر ایوب خان جس نے جماعت کے خلاف اپنی دُشمنی میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی، مولانا مودودیؒ سے اپیل کی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ جو انڈیا کے خلاف عمل میں آگئی ہے، اُسے ''جہاد'' قرار دیا جائے۔ تاہم جماعت کے خلاف ایوب کی مصلحت کوشی بہ الفاظِ دیگر وقتی ڈپلومیسی تھی، ورنہ اُس کی جماعت اور مولانا مودودیؒ کے خلاف دُشمنی بدستور تھی اور جماعت پر بدستور دباؤ تھا، جسے جماعت نے کبھی وقعت نہ دی۔ جبکہ ایوب خان نے جماعت کو ایک خطرناک سیاسی جماعت قرار دے کر عوام کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی۔

ایوبی دور کے بعد اب جماعت نے بھی پوری طرح سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں قطع نظر اِس کے کہ عام قومی انتخابات میں کوئی نشست حاصل کر سکے، جماعت نے متعدد نشستوں پر اپنے اُمیدوار کھڑے کیے، نتیجتاً قومی اسمبلی میں چار نشستیں اور چار صوبائی اسمبلیوں میں حاصل کیں۔ ۱۹۷۱ء میں انتخابات کے بعد مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کی سیاسی حریفانہ کم اور خود غرض اقتدار پرستی کی ہوس کی وجہ سے ملک خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ لیکن جماعت نے پوری کوشش کی، کہ دونوں حصوں میں قومی یگانگت قائم رہے اور اپنے پورے ذرائع ملکی دفاع کے لیے وقف کر دیئے اور کوشش کی، کہ مشرقی پاکستان ایک علیحدہ ملک بنگلہ دیش کی شکل نہ اختیار کرے۔ لیکن حالات اِس نہج پر جا چکے تھے کہ دونوں حصے علیحدہ ہو کر رہے اور مغربی پاکستان ہی صرف پاکستان نام کا ملک رہ گیا۔

Marfat.com

جس پر الیکشن ۱۹۷۱ء اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اُس پر اب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت تھی اور پاکستان پیپلز پارٹی اُن کی سیاسی جماعت تھی۔ جس کے عزائم بطور ایک سوشلسٹ لادینی نظریاتی جماعت پوشیدہ نہ تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب (وفات ۱۹۷۹ء) کا ۱۹۷۱ء میں ملک کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد جس میں اُن کا نام ایک مجرم کے طور پر لیا جا سکتا ہے، پاکستان میں جماعت کی سیاسی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا، اور جماعت نے اُن کو اور اُن کی لادین جماعت کو اسلام کے خلاف ایک چیلنج تعین کر کے پیپلز پارٹی کی حکومت کو ایک غیر قانونی حکومت قرار دیا۔ چونکہ اُن کی حکومت قومی انتخابات کے نتیجہ میں ایک اقلیتی پارٹی تھی۔ چنانچہ ۷۴-۱۹۷۲ء نہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی تسلیم کی اور نہ بنگلہ دیش حکومت۔ البتہ ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے خلاف جو مہم تھی، اُس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اِس کے بعد جب تک مسٹر بھٹو اقتدار میں رہے، جماعت اُس کے خلاف صفِ اوّل کی جماعت تھی کہ اولاً وہ پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا باعث تھے۔ ثانیاً وہ لادینی ذہن کے مالک تھے، چنانچہ جماعتِ اسلامی کا یہ رویہ جہاں دینی طاقتوں کو مضبوط کرنے کا باعث تھا، وہاں مسٹر بھٹو کی حکومت کو کمزور کرنے کا بھی باعث تھا۔ اِس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ایوب خان کے خلاف جمہوریت کی بحالی کے لیے اِسلامی جماعتوں اور عناصر کو متحد کیا، اِس طرح مسٹر بھٹو کے خلاف جمہوریت کی بحالی اور اِسلام کا پرچم سربلند کرنے کے لیے مذہبی اور غیر مذہبی تمام ہی عناصر کو اُن کے خلاف اُٹھا کھڑا کیا۔ مذہبی جماعتوں کے ساتھ جماعت کے اتحاد نے مسٹر بھٹو کے خلاف تحریک نے ''نظامِ مصطفیٰ'' کی شکل اختیار کی۔ جس کے نتیجہ میں جماعت نے ایک ملک گیر شکل اختیار کر لی، اور اُس کی مقبولیت میں ہمہ گیر اضافہ ہوا۔ مسٹر بھٹو جان گئے کہ اُن کی اور اُن کی جماعت کی ساکھ کا گراف بہت نیچے آ گیا ہے، تاہم وہ دوبارہ حکومت کے ہوتے ہوئے دھاندلی سے کام لے کر پیپلز پارٹی کی حکومت بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا، اور دھاندلی سے کام لیا، لیکن مقبولیت کا گراف اتنا نیچے آ گیا تھا، کہ اپوزیشن نے ۳۶ نشستیں حاصل کیں، جبکہ جماعت نے نو نشستیں حاصل کیں۔ اِس لحاظ سے

Marfat.com

اِسے بتدریج بڑی کامیابی کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے مقابلہ میں دیگر تمام جماعتیں جن کا نہ کوئی باقاعدہ دستور ہوتا ہے اور نہ کوئی پروگرام، محض شخصیات کے گرد گھومتی ہیں، جو جوڑ توڑ کی ماہر ہوتی ہیں۔ جبکہ جماعت کا ایک مستقل نظریہ، دستور اور ڈسپلن ہے۔ اگرچہ یہ طویل عمل ہے، لیکن اِسے ایک مستقل جماعت کی حیثیت حاصل ہے، جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، جبکہ دیگر جماعتیں یا خود بانی جماعت کا گراف گرانے سے ختم ہو جاتی ہیں یا اُس کے اقتدار سے رُخصت ہونے کے بعد یوں تو الیکشن ۱۹۷۷ء سے قبل ہی مسٹر بھٹو کا گراف نیچے آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن الیکشن کے بعد اُن کا اور اُن کی حکومت کا گراف مزید تیزی سے نیچے آنے لگا، اُن کے خلاف جلسے جلوس نکلنے شروع ہو گئے جن میں جماعت نے صفِ اوّل کا کردار ادا کیا۔ اِس حد تک کہ فوج کو یہ موقع مل گیا کہ اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار سنبھال لے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۷۷ء میں فوج نے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار سنبھال لیا، اُس وقت میاں طفیل محمد امیر جماعتِ اسلامی مسٹر بھٹو کی حکومت کے احکامات کے تحت جیل میں تھے، کیونکہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۷۲ء میں جماعت کی امارت سے معذرت کر دی تھی، لہٰذا اگرچہ مولانا مودودی اب امیر جماعت نہ تھے، لیکن امیر جماعت کے جیل میں ہونے کی وجہ سے مولانا مودودیؒ اب قومی سیاست میں اپوزیشن کا محور تھے۔

چونکہ مسٹر بھٹو کی مخالفت پاکستان میں اِسلامی عناصر کا اتحاد اور ''نظامِ مصطفیٰ'' کا مطالبہ تھا، لہٰذا جنرل ضیاء الحق کو مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے بعد ضرورت تھی کہ وہ اِسلامی عناصر کی ہمدردیاں حاصل کرے۔ ویسے بھی اُن سے اِختلاف کے باوجود وہ مذہبی رجحانات کے حامل تھے۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے مولانا مودودیؒ کو تاحیات ''سینئر سیاستدان'' کا درجہ دیا، اور آپ کے بیانات صفحہ اول کی زینت بنتے رہے، تا آنکہ مولانا مودودیؒ جو برائے علاج امریکہ گئے تھے، ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو بفیلو (نیویارک) کے مقام پر وفات پا گئے اور آپ کی میت لاہور لائی گئی۔ آپ کی نمازِ جنازہ دس لاکھ سے زائد افراد نے ادا کی اور اپنی رہائش گاہ اچھرہ، لاہور میں مدفون ہوئے۔ آپ کی قبر عقیدت مندوں کے لیے ایک مستقل زیارت گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔

Marfat.com

جنرل ضیاء الحق کی حکومت کا عرصہ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء گیارہ سال ہے۔ جبکہ ایک اسلام دشمن غیر ملکی طاقت نے ایک گہری سازش کے ذریعہ اپنی سازش کا نشانہ بنا کر ایک فضائی حادثہ میں موت سے ہمکنار کر دیا، جسکے نتیجہ میں نہ صرف آپ، بلکہ اُس غیر ملکی طاقت کا اپنا سفیر بھی موت سے ہمکنار ہوئے، اور ہوائی جہاز میں سو سے زائد جو مسافر تھے، وہ بھی موت سے ہم کنار ہوئے۔

جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں جماعت نے ملک میں ایک مضبوط سیاسی اور نظریاتی طاقت حاصل کر لی، جسے جنرل ضیاء الحق کی تائید حاصل تھی۔ حتیٰ کہ ایک عرصہ وفاقی کابینہ میں بھی جماعت وزارت میں شامل رہی اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر جماعت سے متعلق افراد فائز رہے، اور جماعت کے نظریات حکومتی پروگراموں میں نظر آتے رہے۔ ملک کو اسلامیانہ بنانے میں حکومت کا ساتھ دینے کے علاوہ حکومت کی خارجہ پالیسیوں بالخصوص رُوس کی افغانستان پر جارحیت کے خلاف جنگ میں پورا ساتھ دیا۔ جماعت کے کارکنوں نے ہر ماہ لاکھوں افراد سے مالی اعانت حاصل کر کے افغان مجاہدین کو فراہم کی۔ جو جماعت کے افراد کا منفرد کام تھا، اور اُن عناصر کی کوششوں کو ناکام بنانے میں کوئی کمی روا نہ رکھی، جو صوبائی خود مختاری کے نام پر ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ بعد ازاں جماعت نے جنرل ضیاء الحق کی بعض پالیسیوں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا، لیکن ملکی سیاست میں اب اُسے جنرل کی حامی جماعت ہی خیال کیا جانے لگا۔ اگرچہ سازش کے تحت فضائی حادثہ کے نتیجہ میں ضیاء الحق کی حکومت کے وقار میں کافی کمی آ گئی تھی، اِسی طرح جماعت کی عوامی مقبولیت میں کمی واقع ہوگئی اور پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں دوبارہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں فضائی حادثہ کے نتیجہ میں جنرل ضیاء الحق کی وفات کے بعد جو قومی انتخابات ہوئے، جماعت اسلامی نے اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کے ساتھ مل کر قومی اسمبلی کی آٹھ اور صوبائی اسمبلیوں میں تیرہ نشستیں حاصل کر سکی۔ پھر ۱۹۹۰ء میں دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا، تو اِس بار بھی قومی اسمبلی میں آٹھ اور صوبائی اسمبلیوں میں بیس نشستیں حاصل کر سکی۔ لیکن ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں آزادانہ حصہ لیا، تو یہ انتخابات جماعت کی بدترین شکست تھی،

Marfat.com

جس میں قومی اسمبلی میں صرف تین اور صوبائی انتخابات میں صرف چھ نشستیں حاصل کر سکی۔

ضیاء کا دور حکومت بوجہ فضائی حادثہ ختم ہونے کے بعد اگرچہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بظاہر یہی نظر آتا تھا، کہ جماعت ایک ناکام جماعت ہے، لیکن اِن انتخابات میں جماعت کا حصہ لینے سے یہ واضح ہو گیا تھا، کہ جماعت ایک ایسی مضبوط قوت ہے، جس کے معاشرتی اور کلچرل اثرات بہت زیادہ ہیں۔ جس کا پاکستان کے سیاسی توازن پر اُس کا مضبوط تنظیمی ڈھانچہ ہے، (جس کا پاکستان میں اُس کا کوئی حریف نہیں) اور ملک کا کوئی ایسا حصہ نہیں، جہاں اُس کے اثرات نہ ہوں، اور پارلیمنٹ میں کوئی نشستیں حاصل نہ کرنے کے باوجود جماعت ملک کی ایک سیاسی جماعت ہے۔ جو اپنے مضبوط سیاسی نظم ونسق اور ڈھانچہ کی وجہ سے ملک کی ایک سیاسی موثر قوت ہے۔ جس کا عکس اُس کا ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۲ء اسلامی جمہوری اتحاد تشکیل دینے میں سامنے آیا۔

جماعت کے ڈھانچہ میں تبدیلی اور تسلسل:

پاکستان میں اپنے قیام کے بعد چھ عشروں میں کئی اہم داخلی تبدیلیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ جو سیاست پر اُس کی گہری نظر کی عکاس ہیں۔ کئی مرتبہ اندرونی موقع پرستوں کے شوشوں اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر دوبارہ منظم کرنا ناگزیر ہوا، اور ایک امیر جماعت کے بعد دوسرے امیر جماعت کا انتخاب اِس کے علاوہ، اپنے قیام کے بعد تین مرکزی امرا اپنے عہدوں سے از خود فارغ ہوئے ہیں، اب ۲۰۰۹ء میں جماعت کے آئین کے تحت سید منور حسن امیر جماعتِ اسلامی پاکستان منتخب ہوئے ہیں۔ پہلے امیر اور بانی جماعت کا دور امارت ۱۹۴۱ء تا ۱۹۷۳ء ہے۔ دوسرے امیر جماعت میاں طفیل محمد ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۷ء اور تیسرے امیر قاضی حسین احمد کا دور ۱۹۸۷ء تا ۲۰۰۹ء ہے۔ جبکہ سید منور حسن چوتھے امیر ۲۰۰۹ء میں منتخب ہوئے ہیں۔ ان شخصیات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

اِسی طرح معاشرتی بنیادوں پر جماعت میں تبدیلیاں نظر آتی ہیں، جماعت جن معاشرتی گروہوں کا مجموعہ ہے، وہ ملکی آبادی کی مڈل کلاس، سفید پوش طبقہ اور تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد انڈیا سے ہجرت کرنے والے مہاجرین اور اب اُن کی اولادیں ہیں۔ مقامی آبادی میں

Marfat.com

پنجاب کے لوگ اور اب صوبہ سرحد کے پٹھان بھی جماعت میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ پاکستان کی سالمیت قائم اور زندہ رکھنے کے لیے اخوتِ اسلامی کے جذبہ سے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور پاکستان کو اسلامی ریاست کی شکل دینے کے لیے سیاست کے میدان میں آ کر پڑھے لکھے باشعور افراد کو اپنی قوم کا محور بنایا ہے۔ اِس وجہ سے جماعت عوامی پارٹی نہ بن سکی اور اِس لحاظ سے اُس نے اپنی تعداد بڑھانے اور دکھانے کی بجائے تنظیم کے نظم و نسق اور ڈسپلن کی پابندی کو اپنی طاقت خیال کیا ہے، اور نوجوان کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء جنہوں نے اپنے مستقبل میں حکومتی نظم و نسق اور دیگر اداروں میں ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں، اور سیاسی لیڈر بننا ہے اور اِن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اِسلامی جمعیۃ الطلباء جیسی طلبا کی معروف تنظیم جس کی مدِ مقابل نظریاتی اور ڈسپلن کے لحاظ سے کوئی دیگر تنظیم نہیں اور اُس کو بہترین افراد اِسی تنظیم سے دستیاب ہوئے ہیں، جو نوجوانی میں جمعیۃ کے رُکن تھے اور اب جماعت کے علاوہ ملک کے بلند مرتبہ لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں، جو بہترین سیاستدان ہیں۔

مولانا مودودیؒ کے نظریات اور جماعتِ اسلامی کے احیائے اسلام کا ایجنڈا ایران اور مصر میں احیائے اسلام سے قدرے مختلف ہے، لیکن بنیادی طور پر سب ایک ہیں، جبکہ مولانا مودودیؒ کے نظریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے الجزائر تا ملائیشیا تمام اِسلامی جماعتیں انتخابات کے ذریعے اقتدار سنبھال کر اپنے اپنے ممالک کو اِسلامی ریاستوں کی شکل دینے اور عوام کی مشکلات کو دُور کرنی کی کوشش کر رہی ہیں۔

Marfat.com

۵

آیت اللہ روح اللہ خمینی

تلاشِ حق: فلسفہ اور حقیقت

۱۹۰۲ء تا ۱۹۹۰ء

باقر معین

دورِ حاضر میں مذہبی بنیادوں پر کسی ملک کو ایک عملی اسلامی ریاست کی شکل دینے میں آیت اللہ خمینی کو پہلی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ بطور ایک عملی سیاستدان اُن کے بارے میں متضاد آرا ہیں۔ بہت سے اصحاب کی رائے میں وہ اسلام کا تاریک پہلو ہیں اور کٹر مذہبیت کے خلیفہ۔ جبکہ اِسی طرح بہت سے اصحاب کے نزدیک آپ دین کے محافظ، جنھوں نے اِسلام کو زوال سے بچا کر نہ صرف بدعنوانیت اور مغرب زدگی کا خاتمہ کیا۔ بلکہ اِسلام کے تقدس اور طاقت کو بحال کیا، اور اُن عسکریت پسندوں کے لیے جو غلط نظم و نسق کے خلاف ایک چیلنج ہیں، آپ ایک نمونہ ہیں۔ لیکن خود ایران جس کو آپ نے ایک اسلامی انقلاب سے آشنا کیا۔ ایک عشرہ سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اپنی جاذبیت کھو چکا ہے۔ مزید برآں اُن کا یہ فرمانا کہ اِسلام تمام مسائل کا حل ہے، صحیح ثابت نہیں ہوا ہے، بلکہ کئی پیچیدگیوں میں مُبتلا کر دیا ہے۔ لیکن اپنی جگہ جن امور نے آپ کو ایران میں انقلاب لانے کا داعیہ دیا، اُن میں آپ کی مذہبی تعلیم بطور سکالر، پہلوی بادشاہت کے ہاتھوں ایرانی علماء کی تذلیل اور اسلام کے زوال کو دخل ہے، اور اِن سے عہدہ برآں ہونے کے بارے میں آپ کی صوفیانہ فکر ''انسانِ کامل'' کا اثر ہے۔

Marfat.com

پسِ منظر:

آپ کا اصل نام رُوح اللہ ہے، جبکہ ایران میں ''آیت اللہ'' اُن علماء کے لیے مختص ہے، جیسا کہ اہلِ سنت والجماعت میں ''مفتی''۔ آپ ایران کے چھوٹے سے گاؤں ''خمین'' Khomein میں ۲۴ ستمبر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے، آپ کا خاندان مُوسوی سادات سے تعلق رکھتا ہے، جن کا نسب پیغمبر اسلام کے بعد ساتویں شیعی امام حضرت موسیٰ کاظم سے جا ملتی ہے۔ آپ کا خاندان اولاً شمال مشرق ایران کے شہر نیشاپور مین آباد تھا۔ لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں اِنڈیا کے صوبہ اودھ کے مشہور شہر لکھنؤ کے نزدیک قصبہ کنٹور Kintur نقل مکانی کر گئے، جب اِس صوبہ پر بارھویں شیعی امام کے خاندان کی حکمرانی تھی، آپ کے دادا سید احمد موسوی ہندی اودھ کے گاؤں کنٹور میں پیدا ہوئے تھے، جو ایران میں میر حامد حسین نیشاپوری کے ہم عصر اور رشتہ دار تھے۔ وہ اپنی شیعی کتاب ''ابا قات الانوار'' کے مصنف ہیں، اور یہ کتاب اِنڈیا کے شیعوں میں بڑی مشہور ہے۔

جناب احمد موسوی ۱۸۳۰ء میں نجف کے مشہور شیعی مقدس مقام زیارت کے لیے آئے اور یہاں خمین کے ایک بڑے زمیندار اور سوداگر سے ملاقات ہوئی، اور اُس نے آپ سے فرمائش کی کہ وہ اِنڈیا سے نقل مکانی کر کے اُس کے ہاں چلے آئیں۔ آپ نے ابھی شادی نہ کی تھی اور سوداگر کے ساتھ خمین چلے آئے۔ خمین آنے پر آپ نے میزبان سوداگر کی بیٹی سکینہ سے شادی کر لی، جس سے مصطفیٰ سمیت چار بیٹے پیدا ہوئے۔ مصطفیٰ آپ کے والد ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ جو آپ سمیت چھ بچوں کے والد تھے، جبکہ آپ سب سے چھوٹے تھے۔ جناب مصطفیٰ اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نجف آئے اور وہاں وقت کے شیعی عالم جناب مرزا حسن شیرازی کے حلقہ درس میں شامل ہو کر ۱۸۹۴ء میں بطور ایک شیعی عالمِ دین واپس وطن خمین لوٹے، اور ایک معروف عالمِ دین شمار ہوئے۔ لیکن ایرانی بادشاہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے آپ ۱۹۰۲ء میں امام خمینی کی پیدائش کے بعد قتل ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں ۰۶-۱۹۰۵ء میں بادشاہ کے خلاف ایک آئینی بادشاہت شکل دینے کی تحریک چلی۔ جو کامیاب ثابت ہوئی اور مغربی طرز کی آئینی

Marfat.com

بادشاہت جاری کی گئی، لیکن اگلے سال اُس کا انتقال ہو گیا، پھر اُس کے جس بیٹے نے اقتدار سنبھالا۔ وہ ایک بار پھر آئین کے خلاف تھا۔

اپنے والد کا قتل امام خمینی کے لیے بڑا کرب ناک ہو سکتا تھا، لیکن اپنے بھائی کی محبت ماری بہن "صاحبہ" نے اپنے بھائی کی اولاد کی دیکھ بھال اور تربیت کی خاطر بھاوجہ کا ساتھ دیا، بالخصوص امام خمینی جن کا نام رُوح اللہ تھا، کی پرورش اور تربیت پر خاص توجہ دی۔ لیکن ابھی آپ کی عمر سولہ سال تھی، کہ آپ کی پھوپھی اور والدہ دونوں انتقال کر گئیں۔

کچھ خاندانی اثرات اور کچھ خداداد ذوق آپ کو بچپن ہی سے حصولِ علم کا شوق تھا، چنانچہ آپ نے بچپن سے گورنمنٹ سکول میں عربی زبان اور فارسی شاعری سیکھنے پر توجہ دی اور "مکتب" جو ایران میں خوش خطی سیکھنے کا ارادہ ہوتا تھا، وہاں خوش خطی سیکھنی شروع کی۔ ایک بزرگ خاتون جو گاؤں میں "مُلاّ" کے نام سے مشہور تھی، اُس سے آپ نے عربی حروف تہجی اور عربی ادائیگی تلفظ سیکھنا شروع کیا۔ اُس زمانے میں بچے زمین پر بچھی دری پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے، اور اُستاد جو کچھ پڑھاتا تھا، اُسے زبان سے دُہراتے تھے، جبکہ مکتبوں میں بچوں سے استادوں کا سلوک انتہائی سخت تھا۔ اِن مکتبوں میں بچوں سے قرآنِ کریم کے ایک لفظ کے لہجے کی غلط ادائیگی سخت سزا کی مستحق تھی (نوٹ: یہاں برصغیر میں بھی مذہبی مدارس میں اُستاد بچوں کو سزا دینے کے لیے ڈنڈا استعمال کرتے تھے، ایسا ہی ایران میں بھی ہوتا ہوگا)۔

بچپن میں دورانِ تعلیم جیسا کہ دینی مدارس کا معمول ہے، آپ کو بھی قرآنِ کریم کے آخری پارے کی چند سورتیں حفظ کرائی گئیں اور حضورِ اکرم ﷺ اور بارہ شیعی اماموں کی پاکیزہ زندگیوں کے بارے میں سبق پڑھائے گئے۔ مزید برآں شیعی مکتبہ فکر کے مطابق کافی احادیث بھی حفظ کرانے کے ساتھ شیعیت کی تاریخ بھی یاد کرائی گئی، بالخصوص یہ امر کہ حضورِ اکرم ﷺ سمیت تمام اماموں کی وفات طبعی نہ تھی۔ جس کے بارے میں شیعی مکتبہ فکر کے مطابق اِن تمام کی یہ کہاوت مشہور ہے "یا ہم کو زہر دیا جائے گا یا قتل ہوں گے۔"

شروع ہی سے آپ کے ذہن میں یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ "یہ دنیا حق و

Marfat.com

باطل'' کی جدوجہد ہے، اور عمر بھر آپ نے اِس حقیقت سے منہ نہ موڑا کہ یہ ایسی نہ ختم ہونے والی جنگ ہے، کہ باطل طاقتیں اپنے زورِ قوت سے حق کو مٹا دیں، جب کہ حق مادی قوت کی برتری کو ہمیشہ چیلنج کرتا رہے گا، جس کے نتیجہ میں باطل کا غرور ہمیشہ مایوسی کا شکار رہے گا۔ بطور ایک شیعہ اُن کی فکر کا یہی مرکز رہا جس میں آپ نے شیعیت کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنی زندگی کا مقصد یہی قرار دیا، کہ حالات کو سدھارنے کے لیے انتقام ہی علاج ہے۔ جو آپ نے بچپن میں گھر سے مکتب اور مسجد سے مدرسہ بار بار سنی۔ پیغمبر آخرالزماںؐ زندگی بھر دشمنوں کا نشانہ رہے۔......لہٰذا اہلِ تشیع کا یہ فرض ہے کہ وہ زیادتی سے انتقام لیں۔

امام خمینی کی تعلیم:

اِس تفصیل کے بعد جناب رُوح اللہ (امام خمینی) نے بچپن سے اپنی تعلیم پر زیادہ سنجیدگی اختیار کی۔ جب آپ کی عمر پندرہ سال ہوئی، آپ نے عربی گرامر اپنے بھائی مرتضیٰ سے سیکھنی شروع کی۔ جنہوں نے عربی زبان خود اصفہان سے حاصل کی تھی۔ جبکہ رُوح اللہ تعلیم حاصل کرنے پر زیادہ محنت کرتے تھے۔ بالخصوص فارسی شاعری انکی زیادہ توجہ کا مرکز تھی۔ فارسی شاعری میں قرونِ وسطیٰ کی اخلاقیات کی شاعری کا زیادہ ذوق تھا۔ بالخصوص ''گلستانِ سعدی'' اور ''حافظ شیرازی'' جن میں تصوف کی کشش تھی، آپ بڑی دلچسپی سے یاد کرتے تھے۔ چنانچہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ کوئی ایسا معروف فارسی شاعر نہیں، جس کی شاعری آپ کو حفظ نہ ہو، اور آپ نے اپنی تحریروں میں اُس کا حوالہ نہ دیا ہو۔ آپ کے ایک ہم عصر ایرانی شاعر نادر نادر پوری جو آپ سے صدی کے چھٹے عشرے میں ''قم'' میں ملتے رہے ہیں۔ اُن کا لکھنا ہے، کہ ''ہم چار گھنٹے تبادلہ شعروشاعری کرتے تھے۔ میں کسی شاعر کے ایک شعر کا مصرعہ پڑھتا تھا، جبکہ فوراً دوسرا مصرعہ آپ پڑھ دیتے تھے۔ آپ کو فارسی خوش نویسی کا بھی بڑا ذوق تھا، جو آپ نے ایران کے وقت کے خوش نویس شیخ حمزہ محلاتی سے بدرجہ اتم سیکھی۔ یہ وہ فن تھا، جو آپ نے اپنی ضعیف العمری میں بھی نہ چھوڑا۔

آپ وسطِ ایران میں پیدا ہوئے اور وہاں ہی تعلیم و تربیت پائی، جہاں سے شیعی اسلام

Marfat.com

کی معروف شخصیات اُبھریں۔ جن میں سکالرز اور مذہبی شخصیات شامل ہیں۔ شیعیت میں ایک عالم کا ''مجتہد'' ہونا بڑا مقام ہے، یہ مقام حاصل کرنا ''آیت اللہ خمینی'' قرار دیئے جانے سے قبل ضروری تھا۔ جو جواں سال رُوح اللہ کے لیے اپنے مقامِ وطن خمین ایک چھوٹی سی بستی میں حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ جبکہ نجف (عراق) جا کر تعلیم حاصل کرنا بھی ممکن نہ تھا، البتہ اصفہان جو ایران ہی کا مشہور شہر ہے اور یہ بھی اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مناسب شہر تھا، آپ نے اپنے مقامِ وطن خمین کو خیر باد کہا، اور آپ اصفہان آ گئے۔ اصفہان آ کر آپ نے شیعی عالم شیخ عبدالکریم حائری یزدی کا تذکرہ سنا، جو عراق کے عالم تھے، اور سیاسی وجوہ کی بنا پر شیعی مقدس مقام کربلا سے تارکِ وطن ہو کر اصفہان چلے آئے تھے۔ کیونکہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اب عراق برطانوی حکومت کا حصہ تھا اور جناب حائری اصفہان کے نزدیکی قصبہ سلطان آباد میں رہائش پذیر تھے۔ جس کا دوسرا نام ''آراک'' تھا۔ اپنا وطن خمین چھوڑ کر جب آپ اصفہان آئے تو آپ کی عمر ۱۷ سال تھی اور آپ نے علامہ حائری کا نام سنا۔ چنانچہ آپ نے نجف جانے کی بجائے ''آراک'' آ کر علامہ حائری کی شاگردی اختیار کر لی۔

''آراک'' میں علامہ حائری نے ایک مذہبی و شیعی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی، جس میں علامہ حائری کو ''آراک'' کے عالم حاجی آقا محسن ''آراکی'' کا تعاون حاصل تھا اور مدرسہ کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں رکھی گئی تھی۔ آراک آ کر آپ نے علامہ حائری سے (جو شاہی حکومت کے مخالف تھے) عربی گرامر ''السیوطی'' پڑھنا شروع کی۔ جو مصری مشہور عالم جلال الدین السیوطی کی تصنیف ہے اور صدیوں سے عالمِ اسلام کے دینی مدارس میں نصابی تعلیم کا حصہ ہے۔ ''حصولِ علم'' زندگی بھر آپ کی زندگی کا جزو رہا ہے اور ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اِس میں کوئی رُکاوٹ حائل نہ ہو۔ جس میں آپ نے کبھی اِس کی پرواہ نہیں کی ہے، جس میں ایک مثال یہ ہے کہ ''ایک روز آپ دیگر چند طلباء کے ہمراہ مدرسہ کے صحن میں ''سیوطی'' پڑھ رہے تھے اور نزدیک علامہ حائری دیگر طلباء کو اعلیٰ تعلیم پڑھا رہے تھے، علامہ حائری کی آواز بہت اُونچی تھی، جس وجہ سے آپ کی اور آپ کے ہمراہی طلباء میں خلل پڑ رہا تھا، چنانچہ آپ سے نہ رہا گیا، اور آپ علامہ حائری سے مخاطب ہوئے

Marfat.com

اور گزارش کی کہ آواز کم کریں۔ جس پر علامہ حائری ایک طالب علم کی فہمائش پر بڑے حیران ہوئے۔ لیکن آپ بھی ایک عام طالب علم نہ تھے، چنانچہ انہوں نے فہمائش کا بُرا نہ مناتے ہوئے آپ کی دستار بندی کا حکم دیا اور آپ ''سیاہ دستار'' سے سرفراز ہو گئے۔

۱۹۱۷ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ اور عراق کا برطانیہ کا مقبوضہ بننے کے بعد معروف شیعی علماء کا عراق میں رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ اِن علماء نے عراق سے ترکِ وطن کر کے ایران کے شہر ''قُم'' آنا مناسب خیال کیا۔ جو پہلے سے آٹھویں شیعی امام رضا کی ہمشیرہ معصومہ کی زیارت گاہ تھی اور اِس وجہ سے ایران کا بڑا شہر تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ اور عراقی شیعی علماء کے ''قم'' منتقل ہونے کی وجہ سے اِس کی اہمیت بہت بڑھ گئی، جس وجہ سے علامہ حائری بھی ۱۹۲۱ء میں ''قُم'' منتقل ہو گئے، جس پر آپ کا بڑا خیر مقدم کیا گیا اور آخری ایرانی قاچار بادشاہ احمد شاہ نے خود آپ کی خدمت میں حاضری دے کر آپ کا دینی بلند مقام تسلیم کیا۔ علامہ حائری کے ''قُم'' منتقل ہونے کے بعد امام خمینی بھی قم آ گئے اور حضرت معصومہ کے مزار کے قریب اپنی رہائش گاہ منتقل کر دی۔ اُن دنوں آپ ایک فلسفیانہ کتاب ''متوکل'' Matavacal مطالعہ کر رہے تھے۔

''آراک'' سے ''قُم'' نقل مکانی کرنے کے بعد آپ کے نئے اُستاد محمد رضا مسجد شاہی تھے، جن سے شیعی دینیات اور شعر و شاعری سیکھنے کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ لیکن یہ صاحب ڈارون کے فلسفہ ارتقا کے بھی دلدادہ تھے۔ لیکن سوائے مطالعہ اُس کے پرستار نہ تھے۔ بلکہ دیگر علماء کی طرح ڈارون کے فلسفہ کی مذمت بھی کرتے تھے اور اُس پر انگریزی کتاب Critique od Darwin Philasaphy بھی تصنیف کی۔ جس کا خمینی صاحب مطالعہ کرنے کے ساتھ اُستاد کے ساتھ اُس پر بحث بھی کرتے تھے۔

آپ نے شیعی اصولِ فقہ اور فقہ کے بارے مین اپنی تعلیم ''کاشان'' کے ایک عالم سے مکمل کی۔ جو عمر میں آپ سے سترہ سال بڑے تھے، اور اُن کا نام علی یثربی کاشانی تھا۔ جو ۱۹۵۹ء میں فوت ہوئے۔ آیت اللہ کاشانی سے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے ایک بار پھر علامہ حائری کی شاگردی اختیار کی۔ جو ایک نصابی تعلیم نہ تھی، بلکہ ''درس سے خارج'' لیکچر تھے،

Marfat.com

جس میں کتابوں کا دخل نہ تھا۔ بلکہ طلباء کو بعض موضوعات دے دیئے جاتے تھے کہ وہ اُن پر اپنی رائے لکھیں۔ یہ آپکا حصولِ تعلیم کا آخری مرحلہ تھا۔ چنانچہ اِسکے بعد ''سند کے ساتھ آپکو مجتہد کا درجہ حاصل ہوگیا۔ جسکے مطابق وہ اپنے چار جید علماء کے حوالہ سے احادیث کا حوالہ دے سکتے تھے۔

اِن چار علماء میں سے پہلے عالم کا نام محسن امین عاملی ہے، جن کا شمار لبنان کے مشہور علماء میں ہوتا ہے۔ اُنکے جانشین جناب موسیٰ الصدر ہوئے، جو اِس کتاب کی ایک نامور شخصیت ہیں، اور لبنان کے اہلِ تشیع علماء میں ایک جید عالمِ دین کا ہے، جناب محسن امین کا ۱۹۵۲ء میں انتقال ہوا۔

آپ کے دوسرے جید اُستاد کا نام شیخ عباس قُمی ہے۔ جو بڑے شیعی محدث اور مؤرخ تھے اور آپ کی دُعاؤں کی کتاب کی مقبول ترین تصنیف ''مفتاح الجنت''، ''کلیدِ فردوس'' ہے۔ جو ایرانی انقلاب کے بعد سب جنگی رضاکاروں میں تقسیم کی گئی۔ جس کی مغربی پریس نے امام خمینی کی مخالفت میں غلط ترجمانی سے کام لیا جن کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔

آپ کے تیسرے اُستاد ابو القاسم اصفہانی تھے، جو اصفہان ایک جید شیعی عالم تھے، آپ کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ آپ کے چوتھے اُستاد محمد رضا مسجد شاہی، شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کے سخت مخالف تھے اور ۱۹۲۵ء میں شاہ کے خلاف تحریک چلانے کے لیے قُم آئے۔ آپ کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

۲۷ سال کی عمر میں آپ نے تہران کے ایک آیت اللہ کی بیٹی ''بتول'' سے شادی کی اور زندگی بھر آپ کی رفیقہ حیات رہیں اور اُن سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

اِنسانِ کامل کی تلاش میں:

جب آپ ''قُم'' میں قانون اور عدلیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، تو آپ کے مطالعہ میں اِسلام کی غیر روایتی تعلیمات بھی مطالعہ میں تھیں یعنی ''عرفان اور حکمت''، جن کی رُو سے اپنی زندگی اور دُنیا کا مشاہدہ تھا۔

''عرفان'' ایک عربی لفظ ہے جو ''رُوحانیت'' کے معنوں میں آتا ہے کہ صوفیانہ انداز اپنا کر انسان کیونکر ''قُربِ خدا'' حاصل کرے۔ جبکہ یہ شیعیت میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ جو

Marfat.com

قدرے حدود کے ساتھ ''تصوف'' کا ہی حصہ ہے۔ جبکہ ''حکمت'' عقل و دلائل کے ساتھ ''عالمانہ فکر'' ہے۔ جس کے اپنانے سے ''حقیقت'' سامنے آتی ہے۔ جو ''عرفان'' ہی کی راہ ہے۔ اسکی ابتدا تیرھویں صدی کے معروف شیعی عالم نصیر الدین طوسی سے ہے۔ جو مشہور شخصیت ''بوعلی سینا'' کے خیالات کا دفاع کرتے تھے، جبکہ ''بوعلی سینا'' کی فکر میں دینی لحاظ سے ناپختگی تھی اور امام غزالی اُس کے سخت نقاد تھے اور اُس کے مقلدین کو سنی سنائی باتوں کا پیروکار سمجھتے تھے۔ ''ابن اعرابی'' قرونِ وسطیٰ کی ایک اور شخصیت تھیں، جو ''حکمت'' کے صوفیانہ انداز میں تشریح کرنے میں معروف ہیں۔ جو ''تصوف'' کا مرکزی نقطہ نظر جس کے ذریعہ بلاواسطہ ''ان دیکھے'' خدا کے ساتھ تعلق پیدا ہوتا ہے اور اس کا نام ''باب'' Opening ہے۔

اِس حالت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً دینی احکامات کی پوری پابندی اور اُن پر عمل کیا جائے، جو رُوحانیت کی منزل ہے اور بالآخر عطیہ خداوندی کا سبب بنتا ہے۔ آپ کا دعویٰ تھا، کہ آپ کی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی ہے اور اُن سے ہی ''اِسم اعظم'' سیکھا ہے۔ جبکہ آپ کا سارا علم آپ کی ذاتی کوشش اور محنت سے نہیں، بلکہ بلاواسطہ ''الہامی'' ہے۔

صفوی شاہی خاندان کے دور میں شیعیت کی ایک نامور شخصیت صدر الدین شیرازی عُرف ''مُلّا صدر'' گزری ہے (وفات ۱۶۴۱ء) جنہوں نے ''حکمت'' کی تعبیر و تشریح میں کافی کام کیا ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ''الاسفار الاربعة'' ''چار سفر'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جن کی بنیاد ''حکمة المتعالیہ'' ہے۔ جس میں سچی حقیقت کا براہِ راست علم ہے۔ جو بلا کسی آمیزش اپنے موضوع اور مقصد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور اِس کے ساتھ مقصد کا علم۔

''عرفان'' کا ایک اور مظہر جو آیت اللہ خمینی کی شخصیت میں نظر آتا ہے، اُس میں فارسی شاعری کا دخل ہے۔ جس میں شیعی شاعری کے دو سنی بڑے مشہور شاعر ہیں۔ یعنی اولاً مولانا جلال الدین رُومی (وفات ۱۲۷۳ء) جن کا غالباً صوفی شعرا میں سب سے بلند مقام ہے۔ آپ کا ''قونیہ'' (ترکیہ) میں بڑا وسیع حلقہ مریدان تھا اور فارسی شاعری میں آپ کے دو لاجواب صوفیانہ کلام ہیں۔ ایک آپ کی ''مثنوی'' طویل فارسی شاعرانہ کلام جسے ''دیوان شمس تبریز'' بھی کہا جاتا

Marfat.com

ہے۔ مولانا رُومیؒ کو جناب شمس تبریز اپنی درویشی کی وجہ سے بے حد محبوب تھے جو آپ کے اِس شعر سے ظاہر ہے۔

مولوی ہرگز نہ شُد مولائے رُوم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شُد

آپ کے دوسرے محبوب ہستی شاعر حافظ شیرازی تھے (وفات ۱۳۹۰ء) جو آیت اللہ خمینی کی نظر میں ''حکمت'' اور ''عرفان'' کے درمیان ایک رشتہ تھے اور اپنے ہم عصر شاعر ''عمر خیام'' جنکی ''رُباعیاتِ عمر خیام'' مشہور فارسی کلام ہے اور مولانا رُومی کی صوفیانہ شاعری سے متاثر تھے۔

فلسفیانہ علم پر عبور حاصل کرنے کے بعد جناب خمینی نے ''تصوف'' اپنا مقصد بنا لیا۔ انہیں چودھویں صدیٔ عیسوی کے فلسفی شرف الدین داوٗد غیاری (وفات ۱۳۵۰ء) کی تصنیف ''شرحِ فسوس'' سے خاص دلچسپی تھی، جو ابن عربی کی تصنیف ''فسوس الحکام'' پر شرف الدین کا بے لاگ تبصرہ ہے۔ جبکہ خود ابن اعرابی کی تصنیف ''شرحِ فسوس'' انبیائے کرام حضرت آدم علیہ السلام حضورِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مشیتِ خداوندی کی صوفیانہ تشریح ہے۔ جبکہ جناب خمینی نے ۱۹۳۷ء میں ''فسوس'' پر اپنی تصنیف لکھی ہے۔

آیت اللہ خمینی اپنے اُستاد شاہ آبادی سے خاص طور پر متاثر تھے۔ جن سے انہوں نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ ''آپ جو فرما رہے ہیں، وہ آپ کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔'' لہٰذا آپ فرمائیں، یہ کہاں سے ہے؟'' جسکے جواب میں جناب شاہ آبادی نے فرمایا: ''یہ میری اپنی رائے ہے۔''

شاہ آبادی جن کے نزدیک مسائل میں خاموشی دُور کی بات تھی، اُن کا تعلق مُلّاؤں کے ایک چھوٹے سے گروہ سے تھا اور وہ شاہ ایران رضا شاہ کی پالیسیوں کے سرگرم مخالف تھے، جناب شاہ آبادی کی اِس سیاسی فکر نے آیت اللہ خمینی کو بھی متاثر کیا۔ شاہ آبادی مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے منصوبہ بندی پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ آپ طلبا کو اِس امر پر زور دیتے تھے، کہ وہ اپنی بات کو عوام میں مقبول بنانے کیلئے آسان زبان استعمال کریں اور اِس بارے میں ایک حدیث کا حوالہ دیتے تھے

Marfat.com

''لوگوں سے اُن جیسی عقل کی سطح پر بات کریں۔''

یہ ایک ایسا سبق تھا، جسکے مطابق زندگی بھر آپ نے کام لیا اور یہ بڑا کامیاب اور مؤثر رہا۔

اغیار کی ذہنی اور جسمانی غلامی سے آزادی کے لیے جناب شاہ آبادی نے اپنے حلقہ معتقدین کو یہ چار بنیادیں اپنانے پر زور دیا:

۱) عوام میں اپنی مذہبی فکر اور اُس پر عمل کرنے کو پھیلانے کے لیے ایک میگزین شائع کیا جائے۔

۲) اپنی روزمرہ کی زندگی کو مقبول بنانے کیلئے مکروہ عادات ترک کی جائیں۔

۳) ایک اسلامی صنعتی کمپنی قائم کی جائے، جو گھریلو استعمال کی اشیا ایرانی عوام کے استعمال کے ساتھ برآمد بھی کرے۔

۴) ایک بلاسود قرض دینے کا ادارہ قائم کرے۔ جس سے اوسط درجہ کے لوگ استفادہ کرسکیں۔

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، امام خمینی اُس سے بہت زیادہ متاثر تھے کہ جناب شاہ آبادی نہ صرف کٹر مذہبی اور صوفی مزاج تھے بلکہ ''مبارز'' یعنی جنگجو بھی تھے۔ جبکہ جناب خمینی نے یہ خصوصیات اپنے اندر بھی اپنائیں۔

دُعائیں آپ کا معمول تھا، بالخصوص ''دُعاء السحر''۔ جبکہ آپ کا عقیدہ تھا کہ ''پابندیٔ شریعت'' اور ''تصوف'' میں کوئی تصادم نہیں۔ آپ کا کہنا تھا، کہ جہاں ''عرفان'' اور ''تصوف'' باہم ہیں، وہاں پابندیٔ شریعت بھی ضروری ہے۔ جبکہ جو اصحاب موجودہ مغرب زدگی کا شکار ہیں، اُن کے بارے میں یہ بڑا مشکل ہے کہ وہ اِس بات کو تسلیم کریں۔

تصوف اور امام خمینی:

تصوف کے بارے میں امام خمینی کے بارے میں مضمون نگار باقر معین نے اپنا مضمون تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ آپ ایک طرف مولانا جلال الدین رُومیؒ، ان کے اُستاد شمس تبریزی، حافظ شیرازی اور سعدی شیرازی کے انتہائی معتقد ہیں۔ جو سنی العقیدہ اولیائے کرام ہیں، اور ان

Marfat.com

کا شمار پابندِ شریعت گوشہ نشین اولیائے کرامؒ میں ہوتا ہے جن کی عام فہم فارسی شاعری نے ہر دور کے فارسی خوان عوام وخواص کو نہ صرف عالمِ اسلام میں اپنا گرویدہ بنائے رکھا ہے، بلکہ عالمِ مغرب کے فارسی دان مستشرقین بھی ان اصحاب کے معتقد ہیں۔ اِن کی شاعری میں سادگی اور کوئی ابہام نہیں۔ امام خمینی کی مادری زبان بھی فارسی ہے، لہٰذا اِن اولیائے کرامؒ کا امام خمینی کا معتقد ہونا ابہام سے بالاتر ہے۔ دوسری طرف منصور حلاج، بوعلی سینا، ابن اعرابی وغیرہ ہیں، جن کے تصوف میں ابہام، انداز فلسفیانہ اور عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ جبکہ امام خمینی نہ صرف اِن سے متاثر ہیں، بلکہ آپ کا اپنا تصوف بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ لہٰذا یہاں تفصیل سے اُس کا ذِکر کیا جائے گا۔ ابتدائی زندگی کا آغاز یوں ہے، کہ مذہب کے نام پر جو علماء اپنی دکانیں چمکا رہے ہیں اور اپنے مدارس اور ادارے قائم کر رکھے ہیں، جبکہ عوام اُن سے بیزار ہیں۔ ایسے میں آپ تصوف کی ایک ''اندرونی روشنی'' کا پیغام لے کر عوام کے سامنے آتے ہیں، کہ علمائے کرام جن کی اکثریت روایتی مذہبی رسومات کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی، جن میں صحیح مذہبیت کم اور اِن علماء کے مفادات زیادہ تھے۔ آپ محتاط انداز میں اُن سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں۔ جبکہ مقامِ تصوف اتنا خطرناک ہے، کہ اِس مقام پر کھڑے ہونے والوں کی اپنی علیحدہ سوچ وفکر ہے۔ کہ اُس میں سادگی اور عام فہمی کم اور متردّدہ ابہام زیادہ ہے۔ جس وجہ سے خطرناک نتائج کی داعی۔ چنانچہ اُن اہلِ تصوف اصحاب جنہوں نے سادگی اور عام فہمی کا دامن چھوڑ کر بزعمِ خود ''صوفیانہ علم'' کا نہ سمجھ میں آنے والے علم کا دعویٰ کیا۔ جس میں فلسفیانہ پن تھا، ممکن ہے، صحیح ہو، لیکن سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے عوام وخواص سبھی کی طرف سے ردّ ہوا۔ جیسا کہ منصور حلاج نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگایا اور اِس کی ''عالمانہ'' تشریح میں کوئی کمی نہ چھوڑی، جسے کوئی نہ سمجھ سکا اور سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ ابن اعرابی نے دعویٰ کیا، کہ اُس کی حضور اکرم ﷺ سے ملاقات ہوئی ہے۔ اُس کی صداقت نہ کر سکا۔ لہٰذا عوام وخواص کے سب وشتم کا شکار ہوا۔ سہروردی بھی پھانسی پر چڑھا۔ اِسی طرح ''عین القطاط'' کو اولاً سولی دی گئی اور بعد ازاں لاش جلائی گئی۔ مُلّا صدرہ جو ایسے صوفیا کی آخری شخصیت ہیں، اُن کا تصوف بھی عام فہم نہیں، جس کا وطن شیراز ہے اور وطن بدر کر دیا جاتا ہے، امام خمینی اُس کے عقیدت مند ہیں۔

Marfat.com

اِن تمام صوفیا نے ابہامانہ انداز میں جس تصوف کا اظہار کیا۔ پس منظر میں ایک دوسرے کا عکس نظر آتے ہیں۔ جو منصور حلاج کا انداز تھا۔ چنانچہ ابن اعرابی کے تصوف کی بنیاد اِس فلسفہ پر ہے:

"دُنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے، ماسوائے تصور اور کچھ نہیں، یا شیشہ میں ایک عکس یا سایہ"

قرونِ وسطیٰ میں جو فلسفیانہ سوچ کے مالک تھے اور اہلِ تصوف کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اپنے غیر اسلامی فلسفہ کو ابہامیہ انداز میں چھپائے رکھا کہ عوام اور خواص کے غیض وغضب کا شکار نہ ہو پائیں، چنانچہ امام خمینی نے بھی شیعیت کے بعض پوشیدہ پہلوؤں Eosteric rispacts اور تصوف کو یک جا کیا، اور مذہب کے کٹر دلدادہ لوگوں کے غیض وغضب سے اِس وجہ سے محفوظ رہے۔ ان کے اظہارِ خیال میں نہ سمجھ میں آنے والی پیچیدگی کا عنصر تھا۔

جناب خمینی کی تحریر میں سادگی تھی، لیکن تصوف پر آپ کی تحریروں میں پردہ تھا۔ جب سے آپ کو "مجتہد" قرار دیا گیا، پبلک جلسوں میں انہوں نے دیگر علماء کا انداز اختیار کیا، اور فلسفہ اور تصوف کے نازک موضوعات پر تقاریر کرنے کی بجائے پابندیٔ قانون، شریعت و انصاف، قرآنِ کریم، احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شیعی اماموں کی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دیا۔

اِسلامی تاریخ ایسے واقعات سے پُر ہے، جس میں اصحاب شریعت، اہلِ تصوف اور فلاسفر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ اصحابِ شریعت کا زور وحیِ الٰہی پر ہے، جو بقایا دونوں کے مقابلہ میں سیدھا سادہ سبق ہے۔ جبکہ تصوف اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاواسطہ براہِ راست تعلق ہے۔ اکثر نومسلموں میں اِس کے لیے کشش ہے۔ لیکن جن لوگوں میں جذبۂ جہاد ہے اُن کی نظروں میں اِس کی وقعت نہیں۔ جناب خمینی نے اپنی ذات میں اِن تینوں خصوصیات کا مظاہرہ کیا۔ وہ بیک وقت پابندِ شریعت، بلند مرتبہ اہلِ تصوف اور ایک قابلِ احترام اِسلامی فلسفی۔ جبکہ ایران کی تاریخ میں وہ صفِ اوّل کے "جنگجو" نظر آتے ہیں۔

امام خمینی نے اپنے آپ کو سلسلۂ تصوف سے وابستہ کرتے ہوئے "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا، جس میں یہ کہا گیا، کہ زوالِ اسلام کی وجہ "انسانِ کامل" کا نہ ہونا ہے جبکہ تصوف کی

Marfat.com

رُو سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود آپ کی پیدائش سے قبل بھی تھا۔ جبکہ شیعی حضرات کا یہ بھی ایمان ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس نور کی روشنی سے منور تھے، آپ کی وفات کے بعد وہ روشنی حضرت علیؓ کو منتقل ہوئی اور آپکے بعد نسلاً درنسلاً دیگر شیعی اماموں کو تصوف میں ''حاکمیتِ کائنات'' ایک خاص نظریہ ہے، جس میں انسان کا اپنا مقام ہے۔ غیر شیعی تصوف میں ''انسانِ کامل''، ''نور''، ''شیخ'' یا ''صوفی'' کا مقام شیعی نظریہ تصوف سے مختلف ہے۔ شیعیت میں ''صوفی'' بہ الفاظِ دیگر ''ولی'' ہے۔ جو شیعی اماموں میں سے کسی ایک امام کی نسل سے ہوسکتا ہے یا ایک قلبی وجدان جیسا کہ ابن اعرابی۔ لیکن شیعیت میں جو ''ولی'' ہے وہ ''امام'' بھی ہے۔ جو ''امامِ وقت'' بھی ہوسکتا ہے۔ جبکہ غیر شیعی یا سنی تصوف میں صرف اور صرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک ہی ''انسانِ کامل'' ہے۔

شیعیت میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفاء امام، صوفیا اور ولی ہیں، اور روشنی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جسے ''ولایت تکوینی'' یا ''صوفیانہ قلبی وجدان'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ شیعیت میں اس کی اہمیت نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت یا ''ولایت تشریعی'' سے زیادہ ہے۔ اِس طرح سے یہ ''رُوحانی صوفیا'' نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی نمائندے ہوتے ہیں، جن کو آپ نے زمین پر اللہ تعالیٰ کی اپنی نیابت کی ذمہ داریاں سونپی ہوتی ہیں۔ اُن کی نادیدہ حکومت ''ولایت'' کی وجہ سے یہ دنیاوی نظام چل رہا ہے۔ وہ نہ ہو، تو یہ نظام جاری نہیں رہ سکتا۔

اپنی ''دعائے سحر'' کے تعارف میں آپ نے اِبن اعرابی، مُلّا صدرہ، مولانا رُوم اور حافظ شیرازی کے حوالہ جات دیئے ہیں، کہ ''انسانِ کامل'' اُس سلسلہ کی بقا کا ضامن ہے، جس کے ساتھ یہ سلسلہ مکمل ہوجاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے، جو اُس کی ذات کا عکس ہے۔''

"He is God's great sign, Created in God's image."

اولاً یہ ابن اعرابی کا ''انسانِ کامل'' کا نظریہ تھا، جسے خمینی نے تسلیم کیا اور اِس کے بعد مُلّا صدرہ جو ان کے نزدیک اُن کے ہیرو ہیں کے فلسفہ ''حکمة المتعالیہ'' کے قائل ہیں اور یہ ابن اعرابی کے فلسفہ ''عرفان'' پر یقین رکھتے ہیں۔ جو سہروردی کے ''فلسفہ اشراق'' کی تفسیر ہے اور اِسی طرح بوعلی سینا کے ''فلسفہ المشائی'' کی۔ اِن سب میں شیعیت نظر آتی ہے۔ ابن اعرابی کی تصنیف

Marfat.com

"سفرِ تطہیر" Journey of Purification ہے، جس میں اُس کی رُوحانیت کے چار سفر ہیں جبکہ مُلّا صدرہ نے بھی انسانیت کا بطور ایک انسان اور بطور رُوحانیت تجزیہ کیا ہے۔ خمینی اِس سے ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں اور اپنے سفر کو "انسانیت سے خدا تک" کا نام دیتے ہیں۔ اور اُسے "مِنَ الْخَلْقِ اِلَی الْحَقّ" کا نام دیا ہے۔ جس میں ایک "سالک" حق کی تلاش میں اپنی انسانی حدود کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ دوسرا سفر "خدائیت میں خدا" God in God ہے۔ جس میں انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے محاسن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تیسرے سفر میں سالک انسانوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لیکن قادرِ مطلق خدا سے اپنا رشتہ نہیں توڑتا، کیونکہ اب وہ اُس کے حُسن کا مظاہرہ کر چکا ہے، چوتھا اور آخری سفر وہ ہے، جس میں سالک خصوصیات الٰہی حاصل کر چکا ہے۔ اب اُس کا یہ کام ہے، کہ وہ دوسروں کو خداوند کریم تک رسائی میں اُن کی مدد اور ہدایت کرے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام اُن تک پہنچائے۔ یہ سالک کے لیے انتہائی نازک مرحلہ ہے۔ جہاں سالک کو نیابت خداوند اور علمِ نبوت کا ادراک ہوتا ہے اور اُس پر لازم آتا ہے کہ وہ بے شمار خداؤں کی بجائے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے۔ منافقت کی بجائے ایمان کی اور شرک کی بجائے اللہ تعالیٰ کی توحید کی اور غیر کامل کی بجائے کامل انسان بننے کی رہنمائی کریں۔ "انسانِ کامل" کے لیے سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ایسی حکومت قائم کرے، جس کی پالیسیاں صحیح سمت میں ہوں۔ عوام کو کامل انصاف مہیا کرے اور حکومتِ الٰہیہ کا مظہر ہو اور معاشرہ کو بھی کمالِ انسانیت سے متعارف کرائے۔

بطور ایک سالک آپ کی کتاب "معراج السالکین و الصلوۃ العارفین" بظاہر روزانہ دُعاؤں کا مجموعہ ہے، لیکن فی الحقیقت یہ ایک سالک کے لیے اُس کے چار سفروں کی رہنمائی ہے۔ اِس میں جہاں یہ کتاب ابنِ اعرابی، مُلّا صدرہ وغیرہ کی صوفیانہ اصطلاحات کا خاکہ ہے۔ وہاں انتہائی محتاط اور عام فہم زبان استعمال کی ہے اور دُعاؤں کی اقسام، نیت، اوقات، جسمانی صفائی اور عربی الفاظ کا صحیح تلفظ بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے، کہ ایک شخص یا یکسوئی کے ساتھ اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے۔ یا "عوام و خواص" کے لیے ایک علیحدہ نظام کا داعی ہے۔

Marfat.com

اکثر قرآنِ کریم کی آیات۔

۱) اکثریت نہیں سوچتی ۲) اکثریت نہیں سمجھتی ۳) اکثریت نہیں سبق لیتی۔ بلاشبہ یہ بھی خمینی کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ اِس کتاب کا انداز بے حد صوفیانہ ہے، جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کمالِ محبت کا مظاہرہ کیا ہے اور اُس میں اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان صوفیانہ رشتہ ہے۔

پروفیسر علاّمہ مہدی حائری یزدی جو خمینی کے استاد علاّمہ حائری کے بیٹے ہونے کے ساتھ خود خمینی کے شاگرد، ایران کے معروف سکالر اور اسلامی اور مغربی فلسفہ دونوں پر عبور رکھتے ہیں، اُن کی خمینی کے بارے میں رائے ہے:

''خمینی نے منصور حلاّج کا فلسفہ ''انا الحق'' اپنانے کی بجائے ''انا الحق والخلق'' کا فلسفہ اپنایا۔ منصور حلاّج اپنے فلسفہ کی صحیح تشریح نہ کر سکا اور سُولی چڑھ گیا، جبکہ خمینی کامیاب رہے۔ وہ نہ کسی حسابی ذہن کے مالک ہیں اور نہ معاشرے سے عدم دلچسپی کا شکار۔ لیکن اِس دور کے ایک بڑے مفکر صوفی ہیں۔''

انقلاب سے قبل آپ نے تصوف کے بارے میں اپنی تصانیف شائع نہیں کیں۔ اگر ملک میں سماجی اور سیاسی فساد نہ ہوتا، یا روایتی مُلاّ ماضی کے ملاّؤں کی طرح طاقتور ہوتے، تو بعید نہ تھا، کہ وہ بھی اُن کا نشانہ بن کر ایک داستان بن جاتے۔ خمینی کو اِن کٹر قسم کے ایران کے معاشرے پر مسلط علماء کی تصوف دُشمنی کا خوب علم تھا۔ لہٰذا جب بھی وہ کوئی بات منہ سے نکالتے تھے، وہ محتاط زبان استعمال کرتے تھے، وہ قرآنِ کریم کی آیات، احادیثِ رسول ﷺ اور کسی امام کی روایت کا حوالہ دیتے تھے۔ دراصل انقلاب کے بعد انہوں نے قرآنِ کریم پر ٹیلی ویژن پر اپنی تفسیر بیان کی، اپنے اُستاد علی اکبر حاکم سے بھی سخت الفاظ کا اظہار کیا، کیونکہ یہ وہ لوگ تھے، جو تصوف کے حلقہ سے باہر تھے، اور بلاوجہ تصوف سے دُشمنی رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خمینی کا جو دعویٰ تھا، بہت سے اصحاب کے لیے یہ ایک معمہ تھا۔ آپ کے بیٹے احمد کا کہنا ہے، کہ اُس کی والدہ اور اُن کے بہت سے دوست خوب سمجھتے تھے، کہ اُن کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے خصوصی رشتہ تھا اور آپ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جب کوئی بات کرتے تھے، تو

Marfat.com

خوف سے کانپتے تھے۔ انقلاب کے بعد جب کوئی سرکاری بڑے عہدیداران سے ملاقات کے لیے آتے تھے، اوران سے کسی مسئلہ پر کوئی بات کرتے یا اُس کا حل چاہتے، وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے بات کرتے، کہ اُس کی ذات کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔

اپنی ہی نجی محفلوں میں وقتاً فوقتاً ''کائنات اور انسان'' کے بارے میں اپنے صوفیانہ خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب آپ نے پارلیمانی ممبران اور سرکاری عہدیداران کو ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار پایا، تو آپ نے اِس پر اپنے رائے کا اظہار کیا کہ ''یہ سب کچھ خودغرضی کا نتیجہ ہے۔''

ایک مرتبہ جناب خمینی نے تہران میں اپنی ایک چھوٹی سی مسجد میں ایک محفل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو کسی دیگر مخلوق کو حاصل نہیں۔ اُس کے اندر محدود قوتِ حاکمہ کا حامل ہونے کی بجائے کامل قوتِ حاکمہ کی طلب ہے، اور یہ ایک خواب ہے، ماسوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ لہٰذا یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے، وہ فطرتاً اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُس کے لیے بے پناہ محبت رکھتا ہے اور محبت اُسی سے ہوسکتی ہے، جو اُس کا سب سے بڑا محبوب ہو۔ اِس کے لیے کوئی ظن آرائی یا ایجاد نہیں، کیونکہ فطرتِ انسانی کامل تلاشِ حق میں ہے، جبکہ فطرت کسی فریب کا شکار نہیں ہوسکتی'' مزید برآں خود فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی تکمیل کرے۔ جبکہ تمام انسان ''تکمیل انسانیت'' کے لیے کوشاں ہیں۔ چنانچہ جب وہ یہ مقصد حاصل کر لیتے ہیں، تو وہ ایک ہو جاتے ہیں اور کثرت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ پاتی۔

(نوٹ:...... یہ ایک ایسا فلسفہ ہے، جو عام فہم نہیں۔ جسے امام خمینی اور ان کا حلقہ مخصوص ہی سمجھ سکا ہوگا)۔

البتہ انسان کا المیہ یہ ہے، کہ اسے اگر ایک شہر کی حکومت حاصل ہو جائے۔ وہ اپنے دیگر ہزاروں دلوں کے ساتھ اِس پر مطمئن نہیں اور اُس کی کوشش ہوتی ہے، کہ اُسے پورے صوبے کی حکومت حاصل ہو۔ اگر اُسے یہ بھی حاصل ہو جائے تو وہ اِس پر مطمئن نہیں ہو پاتا اور اِس کے

Marfat.com

بعد اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام ملک پر اُس کی حکمرانی ہو۔ پھر اگر اُسے ایک ملک کی حکمرانی مل جائے، تو اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ دیگر کئی ممالک پر اُس کی حکمرانی ہو۔ اِس کے بعد اگر اُسے دُنیا بھر کی حکومت حاصل ہو جائے تو وہ اِس پر بھی قانع نہیں، حتیٰ کہ اگر تمام کائنات بھی اُس کی ملکیت میں ہو اسے بھی حقیر خیال کرتا ہے کہ ابھی اُسے کمال حاصل نہیں ہوا۔ جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ وسیع سمندر میں اپنے آپ کو قطرہ سمجھے۔"

"دراصل قناعت خاص عطیہ خداوندی ہے۔ جو اطمینان قلب کا باعث ہو سکتی ہے، نہ کہ کسی ملک کا پریذیڈنٹ یا وزیر اعظم ہونا، یا کسی بڑے ملک کا حکمران ہونا۔ جو چیز انسان میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے یا اُسے عدم استحکام اور احتیاج سے محفوظ رکھتی ہے، وہ "ذکرِ الٰہی" ہے۔ محض زبان سے "لا الٰہ الا اللہ" کہنا اور تلاوت کرنا کافی نہیں، بلکہ دل و ضمیر کی آواز سمجھ کر "ذکر" کرنا۔"

کیا یہ بات خود امام خمینی کی اپنی ذات کا عکس ہے، اِس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی کتاب "دُعائے سحر" جس پر آپکے ایک شاگرد نے اپنے تاثرات شائع کیے، ایک جگہ اُس نے لکھا ہے کہ

> "اگر مغربی فلاسفر دُنیا کو تضادات اور انتشار کا مجموعہ خیال کرتے ہیں، تو ممکن ہے وہ آپ کی ذات کو (مراد: امام خمینی) کے بارے میں یہ رائے قائم کریں، تضادات کی مرکزیت کے ساتھ بڑے دلچسپ ذوقِ سلیم کا ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ شخص جو تصوف اور ذِکرِ الٰہی جیسے نازک موضوعات (صوفیانہ راہِ طریقت اور تمام مادی خیالات سے نجات) کے ساتھ بیک وقت اِسلامی ریاست کا قیام اور ظلم و تشدد کے شکار عوام کو انصاف مہیا کرنے کے لیے اِسلامی قوانین کے نفاذ کا داعی ہو، دورِ حاضر میں آپ نے یہ کام کر دکھایا ہے۔"

سیاست میں دلچسپی:

شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور اُس کے مطابق معاشرہ کے قیام کے لیے ضروری ذرائع

Marfat.com

اختیار کرنا ہوں گے۔ مذہبی حلقے، جن کو بعدازاں امام خمینی نے سانپوں، فرقہ بندیوں، باہمی جوڑ توڑ اور خرابیوں کے ''گڑھ'' قرار دیا، یہ ایسے حلقے ہیں، جن میں کردار کشی، مالی انعامات اور اخلاقی کمزوریاں شامل ہیں۔ اساتذہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طلباء ایسے افراد ہیں، جو بعدازاں آیت اللہ بھی ہو سکتے ہیں یا تباہی کا باعث۔ ۲۷ سال کی عمر میں آپ ایک بطور مذہبی عالم ایک موثر شخصیت ملکی سیاست میں داخل ہوئے، جبکہ آپ کے حلقہ میں ایک خاصی تعداد آپ کے شاگردوں کی تھی۔ اولاً آپ نے بحث و تمحیص سے احتراز کیا۔ آپ نے ایک فیصلہ کن رویہ اختیار کیا۔ اولاً آپ دوسروں کی رائے پیش کرتے اور بعدازاں اُس کے خلاف اپنے دلائل دینے کی بجائے اپنا فیصلہ دیتے۔ مزید برآں جہاں آپ نے اپنی زندگی تصوف کے لیے وقف کر رکھی تھی' وہاں جو کچھ ''قم'' اور ملک کی سیاست میں حالات جا رہے تھے، اُن سے بھی اپنے آپ کو لاتعلق نہیں رکھا تھا۔ صدی کے تیسرے عشرے میں آپ نے محسوس کیا کہ عوام کی خودغرضی، بے حسی، بزدلی اور سستی کی وجہ سے ایران انتہائی زوال کا شکار ہے، اور ایسے میں وہ ایک فردِ واحد کی بادشاہت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، خمینی نے ''قم'' کے فیضیہ سکول میں لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سکول شہر کے بازار میں حضرت فاطمہؓ کے مزار کے قریب تھا، اور قرب و جوار اور دُور و نزدیک ہر ہفتہ جمعرات اور جمعہ کے روز ہزاروں زائرین زیارت کے لیے مزار شریف آتے تھے۔ حتیٰ کہ تہران سے بھی آتے تھے، آپ کی اِن تقاریر میں عوام کے لیے ایک کشش تھی۔ لیکن جلد ہی حکومت نے اِن تقاریر کو اپنے لیے خطرہ سمجھنا شروع کیا اور کوشش کی کہ آپ یہ سلسلہ بند کر دیں۔ حتیٰ کہ مذہبی سکولوں میں بھی۔ جس پر آپ نے حکومتی حلقوں کو جواب دیا: ''میرا یہ فرض ہے کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں۔ تاہم اگر پولیس نے یہ سلسلہ بزور بند کرنے کی کوشش کی تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔'' اِس کے بعد اگرچہ پولیس نے بزور تو اِن تقاریر سے نہیں روکا، لیکن اپنا دباؤ بڑھا دیا، جس کی وجہ سے آپ ''قم'' کا فیضیہ سکول چھوڑ کر الحاج مُلّا صادق مدرسہ دینیات جو فیضیہ سکول سے کافی دُور تھا۔ وہاں جانے پر مجبور ہو گئے۔ اِس کے بعد جب اتحادیوں نے ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ کو حکومت سے ہٹا کر ایران پر قبضہ کر لیا اور مذہبی سکولوں کے لیے آزادی دے دی، تو امام خمینی فیضیہ سکول لوٹ آئے اور اپنے

Marfat.com

لیکچروں کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا اور دیگر مُلاّؤں کے خلاف جو اپنی تقاریر میں عوام کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتے اور جنت کی خوشخبریاں سناتے، آپ نے ''خیر وشر''، ''دین سے واقفیت''، ''خود اعتمادی'' اور مسلمانوں کے زوال کی وجوہات سے اپنی تقاریر میں عوام کو متعارف کرانے کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو اُن کے حریف علماء نے آپ کے فلسفہ تصوف کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اِس کے جواب میں آپ نے تصوف کی تبلیغ کا سلسلہ بند نہیں کیا لیکن حریف علماء کا منہ بند کرنے کے لیے آپ نے نفاذِ شریعت کا مطالبہ شروع کر دیا اور تصوف کی باتیں نجی مجلسوں تک محدود کر دیں۔ کافی عرصہ بعد آپ نے اِن حریف علماء کے بارے میں کہا:

''اِن لوگوں نے میرے بیٹے کو ''حرامی'' تک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ کہ میں فلسفہ اور تصوف کی تعلیم دیتا ہوں۔''

اِن علماء کے بارے میں ہاشمی رفسنجانی جو آپ کے شاگرد تھے اور ایران کے صدر منتخب ہوئے، کا کہنا ہے، ''آیت اللہ بروجردی سمیت دیگر کئی کٹر قسم کے علما کی مخالفت سے آپ مجبور ہو گئے، کہ اپنے گھر میں گوشہ نشیں ہو کر اپنے معتقدین کو فلسفہ اور تصوف کی تعلیم دیں۔ چنانچہ آپ کی یہ تعلیم کا سلسلہ کوئی تین سال اپنے گھر پر ہی جاری رہا۔ جن میں آپ کے یہ تین شاگرد آیت اللہ مرتضیٰ مطہری، آیت اللہ حسین علی منتظری اور آیت اللہ جوادی عمولی بالخصوص معروف ہیں۔''

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جب رضا شاہ کا ستارہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، آپ نے خاموشی سے ملکی سیاست اور مذہبی امور میں حصہ لینا شروع کیا، کیونکہ رضا شاہ نے اِس سے قبل مذہبی طبقہ کو اِس قابل نہ چھوڑا تھا، کہ وہ سرگرمی سے سیاست میں حصہ لے سکیں۔ لہٰذا اُس نے اِس میں عافیت سمجھی کہ یہ میدان کسی اور کے لیے کھلا چھوڑ دے۔ یہ ایسا سخت وقت تھا کہ بقول امام خمینی کے ایک دوست آیت اللہ صدوقی اگر ''قُم'' میں جو مذہبی طبقہ کا مرکز تھا، علاّمہ حائری جیسا مقبول رہنما بادشاہ کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکالتا، تو وہ ''قُم'' تباہ کر کے رکھ دیتا۔ ایسے میں امام خمینی نے شیعی عقیدہ ''تقیہ'' کا سہارا لیا، کہ ''جب تم اِسلام دُشمن طاقتوں کا بزور دفاع نہ کر سکو، تو خاموشی اختیار کرو، تا آنکہ مقابلہ کی طاقت پیدا کر لو''۔ چنانچہ جب رضا شاہ

Marfat.com

بڑے طمطراق سے ایران پر حکمران تھا، اور ایرانی علماء میں اُس نے اپنی ماڈرن ازم کے خلاف کسی کو زبان کھولنے کے لائق نہ چھوڑا تھا، تو اُنہوں نے ''تقیہ'' کی راہ اپنائی تھی۔ جس میں خمینی اِس طبقہ کے ساتھ تھے۔ آپ کے ایک شاگرد کا کہنا ہے، کہ شاہ کے ایک مخالف آیت اللہ بافقی کو ایک عرصہ بعد ''قُم'' بدری کے بعد دوبارہ ''قُم'' لوٹنے کی اجازت دی گئی اور امام خمینی اُن سے ملنے گئے، تو آیت اللہ بافقی بڑے حیران ہوئے اور کہا ''تم یہاں کیسے؟ یہاں تو بادشاہ نے سڑک بنانے کے لیے مسجد ڈھا دینے اور تمہیں خصی Castigate کرنے کا حکم جاری کیا ہے'' اِس پر امام خمینی نے جواب دیا، ''میں نے تقیہ'' کیا ہے۔ کیونکہ یہ میرا اور میرے بزرگوں کا مسلک ہے۔ ''التقیہ دینی ودین آبائی''

اِس کے بعد جب رضا شاہ کا ستارہ تاریکی میں ڈوبا، تو آپ نے کھل کر ''تقیہ'' کا جوا گردن سے پھینک مارا۔ جس کے مطابق آپ کا ایک تحریری بیان ۱۹۴۴ء میں نزدیک کی ایک مسجد میں ریکارڈ کیا گیا۔ اِس بیان کے صفحہ اوّل کی قرآنِ کریم کی اِس آیت کا ترجمہ ہے۔

''کہو! میں تمہیں اِس ایک بات پر تنبیہ کرتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کی خاطر اکیلے یا اکٹھے اُٹھ کھڑے ہو۔''

اِس کے بعد آپ نے قوم کو اِن الفاظ میں مخاطب کیا اور زور دے کر کہا:

''یہ ہماری خودغرضیوں کا نتیجہ ہے، کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تابعداری میں نہیں اُٹھ کھڑے ہوتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بُرے دن اور اغیار کی غلامی ہے، یہ خودغرضیوں کا نتیجہ ہے جو اِسلام کے زوال کا باعث ہے۔''

لیکن محسوس کیا، کہ قوم بدستور اِس سے کوئی سبق لینے کو تیار نہیں۔ تو اُنہوں نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''تم سے بہائی مذہب کے لوگ اچھے ہیں، جنہوں نے گمراہ ہوتے ہوئے اپنے مذہب کے لیے جانیں قربان کر دیں۔''

اِس کے تھوڑے عرصہ بعد آپ نے ۱۹۴۲ء میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خلاف

Marfat.com

اپنی پہلی سیاسی کتاب ''کشف الاسرار'' کے نام سے شائع کی۔ یہ کتاب جس میں نام لیے بغیر بادشاہ اور اُس کے گرد علما کا طبقہ اُس کا نشانہ تھے، اِن الفاظ میں مخاطب کیا:

''ایک ان پڑھ سپاہی جو حکومت کے تخت پر بیٹھا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اگر اُس نے بندوق کے زور سے اِن مخالف مُلاّؤں کو خاموش نہ کیا، تو وہ اُس سے باز نہ آئیں گے جو وہ ملک اور مذہب کے لیے کر رہا ہے۔''

یہ کتاب جیسا کہ کہا گیا ہے، اُس کے مخاطب نام لیے بغیر بادشاہ اور خوشامدی مُلاّ تھے۔ خوشامدی مُلاّ بوکھلا اُٹھے اور ''ہمایوں'' میگزین کے ایڈیٹر حاکم زادہ نے آپ کے خلاف ایک پمفلٹ ''اسرار ہزار سالہ'' شائع کیا۔ جس کے بارے میں امام خمینی نے بعد ازاں کہا کہ ''اُن کے پڑھنے کے بعد اُس شخص سے اتنی شدید نفرت پیدا ہوئی کہ اِس امر کے باوجود کہ وہ بے شمار دیگر مسائل سے دوچار تھے، اُنہوں نے ۴۸ دن درس و تدریس کا سلسلہ بند کر کے اِس منحوس شخص کے الزامات کے جواب دینے میں صرف کیے۔ اور اپنے جواب میں حاکم زادہ اور اُس جیسے اشخاص کا ذکر کرتے ہوئے اِس امر پر زور دیا کہ جب دُنیا جنگ کی آگ میں جل رہی ہے اور قومیں اپنے مسائل حل کرنے میں مصروف ہیں، ہمارے ہاں ایسے ''جاہلِ مطلق'' افراد ہیں وہ اِس کوشش میں ہیں کہ ملک میں انتشار اور شر پھیلائیں، بجائے اِس کے کہ اپنے اُن بھائیوں کی مدد کریں، جن کو جنگ کی آگ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہے۔ اِن لوگوں نے علماء کے خلاف نفرت پھیلانے کے مذموم جُرم کا اِرتکاب کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا، کہ وہ اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں۔ کہ وہ عوام کو اِس حقیقت سے باخبر کریں، کہ ایران میں بدعنوانیاں اور بددیانتی کہاں کہاں ہیں۔

ایک اصلاحی رُجحان جو کہ عوام میں مقبولیت حاصل کرتا جا رہا تھا اور امام خمینی نے جس سے خاص طور پر فائدہ اُٹھایا، کہ بعض شیعی اور صوفیا کی رسومات جو خرابی کا باعث ہیں، اُن کا نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظریہ جس کی پیشتر ازیں کسراوی اور دیگر مُلاّ کرتے تھے، سعودی عرب کے وہابیوں (امام عبدالوہاب کے پیروکاروں) سے مختلف نہیں تھا، چنانچہ خمینی نے اپنے مخالفین کو سعودی عرب کے اُونٹ چرانے والے لوگ اور وحشی قرار دیا۔

Marfat.com

انہوں نے اپنے پمفلٹ ''کشف الاسرار'' کی تحریر میں سنجیدگی سے کام لیا۔ جس میں سلسلہ بہ سلسلہ توحیدِ خداوندی، امامت، مذہبی لیڈرشپ، حکومت، قانون اور احادیث کے موضوعات ہیں۔ جہاں اُنہوں نے فلسفہ، دلیل اور نظریات کے موضوع لیے ہیں، وہاں اپنے مخالفین کو چیلنج کیا ہے۔ جس میں موضوع کا پس منظر اور اپنا نکتہ نظر بیان کیا ہے۔ ایک اور طریقہ جو آپ نے اپنایا۔ اُس میں حبّ الوطنی کے ساتھ دینی جذبہ اُبھارا۔ اپنے دور کے عام مُلّاؤں کے خلاف آپ نے ''خرد'' بمعنی ''دلیل'' کی اصطلاح کا بہت استعمال کیا اور اپنے حریفِ حاکم زادہ کے بارے میں کہا ''یہ نامعقول شخص اپنی جگہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اِن علماء نے ''دلیل'' کو کچل ڈالا ہے اور اُن کے دلوں میں اِس کا کوئی احترام نہیں، اور اِس بارے میں انہوں نے دشنام طرازی تک سے احتراز نہیں کیا اور علماء کے خلاف جوابی جملوں میں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے اور مخالفین کو احمق، دھوکہ باز، جاہل اور منافق تک قرار دیا اور اُن کے خلاف اِس حد تک جارحانہ انداز اختیار کیا کہ ''جو علماء اپنے آپ کو دین کا محافظ قرار دیتے ہیں اُنہیں چاہیے، اپنے آہنی مُکّہ سے اِن جاہلوں کے دانت توڑ دیں اور اُن کے سر پوری جرأت سے کچل ڈالیں۔''

''کشف الاسرار'' میں وہ ایک جگہ اِسلامی ریاست کے دستور کے بارے میں رقم طراز ہیں اور علماء کو مشورہ دیتے ہیں:

> ''وہی حکومت اپنی حکمرانی کا جواز رکھتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی حکمرانی پر ایمان رکھتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کا مطلب اُس کی شریعت کا نفاذ ہے۔ چنانچہ ایسے تمام قوانین جو خلافِ شریعت ہیں، اُنہیں ختم کر دیا جائے اور جیسے حالات تبدیل ہوتے جا رہے ہیں، ضروری ہے، نفاذِ شریعت لازمی ہے۔''
>
> اِسلام میں طرزِ حکومت کوئی ایسا متنازعہ امر نہیں ہے۔ اگر حکومت کو بادشاہت میں تبدیل کرنا ہے۔ تو اُسے مجتہد منتخب کریں۔ پھر یہ بادشاہ منصف مزاج ہو، اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرنے والا ہو۔ ظلم وزیادتی ختم کرنے والا ہو، عوام کے جان ومال اور عزت کی حفاظت کرنے والا ہو۔

Marfat.com

اِسلامی حکومت سے یہ بھی توقع ہوتی ہے کہ وہ دینی قوانین وضوابط کی پابندی کرے اور ایسی تمام مطبوعات کی اشاعت پر پابندی لگائے جو دین و مذہب کے خلاف ہوں اور جو عناصر ایسی مطبوعات اور بیہودہ لٹریچر شائع کریں، اُنہیں سرعام تختہ دار پر چڑھایا جائے۔ ایسے شرپسند لوگ جو اِس کے ساتھ بدعنوان بھی ہیں، وہ ''مفسد فی الارض'' ہیں، چنانچہ اُن کو ایسے ختم کیا جائے، جو دوسروں کے لیے عبرت ہوں اور دوسروں کو دین سے گمراہ نہ کرسکیں۔

امام خمینی کی زندگی میں مختلف راہیں ہیں۔ ایک وقت آپ بدعنوان اہلکاروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وہ ''مفسد فی الارض'' ہیں، چنانچہ اُن کو ایسے ختم کیا جائے، جو دوسروں کے لیے عبرت ہوں اور دوسروں کو دین سے گمراہ نہ کرسکیں۔''

اور ایک وقت آپ بڑے کٹر مدرّس، بڑے پارلیمنٹرین ہیں، جبکہ دوسرے وقت آپ شیخ فضل اللہ نوری نظر آتے ہیں، جو آئین کے سخت مخالف اور محافظ شریعت ہیں۔ پھر جناب خمینی ایک موقعہ پر اِسی شیخ کے اتنے مخالف ہیں، کہ اُس کو گردن زدنی کی سزا دینے کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کہ برطانیہ عراق میں مداخلت کرے اور اِن تینوں کو اِسلام کے مصائب قرار دیتے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کے لیے آپ محاذ آرائی ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک موقعہ پر آپ آیت اللہ نائینی (۱۸۶۰۔۱۹۳۶) کے بڑے مدّاح نظر آتے ہیں، جنہوں نے عراق میں برطانیہ کا مقابلہ کیا، پھر دوسرے موقعہ پر خمینی اُن کی شخصیت پر معترض نظر آتے ہیں، جب وہ اِسلام میں جمہوریت کی وکالت کرتے ہیں اور ایک کتاب ''شیعی نظریہ سیاست'' کے مصنف ہیں، جو ایرانی شیعی علماء کے خلاف ہے۔

صدی کے چوتھے عشرے میں آپ اپنی ذات پر مسلط گوشہ نشینی سے باہر آتے ہیں، یہ کہتے ہوئے اِسلام میں سیاست ایسی ہی ضروری ہے، جیسے فلسفہ، تصوف اور قانون سازی۔ اِس سلسلے میں آپ نے وقت کے دو ایرانی بڑے بلند پایہ سیاستدانوں آیت اللہ کاشانی اور آیت اللہ

Marfat.com

بروجردی کے ساتھ شانہ ملایا۔ بالخصوص آیت اللہ بروجردی جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے ''مرجع تقلید'' شمار ہوتے تھے۔

خمینی نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف، وحدتِ اُمتِ مسلمہ، سیاسی سرگرمیوں اور عوامی مقبولیت جیسے اہم موضوعات کے بارے میں کاشانی کے ہم خیال تھے۔ لیکن کاشانی لچکدار سیاست کے ساتھ نرم مزاج تھے، جبکہ خمینی سخت مزاج اور بے لچک سیاست کے حامل۔ جہاں کاشانی نے بطور ایک اُستاد مذہبی مدارس سے اپنے تعلقات ختم کر دیئے، وہاں خمینی نے علماء کی متحدہ لیڈر شپ پر زور دیا۔ یوں تو کاشانی کو خمینی کی طرح متوسط درجے کے علماء میں مقبولیت حاصل تھی، لیکن ''قم'' اور نجف میں جس حلقہ علماء کو فضیلت حاصل تھی، اُن میں کاشانی کا مقام سطحی تھا۔ بروجردی کے مقابلہ میں خمینی کی کاشانی کی مدح سرائی دوسرے نمبر پر تھی۔ جبکہ آیت اللہ خمینی آیت اللہ بروجردی کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے، کہ وہ علماء کے انتشار اور اُن کے اندر بزدلی ختم کر سکتے ہیں۔ چونکہ خمینی خود ''قم'' میں مقیم رہے، چنانچہ آپ نے ایک مضبوط شخص کے طور پر علما کو متحد کرنے اور اُن کو تحفظ دینے کا قدم اُٹھایا اور آیت اللہ بروجردی کی حمایت کا اعلان کیا، جو عوام میں بڑے نیک اور پارسا عالمِ دین کے علاوہ شیعہ سنی کے درمیان بہتر تعلقات کے حامل اور ایک اچھے منتظم تھے۔ جس وجہ سے وہ بین الاقوامی سطح کے لیڈر تھے۔ تاہم آپ چونکہ ملکی سیاست میں سرگرم حصہ نہیں لے رہے تھے، جس وجہ سے ملک کئی مسائل کا شکار تھا۔ ایسے وقت میں جب ملک میں ڈاکٹر مصدق وزیراعظم تھے اور علماء، اُن کے مسلم اتحادی اور دیگر قوم پرست علماء کی حمایت کے حامل تھے، آیت اللہ کاشانی نے آیت اللہ بروجردی کے مشورہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایرانی پارلیمنٹ ''مجلس'' کے سپیکر کا عہدہ قبول کر لیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایران میں کسی دوسرے سیاستدان کے مقابلہ میں ڈاکٹر مصدق کی پوزیشن بڑی مضبوط تھی، اور وہ سیاسی جماعت نیشنل فرنٹ کے لیڈر تھے، لیکن آپ کی وزارتِ عظمیٰ دیگر قوم پرست اراکینِ مجلس کے اتحاد کی ایک کمزور حکومت تھی، جس کا اُنہوں نے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اِس بارے میں امام خمینی کی رائے تھی کہ ''مصدق ایک نیک نیت اور

Marfat.com

ایران کی خدمت میں مخلص تھا، لیکن اُس سے بڑی غلطی یہ ہوئی، کہ جب اُسکی پوزیشن مضبوط تھی اور شاہ کمزور، اُس نے شاہ کو اقتدار سے علیحدہ نہیں کیا۔" جبکہ بروجردی بھی مصدق کے حامی نہیں تھے۔

۱۹۵۳ء میں "تودہ" پارٹی کے لیڈر اور سیکولر ذہن کے مالک بورقاعی نے وی آنا (آسٹریا) کی امن کانفرنس میں نہ صرف بروجردی کے خلاف گستاخانہ الفاظ استعمال کیے، بلکہ نعوذ باللہ اسلام اور قرآنِ کریم کے خلاف بھی۔ جس پر بروجردی سے ہفت روزہ میگزین "ترقی" کا نمائندہ انٹرویو کرنے کے لیے گیا۔ انہوں نے اُسے اشارہ کیا، کہ "خمینی میرے نمائندہ ہیں"۔ جناب خمینی نے اِس پر جناب بروجردی کے حوالہ سے کہا کہ "بورقاعی قُم سے نکل جائیں اور الیکشن میں حصہ نہ لیں، جبکہ رپورٹر کو اپنا فوٹو دینے سے انکار کر دیا۔"

اِس عرصہ میں ایک مؤرخ نے جناب خمینی کے بارے میں لکھا:

"آپ قُم کے ایک بڑے استاد اور اِس شہر کے مذہبی اداروں کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ آپ ایک فاضل پروفیسر ہونے کے ساتھ ایسے قانونی مشیر ہیں۔ جن سے علم کی روشنی ملتی ہے۔"

اُس نے آپ کے بارے میں مزید لکھا کہ:

"آپ قُم، تہران اور ایران کے دیگر شہروں سے طلبا اور عوام کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ جہاں سے سینکڑوں لوگ کی تعداد میں آپ کے لیکچر اور دینی افکار سننے آتے ہیں۔ جبکہ اُن کے یہ لیکچر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہوتے ہیں اور اُن کے بارے یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے، کہ اُن کا مستقبل شاندار رہے، اور ایران کو ان سے بڑی اُمیدیں ہیں۔"

صدی کے پانچویں عشرے کے آخر میں بحیثیت ایک عالمِ دین آپ کی شہرت عروج پر پہنچ گئی تھی، اور کئی سال مذہب واخلاق، تصوف اور فلسفہ کی تعلیم دینے کے نتیجہ میں آپ کے دوصد سے زائد شاگرد ایران کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر شیعیت کی بحیثیت مذہبی ریاست تبلیغ کر کے عوام کو متاثر کر چکے تھے، اور اِسی طرح پھیل کر مختلف مقامات میں کسی نے آیت اللہ کا مقام حاصل کر

Marfat.com

لیا تھا، کوئی بڑا مبلغ بن گیا تھا، کوئی مذہبی عالم اور کوئی شہر کا امامِ صلوٰۃ۔

اپنی سیاسی شخصیت منوانے سے قبل آپ نے اولاً اپنا مذہبی مقام منوایا۔ تاکہ اپنا مذہبی مقام منوانے کے بعد عوام میں بحیثیت ایک سیاسی لیڈر اپنی طاقت کا سکہ منوایا جائے۔ کاشانی اور بروجردی کو اپنا محسن شمار کرتے ہوئے وہ یہ محسوس کرتے تھے گویا کہ آپ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہیں۔ جبکہ کاشانی ایک سیاسی لیڈر تھے اور بروجردی ایک مذہبی لیڈر۔ لیکن اِس کے باوجود وہ خمینی کے لیے کوئی آئیڈیل نہ تھے۔ جبکہ خود اِن دونوں کی رائے میں خمینی ایران کے مستقبل میں ایک بڑے مذہبی لیڈر تھے۔ جناب خمینی کی سیاسی حس نے اُن کو یہ سبق دیا، کہ وہ جن خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، دوسرے بھی اُنہیں اپنائیں۔ انہوں نے عوام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ''قُم'' کو آیت اللہ بروجردی کی سرپرستی میں دے دیں۔

دراصل اپنے بارے میں وہ یہ سمجھتے تھے، کہ بہ تقاضائے عمر بروجردی کے مقابلہ میں وہ اتنی زیادہ عمر کے نہیں، کہ وہ ایک بڑے لیڈر بن سکیں۔ جبکہ اُن کے علاوہ بھی دیگر کئی آیت اللہ بزرگ عمر کے زندہ ہیں۔ حتیٰ کہ حائری اور نا عینی جیسے آیت اللہ اشخاص جو علم و فضل کی بڑی منازل طے کر چکے تھے، لیکن اِن میں سے کوئی لیڈر شپ کی اپنے سے بزرگ تر سیاستدانوں کی منزل حاصل نہ کر سکا۔ کہ وہ ''مرجعِ تقلید'' کی حیثیت اختیار کر سکے۔ مزید برآں وہ دوسرا کاشانی بھی نہ بننا چاہتے تھے، جن کے بارے میں ''قُم'' کے لوگوں نے غلط رائے قائم کی، کہ مہدی بازرگان، آیت اللہ ابوالفضل، آیت اللہ زنجانی اور طالقانی جیسے بزرگ علما اور سیاستدانوں نے آیت اللہ کاشانی کو ڈاکٹر مصدق کے زوال کا باعث قرار دیا تھا۔ کاشانی اور سیاسی پارٹی ''فدایانِ اسلام'' کا یہ حشر دیکھ کر کہ اِن کو مذہبی حلقوں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے، جو بالآخر تنہا ہو کر میدانِ سیاست میں ناکارہ ہو گئے، جبکہ خمینی کی کاشانی کی ناکامی کے بارے میں یہ رائے تھی کہ وہ سیاست کو اِسلامی بنانے کی بجائے اِسلام کو سیاسی بنانے پر عمل پیرا تھے۔

کاشانی ڈاکٹر مصدق کی جمہوری وزارتِ عظمیٰ کے ختم کرنے میں رضا شاہ، شاہِ ایران کی حکومت کو دوبارہ استحکام بخشنے کا باعث تھے، لیکن شاہ نے ڈاکٹر مصدق کی حکومت کو برطرف

Marfat.com

کر کے اپنی پوزیشن مضبوط کرلی اور بروجردی کے ساتھ تعلق قائم کیا۔ لیکن اُن کو مذہبی احترام کا مقام دینے کی بجائے کہ اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کرے۔ محض مزار شریف (غالباً مزار حضرت معصومہ) پر رسمی ملاقات کا اہتمام کیا۔ جبکہ خود آیت اللہ بروجردی سخت بیمار، چلنے پھرنے سے معذور اور بستر پر تھے۔ چنانچہ اولاً آپ کو ایک کرسی پر بٹھا کر گھوڑا بگھی لایا گیا اور اس بگھی سے آپ مزار شریف آئے۔ جہاں آپ ایک گھنٹہ بادشاہ کی آمد کے منتظر رہے۔ جب بادشاہ سلامت تشریف لے آئے، تو دو شاہی محافظوں کی مدد سے آپکو ایک آیت اللہ کا احترام دینے کی بجائے بادشاہ کے حضور کھڑا کر کے آپکو ملاقات کا موقعہ بخشا۔ جبکہ بادشاہ نے بوجہ شاہی غرور و تکبر آپ سے ہاتھ ملانا بھی گوارا نہ کیا، اور اتنا پوچھنے پر اکتفا کیا "حالِ آقا چیست" ("آپ کا کیا حال ہے؟") اور مزید کوئی گفتگو کیے بغیر مزار کو سلام کر کے رُخصت ہو گیا، کہ اب آیت اللہ ایک بھولی بسری داستان ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ خمینی اور دیگر علماء کو بادشاہ کا آیت اللہ بروجردی کی شخصیت کے ساتھ یہ ذلت آمیز رویہ سخت ناگوار گزرا اور مزید برآں یہ محسوس کیا کہ بادشاہ اب خوشامدیوں کے حلقہ میں گھر گیا ہے۔

آیت اللہ بروجردی مارچ ۱۹۶۱ء میں انتقال کر گئے اور مسئلہ پیدا ہوا کہ کون ان کا جانشین ہوگا، جبکہ شاہ کی بھی یہ ضرورت تھی کہ اُن کی جگہ کوئی شاہ پرست آیت اللہ ہو۔ چنانچہ آپ کی وفات کے سات روز بعد شاہ پرست آیت اللہ بہ بہانی "قم" آئے، اور "قم" کے سب علماء کو یک جا کر کے دعوت دی، کہ "قم" کے تمام مذہبی مدارس ایک نظم کے تابع ہوں، مزید برآں آیت اللہ بروجردی کا جانشین کون ہو؟ اس اجلاس میں بہ بہانی کی دیگر علماء سے جو گفتگو ہوئی، اُس میں خمینی بالکل خاموش رہے۔ اولاً یہ کہ وہ بہت زیادہ خوشامدی شاہ پرست تھا، ثانیاً نواب صفوی کی سزائے موت میں اُس نے شاہ کا ساتھ دیا۔ مزید برآں اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ قُم، مشہد اور نجف میں آپ سے بزرگ تر علماء تھے۔ اس سے آپ یہ تأثر دینا چاہتے تھے، کہ آپ ایک اُستاذ ہیں اور اقتدار پرست نہیں۔ جبکہ آپ کے بعض طلباء نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ آگے آئیں، جب آپ نے اُن سے یہ کہہ کر معذرت کر لی، کہ ابھی اُن سے زیادہ بزرگ تر افراد ہیں، جن کے آگے اُن کی شخصیت فروتر ہے۔ جن کی مذہبی اداروں میں اُن سے زیادہ ضرورت ہے اور

Marfat.com

وہ اِس کے اہل بھی ہیں۔ آپ کے اِس اقدام اور اِس سوچ نے مذہبی حلقوں میں آپ کو زیادہ مقبول بنادیا۔ جو آپ سے پہلے سے واقف تھے۔ جبکہ قبل ازیں آپ کے اکثر طلباء حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ایران بھر میں فائز تھے۔ چنانچہ جب وقت آیا، کہ لوگ بادشاہت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں، ہر طرف سے اِسے حمایت حاصل ہو رہی تھی اور آپ کے طلباء کا اثر اتنا بڑھ چکا تھا، کہ وہ لوگ جو غیر جانبدار اور ہچکچاہٹ کا شکار تھے، وہ بھی ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے۔

بروجردی کی وفات کئی معنوں میں حکومت اور علماء کے درمیان غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھی۔ شاہ اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھا، کہ اُن کی وفات اُس کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اور اُس کے لیے یہ آسان ہوگا، کہ وہ اپنے عزائم کے مطابق سماجی تبدیلیاں نافذ کر سکے کہ اب اُس پر نہ اندرونی دباؤ ہے اور نہ بیرونی۔ البتہ جنہوں نے بادشاہ کی حمایت کی تھی۔ کئی موقعوں پر آپ نے اراضی کی اصلاحات کے علاوہ دیگر کئی اصلاحات کی مخالفت کی تھی۔

بروجردی کی وفات پر شاہ نے نجف کے آیت اللہ حکیم کو پیغام تعزیت اِرسال کیا۔ جو بالواسطہ ایران کے علما کے اندرونی معاملات میں مداخلت تھی۔ یہ سمجھ کر گویا کہ آیت اللہ حکیم بروجردی کے جانشین ہیں، جبکہ آیت اللہ حکیم ایرانی نہیں، بلکہ لبنان کے شیعہ عرب تھے، عراق اور خلیجی ریاستوں میں معروف تھے، اور ایران اور ایران کی سیاست میں غیر معروف۔ جبکہ ایران میں مرحوم کی جگہ لینے والے آیت اللہ عبدالہادی شیرازی، آیت اللہ خوئی اور آیت اللہ شہرودی کے علاوہ بھی دیگر چھ آیت اللہ اور تھے۔ مزید برآں مرحوم کی وفات کے بعد شاہ اپنی جگہ یہ بھی سمجھ بیٹھا، کہ جن منصوبوں میں ایرانی علماء سے مشوروں کی ضرورت ہے، اب اِس کی بھی ضرورت نہیں۔ جبکہ دوسری طرف خمینی سمیت دیگر علماء کو یہ موقعہ مل گیا، کہ اب کسی دینی معاملہ میں کاشانی اور بروجردی کے رخصت ہو جانے کے بعد خمینی کو اپنے منصوبوں کو آزادی سے آگے بڑھانے کا موقعہ مل گیا، جو وہ اُن کی زندگی میں نہیں کر سکتے تھے اور یہ دو مرحوم علماء اپنی زندگی میں سیاسی اور مذہبی طور پر ناکام رہے۔ مُلّاؤں کے خلاف سرکاری حلقوں نے ''اخوندِ سیاسی'' یا ''سیاسی مُلّا'' کا ایک داغ لگا ڈالا تھا، جسے خمینی نے اب نجی مجلسوں اور کھلے جلسوں میں مٹانے کی مہم شروع کر

Marfat.com

دی۔ جبکہ ایران کی سیاست میں اب خمینی تہران میں غیر معروف نہیں رہے تھے۔ چونکہ بروجردی جب حیات تھے اور اکثر وزرا اور وزرائے اعظم اُن سے ملنے آتے تھے، تو خمینی بروجردی کے ساتھ ہوتے تھے۔ جن میں سابق وزیر ڈاکٹر اقبال اور وزیر اعظم ڈاکٹر علی امینی قابلِ ذکر ہیں۔

۲ر جنوری ۱۹۶۲ء کے روز جو یوم پیدائش حضرت علی بھی تھا، وزیر اعظم علی امینی، قُم کے علماء خمینی، گول پیگانی، شریعت مداری اور مرعشی نسبتی سے ملاقات کیلئے قم آیا۔ جس سے اُس کا مقصد یہ تھا، کہ اِن علماء کی حمایت سے وہ اُن بعض اصلاحات کو نافذ کرے، جو بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہیں اور اپنی وزارت مستحکم کرے۔ کوئی سہ پہر کے وقت اُس نے علیحدگی میں خمینی سے ملاقات کی۔ رسمی خوش آمدید اور چائے بسکٹ کے ساتھ مذاکرات کی میز پر دونوں کی حکومت اور علماء کے کردار کے موضوع پر اور دیگر موضوعات پر دلچسپ گفتگو اور اخبارات میں جو بات چیت شائع ہوئی، کہ حکومت جو اصلاحات نافذ کرنا چاہتی ہے، اُنکے بارے میں خمینی یہ چاہتے ہیں کہ حکومت علماء کو مراعات دے، اِس طرح آیت اللہ بروجردی کی وفات کے دس ماہ بعد جنوری ۱۹۶۲ء میں حکومت اِس پوزیشن میں تھی، کہ اصلاحاتِ اراضی کے بارے میں جو اُسکے منصوبے ہیں، اُن کو آگے بڑھائے۔ اِن اصلاحات کے نفاذ پر قدامت پرست مُلّا اور بڑے زمینداروں نے ناراضی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن خمینی اور ملکی سیاست میں نووارد علماء نے اِن پر کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا، البتہ علی امینی نے خمینی سے علیحدگی میں ملاقات کے بارے میں یہ الفاظ کہے کہ ''طلاق کے مسئلہ پر خمینی اُنکی رائے سے ناخوش تھے، جبکہ میں نے اُن کو یقین دلایا، کہ اُن کی ناراضگی اِس مسئلہ پر دُور کر دی جائیگی اور میں نے اُنکو اپنے تعاون کا یقین دلایا'' لیکن بعدازاں شاہ نے علی امینی کو برطرف کر کے اُسکی جگہ ایک لینڈ لارڈ اسد اللہ عالم کو وزیر اعظم مقرر کیا، جو شاہ کا ذاتی دوست بھی تھا۔

کم و بیش ۲۰ سال تک شاہ اور علماء کے درمیان باہمی مخاصمت کا سلسلہ جاری رہا، جس کے نتیجے میں خمینی فائدہ میں رہے۔ یہ سلسلہ ۷ر اکتوبر ۱۹۶۲ء میں تہران کے اخبارات میں خواتین کو حقِ رائے دہی کے بل سے شروع ہوا۔ جس میں قرآنِ کریم کے قانونی تقاضوں کو ختم کرتے ہوئے اِس بل کو ''مقدس کتاب'' کا درجہ دیا گیا۔ اِس خبر نے ''قُم'' کو چونکا دیا۔ خمینی نے اپنے

Marfat.com

طور سے مسلم عوام کو اس ''خطرہ'' کی نشاندہی کی، جو حکومت کی طرف سے اسلام کو پیش آرہا تھا، اور اس خطرہ سے نبٹنے کے لیے اپنے حریف علماء سے کسی طرح کے تنازعہ سے قطع نظر سب کو اپنے مرحوم اُستاد حائری کی رہائش گاہ پر مل بیٹھنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اُس شام خمینی، شریعت مداری اور گول پیگانی مرحوم حائری کی رہائش گاہ پر یک جا ہوئے اور اِس غیر معمولی اجلاس میں تینوں علماء نے اصل موضوع، اُس کے نتائج اور اُن سے عہدہ برآ ہونے پر بات چیت کی، یہ وہ اجلاس تھا، جس کے نتیجہ میں خمینی کی لیڈر شپ کی غیر معمولی صلاحیتیں سامنے آئیں۔

اِس بل کے خلاف حکومت کے مشیر علماء اور مخالف علماء کے درمیان کوئی دو ماہ ٹیلیگراموں کا تبادلہ جاری رہا، جن میں مخالف علما کا دباؤ زیادہ تھا اور بالآخر حکومت کو اپنے غرور کا سر نیچا کرنا پڑا اور بل واپس لے لیا اور معاملہ نہ صرف یہ بل واپس لینے پر ختم ہو گیا بلکہ شاہ نے جو دیگر اہم اصلاحات نافذ کرنے کا ارادہ کیا تھا، عارضی طور پر اُن کو بھی دھچکا لگا اور ایک نئی مذہبی سیاسی لیڈر شپ اُبھری، اور حکومت نے شہری انتخابات کے لیے جو قوانین مرتب کیے تھے، اُن کے بارے میں بھی ایک اور پسپائی اختیار کرنا پڑی اور اِس سلسلے میں پہلوی بادشاہت کو جو بالادستی حاصل تھی، وہ بھی نیچے آگئی اور ایک حکومتی وفد خمینی سے ''قُم'' ملاقات کے لیے گیا۔ مذاکرات کا یہ سلسلہ ایک بہتر سسٹم کے معاہدہ پر ختم ہوا، جس میں حکومت کی طرف سے سسٹم میں جو بعض غیر اسلامی شقیں تھیں، وہ سسٹم سے خارج کی گئیں اور اُسکے بعد خمینی کی ہدایات نے عوام میں قدم جما لیے اور ''سوگوارانِ اتحادِ اسلامی'' کے نام سے ایک مخلوط رابطہ کا حلقہ قائم کیا۔ جسے شاہ نے ایک بڑے خطرے کے طور پر بھانپ کر اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا، کہ بطور شاہ وہ مختارِ مطلق ہے اور جنوری ۱۹۶۳ء میں یہ اعلان کیا، کہ اُسے یہ اختیار حاصل ہے کہ جس قسم کی وہ سماجی اصلاحات ضروری سمجھتا ہے وہ اُنہیں نافذ کرے گا۔ اپنے باپ کی مثال دیتے ہوئے کہ ملک کو جو سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل درپیش ہیں، وہ کسی دائیں بائیں بازو کے تعاون کے بغیر تنہا اُن کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اُس نے اپنا چھ نکاتی اصلاحی بل جس میں ''زرعی اصلاحات'' بل بھی شامل تھیں۔ اور خواتین کے حقوق اور انتخابی قوانین بھی شامل تھے۔ ایرانی عوام کی منظوری کے لیے

Marfat.com

ریفرینڈم کے لیے پیش کیے۔ ایرانی قوم اور علماء کے لیے چیلنج کے طور پر یہ بڑا جرأتمندانہ اقدام تھا۔ اُسے اِس امر کا یقین تھا، کہ وہ مذہبی حلقے جن کی قیادت خمینی کے ہاتھ میں ہے اور وہ سڑکوں پر باہر نکل کر بھی اُس کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ اتنے مضبوط نہیں جو اُس کی بادشاہت کے خاتمہ کے لیے خطرہ ہوں۔ لیکن حالات نے جو رُخ اختیار کیا، اُسے اِن کا اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ ۲۳ رجنوری ۱۹۶۳ء کے روز ''قُم'' کے عوام نے علماء کی قیادت میں زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا اور عوام اور پولیس کا ایک بغاوت کی شکل میں تصادم ہوا، جس کے نتیجہ میں خمینی کو گرفتار کر کے تہران منتقل کر دیا گیا۔ لیکن سوا سال کی گرفتاری کے بعد آپ کو ۷ر مارچ ۱۹۶۴ء کو ''قُم'' واپس کر دیا گیا۔ اب وہ عام آیت اللہ نہ تھے، بلکہ ایک مقبول عوام مذہبی سیاسی لیڈر تھے۔ آپ کو اپنی لیڈر شپ مستحکم کرنے کا ایک اور موقعہ ہاتھ آیا۔ جب ۱۹۶۴ء کے اواخر میں حکومت نے امریکی شہریوں کو ایران میں غیر معمولی مراعات سے نوازا۔ جس کے خلاف خمینی نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کے روز حکومت کے اِس اقدام کو ایران کی خود مختاری کے خلاف چیلنج قرار دیتے ہوئے کہا کہ اِس اقدام نے ایران کی خود مختاری کو کچل دیا ہے۔ جس پر آپ کو ایک بار پھر گرفتار کر کے تہران لایا گیا اور شاہ نے فیصلہ کیا، کہ اب اُنہیں کوئی اور موقعہ نہ دیا جائے، اور راستے سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ پہلے آپ کو تُرکیہ بدر کر دیا گیا اور اُس کے بعد عراق۔ یہ خیال کر کے کہ جہاں اب اُس کو اپنی اصلاحات نافذ کرنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی ہے، وہاں اب ملک میں اُن کے خلاف اب طاقتور عنصر بھی نہیں ہے۔

تاہم خمینی کا اثر اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ مزید برآں آپ نے زیرِ زمین سرگرمیاں بڑھا دیں۔ جس کا ایک بین الاقوامی امریکہ کی حامی تنظیم SAVAK نے نوٹس لیا اور نجف (عراق) میں آپ کے ایک بیان کے بارے میں رائے دی کہ آپ ایک خطرناک شخص ہیں، اور ایران میں آپ کے جو ذرائع آمدن ہیں، اُس میں SAVAK رکاوٹ ہے۔ ایران میں نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے رابطوں میں کافی کمی واقع ہوگئی تھی۔ لہٰذا اُن کے لیے ضروری ہو گیا کہ بیرونِ ملک اپنے رسوخ سے کام لیا جائے۔ کیونکہ نجف کے مُلّاؤں نے بھی آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ لہٰذا آپ نے ضرُوری خیال کیا، کہ بیرونِ ایران جو نوجوان نسل تعلیم پا رہی ہے اور جس نے مستقبل میں

Marfat.com

لیڈر بننا ہے، اُنکی رہنمائی کی جائے اور اپنا ہم نوا بنایا جائے۔ جن میں ابوالحسن بنی صدر، ابراھیم یزدی اور صادق قطب زادہ جیسے افراد تھے، جو ۱۹۷۹ء کے اِسلامی انقلاب کی اہم شخصیات تھیں۔

اِسی دوران آپ نے "تحریر الوسیلہ" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ جس میں آپ نے سماجی اور سیاسی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے "جہاد"، "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" وغیرہ کا جائزہ لیا، جن پر آپ کے ایران کے ہم عصر علما خالی ہیں۔ جبکہ اِس کتابچہ نے آپ کو ایک قانون ساز کی شہرت دی۔ اِس کتابچہ میں آپ نے ایک اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا ہے جو "کشف الاسرار" کا تتمہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں آپ نے یہ بھی مؤقف پیش کیا، کہ اِمام یا مسلم معاشرہ کا لیڈر معاشرہ کے مفاد میں اشیاء کی قیمتوں کا تعین یا تجارتی پابندیاں ضروری سمجھے، تو اُسے یہ اختیار حاصل ہے۔ اسکے علاوہ خارجہ پالیسی کو بھی موضوع بنایا ہے، کہ مسلم عوام پر اغیار مسلط نہ ہوں۔

نجف میں حالات اُن کیلئے سازگار نہ تھے کہ یہاں کے مُلاّؤں کا نہ صرف سلوک اچھا نہ تھا، بلکہ آپکی کوئی بات بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ اِس لحاظ سے آپ کو نجف میں پانچ سال کا عرصہ لگا، کہ یہاں کے علماء کو کوئی بچی بات سناسکیں، کہ اُن کا عمل صحیح نہیں ہے۔ لیکن اِس سے زیادہ کوئی مخاصمت مول نہیں لی۔ کیونکہ یہیں ایک آیت اللہ سید محسن حکیم ایسے علماء کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ ۱۹۷۰ء میں اُنکی صحت بگڑگئی۔ جبکہ عراقی حکومت خلاف پالیسیوں پر اُن پر عراقی حکومت کا دباؤ بھی بڑھ گیا۔ ایسے میں خمینی نے بھی عراقی مُلاّؤں کے خلاف چھیڑ خانی کی بجائے اِسلامی حکومت کا موضوع اپنایا اور ۲۱/جنوری ۱۹۷۰ء تا ۸/فروری ۱۹۷۰ء متعدد تقاریر کیں، جن میں ایک طرف عالمِ اسلام کی مایوسیت اور مسلمان حکمرانوں سے عہدہ برآ ہونے پر زور دیا، دوسری طرف اُمتِ مسلمہ پر قومِ یہود، عیسائیوں، امپیریلزم اور نوآبادیاتی طاقتوں کے ظلم وزیادتیوں کو مسلم عوام کے سامنے پیش کیا، اور علماء پر اعتراضات کرتے ہوئے زور دیا، کہ وہ فرقہ بندی، باہمی اختلافات، خواتین کے نازک معاملات اور بدنی صفائی جیسے فضول مسائل کو اپنی تقاریر کا موضوع نہ بنائیں اور نوجوان نسل جو آپکی تقاریر سننے آتی تھی، اُس پر زور دیا کہ اُس نے مستقبل میں کیا ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں اور اُس نے کیونکر اُن سے عہدہ برآ ہونا ہے اور اسلام اِسلامی قوانین اور نظام اُسے کیا ہدایات دیتا ہے۔

Marfat.com

''ایک اِسلامی ریاست کے قیام اور اُسکے بعد اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بارے میں طلباء کو اِس کا احساس دلانے کے ساتھ اُن کی حوصلہ افزائی کرتے، کہ وہ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں اور علماء پر بھی زور دیتے، کہ وہ اِسلامی ریاست کے قیام کی کوششوں کے ساتھ یہ بھی تیاری کریں، کہ ایسی ریاست کے قیام کے بعد بحیثیت ایک حکمران، اُن کی قانون سازی اور عدلیہ کا کیا کردار ہوگا۔ یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے ایک پروگرام مرتب کیا، جس کا آغاز آپ نے اپنے مذہبی مراکز سے کیا، اور ایک مذہبی ریاست کے جواز اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں آپ نے ایک رسالہ ''ولایت فقیہ'' شائع کیا، جس کے تراجم انگریزی میں ''مذہبی خلافت''، ''حکومتِ عدلیہ'' اور ''شرعی عدلیہ کی سربراہی'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

صدی کے نصف چھٹے عشرے تا نصف ساتواں عشرہ وقتاً فوقتاً مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود شاہ نے ایران کو ''مستحکم جزیرہ'' اور ''نمونۂ خوش حالی'' قرار دیتے ہوئے من پسند اصلاحات جاری کیں۔ اِس دوران کوئی ایک درجن کے قریب بیانات جاری کیئے، جن میں ایرانی عوام کو مخاطب کیا گیا تھا، لیکن زمین اُس کیلئے زرخیز نہ تھی۔ شاہ کی اِس ''مستحکم'' دیوار میں اُس وقت دراڑ پڑی۔ جب اُس نے اپنے وفادار وزیر اعظم امیر عباس ہویدا کو ۱۹۷۷ء میں وزارتِ عظمیٰ سے علیحدہ کیا، جس نے شاہ کی حکومت کو استحکام بخشا تھا اور وہ قدرے نرم خو تھا اور اُس کی جگہ جمشید آموزگار کو وزیر اعظم مقرر کیا جو اُسکے نزدیک زیادہ فیصلہ کُن شخصیت تھی۔ اُس وقت تک کسی کے علم میں نہ تھا، کہ شاہ ''کینسر'' کا بھی مریض ہے اور ایک ماہ قبل زیرِ علاج رہ چکا ہے۔ پھر اکتوبر میں خمینی کے بڑے بیٹے مصطفیٰ کی موت کسی بھی بیماری کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ایسے پُراسرار طور پر ہوئی، جس نے تمام علماء کو اِس صدمہ نے ہلا کر رکھ دیا اور اِس واقعہ نے خمینی کی ذات کو شہرت اور ہمدردی کا مرکز بنا دیا اور عوام کی اکثریت جوق در جوق آپکے دوسرے بیٹے مرتضیٰ پسندیدہ کی رہائش گاہ پر تعزیت کیلئے آنے لگی۔ جبکہ دُور و نزدیک سے تعزیت اور ہمدردی کے خطوط اور ٹیلیگراموں کی خمینی کے نام اتنی بھرمار ہوئی۔ جو اندازوں سے باہر ہے، خمینی نے جہاں اپنے طور اسے ''قدرتی'' واقعہ قرار دیتے ہوئے تعزیت اور ہمدردی کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا، وہاں موقعہ سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی کوتاہی نہ برتی۔

Marfat.com

ابھی عوام کے دِلوں میں خمینی کے لیے ہمدردی کے زخم تازہ تھے، کہ ۶ رجنوری ۱۹۷۸ء کی سرکاری اخبار ''اطلاعات'' کی اشاعت میں خمینی کے خلاف ایک توہین آمیز مضمون شائع ہوا، جس نے عوام کو مشتعل کر دیا، اور عوام اتنی بڑی تعداد میں ''قُم'' میں حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے، کہ شاہ کی حکومت نے اُن پر گولیاں چلانے کا حکم دے دیا، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اُس کی حکومت کے خلاف بغاوت ہے، جسے سختی سے کچلنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ اندازہ نہ لگایا کہ عوامی اشتعال کے سامنے حکومت کتنی کمزور ہے، اِس حکم پر تعمیل کے نتیجہ میں فوج نے چھ افراد کو جاں بحق کر دیا۔ جس کے بعد یومِ محرم کے بعد شیعی یوم ''چہلم کے روز ''قُم''، ''تبریز'' اور دیگر کئی شہروں میں شاہ کے خلاف بغاوت جنگل کی آگ کی طرح بھڑک اُٹھی اور شاہ بُری طرح اپنے خلاف تمام ملک کی دشنام طرازی اور جلسوں جلوسوں کا نشانہ بن گیا۔ اب خمینی کے لیے بھی یہ سنہری موقعہ تھا، کہ جس اسلامی ریاست کے قیام کا وہ عرصہ سے عوام کو سبق دے رہے تھے، کہ اب وہ عملاً اُسے قائم کریں اور شاہ جیسے اسلام سے دُور مغرب زدہ حکمران کو راستے سے ہٹائیں، چنانچہ ایران سے باہر ہوتے ہوئے آپ نے فرانس کے مشہور اخبار ''لی مونڈے'' "Le Monde" کو ایک حیران کن انٹرویو دیا ''پہلوی خاندان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جانا انتہائی ضروری ہے، جس کے بعد اِسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئے گا۔'' اب اُنہوں نے بھانپ لیا تھا، کہ اب اُن کی لیڈرشپ اگرچہ مسلمہ حیثیت حاصل کر چکی ہے، لیکن اپنی شخصیت کو دُور رکھتے ہوئے فوج کو دعوت دی کہ وہ عوام کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے شاہ کو اقتدار سے ہٹا دے۔ اب وہ پیرس میں تھے وہاں اُنہوں نے ایک تقریر میں کہا، کہ اِسلام ایک ''ترقی پرست'' دین ہے، جس میں ایک خاتون بھی حکمران بن سکتی ہے اور اُس وقت تک حکمران رہ سکتی ہے، جب تک مکمل طور پر اسلامی قوانین اور اِسلامی حکومت کے نفاذ کے لیے تیاریاں مکمل نہ کر لی جائیں۔

اِس دوران آپ نے ''شورائیتِ تصوف'' کی سربراہی کی بات تو ایک طرف رہی، بلکہ ''شورائیتِ قانون'' کی سربراہی کی بھی بات نہ کی اور صرف علماء کی سربراہی کے کردار پر زور دیا۔ اب اُن کے سامنے صرف دو مقاصد کا حصول تھا۔ ''شاہ کا اقتدار سے رخصتی کے ساتھ ایران چھوڑ

Marfat.com

جانا اور خود اُن کی وطن ایران واپسی''۔ پہلے مقصد کا حصول یومِ عاشورہ ۹ رمحرم اور ۱۰ رمحرم مطابق ۱۰ ر۱۱ دسمبر ۱۹۷۷ء ہوا، جن دو دنوں لاکھوں ایرانی عوام نے پُر امن طور پر شاہ کی اقتدار سے رخصتی اور خمینی کی وطن واپسی'' کا مطالبہ کیا۔ جن کو منوانے کے لیے خمینی نے تین نکاتی مطالبہ کا اعلان کیا۔

۱۔ جیسا کہ مذہبی حقوق کے دائرے میں عوام نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے، ایک اسلامی انقلابی کونسل قائم کر دی گئی ہے۔

۲۔ اِس کے ممبران کا جلد ہی مناسب موقعہ پر اعلان کر دیا جائے گا۔

۳۔ انقلابی کونسل کے قیام کا اعلان ایران کی حکومت کا بطور ایک حکومتی ادارہ چلانے کی طرف پہلا مثبت اقدام تھا۔

اب شاہ نے دِل سے تسلیم کر لیا، کہ اب سوائے خاموشی سے اقتدار سے رخصتی اور ایران چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلے جانے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔

۱) ۱۶ ر جنوری ۱۹۷۸ مریض شاہ نے اپنا بوریا بستر باندھ کر کسی غیر ملک جانے میں عافیت سمجھی اور ملکہ ثریا اسفندیاری جس کو اِس وجہ سے طلاق دیدی تھی، کہ اُس نے اُس کو اِس کے جانشین کا جنم نہیں دیا تھا اور دوسری خاتون فرحت سے شادی کی تھی کہ وہ جانشین جنم دے گی، اُس نے جانشین جنم دیا، جو تخت نشین نہ ہو سکا۔ جبکہ خود شاہ اور جانشین بیٹا ایک سبقِ عبرت بن کر ایران سے رخصت ہوئے۔ اور دوبارہ وطن نہ لوٹے۔

۲) دو ہفتہ بعد یکم فروری کے روز خمینی ایک فاتح لیڈر کے طور پر وطن واپس لوٹے اور لاکھوں عوام نے ''رہنمائے انقلاب'' کے طور پر آپ کا استقبال کیا۔ اب آپ صحیح معنوں میں ایک حکمران تھے۔

امام خمینی بطور ایک حکمران:

رضا شاہ کی رخصتی کے بعد خمینی جو ''حکومتِ کاملہ، کامل معاشرہ اور راست باز عوام''

Marfat.com

کے دعوے کرتے تھے، اب حکومت کے منصب پر تھے۔ اب وہ بطور ایک منصف قانون ساز، بطور ایک سیاستدان اور بطور ایک ''صوفی کامل'' حکومت کے سربراہ تھے، جیسے ہی آپ بطور ایک حکمران تہران وارد ہوئے، انکے لہجہ میں بھی تبدیلی آ گئی اور وہ سمجھ چکے تھے کہ انہوں نے چونکہ حکومتی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں، لہٰذا اُن سے عہدہ برآ ہونے کیلئے کیا اقدامات اور کیونکر ضروری ہوں گے۔ جس میں اولاً یہ ضروری ہوگا، کہ اِس انقلاب لانے میں جن افراد نے اُن کا ساتھ دیا ہے، اُن کو اپنے سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ اپنی حکمرانی قائم کرنے کیلئے انہوں نے اپنی کتاب ''ولایت فِقیہ'' کا حوالہ دیا، جسے ایرانی علماء نے مسترد کر دیا تھا، لیکن آپ نے اِن علما کی پرواہ اور اقتدار سنبھالے بغیر مہدی بازرگان کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔ جس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا۔

اُدھر سے جناب خمینی پورے اعتماد کے ساتھ ''ولایت فِقیہ'' کے فلسفہ کے تحت بطور ایک حکمران اپنی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ کیونکہ اِس کے بغیر نہ معروف کو نافذ کر کے عوام کو بھلائی مہیا کی جا سکتی ہے اور نہ شر اور بُرائی کو مٹایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اِس معاملہ میں آپ کا پہلا اقدام یہ تھا کہ جن افراد اور سرکاری اہلکاروں نے شاہ کی حکومت کی خدمت کی ہے، وہ بُرائی کا نشانہ تھے۔ اُن کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ اپنی جگہ علماء اور بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ آپ کا اعلان ایک عام اعلان ہے۔ لیکن آپ نے مہدی بازرگان جیسے سلجھے سیاستدان کو بطور وزیراعظم اعتماد میں لے کر اپنی حکومت مستحکم کر لی اور امیر عباس ہویدا جو شاہ کا بارہ سال وزیراعظم رہ چکا تھا۔ اُس سمیت دوصد دیگر شاہی اہلکاروں کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ نچلے درجہ کے دیگر فوجی افسران، سول اہلکاروں اور جرائم میں ملوث دیگر افراد کی باری بعد میں آئی۔

خمینی کا یہ ''نظام اقتدار'' بطور اِسلام ماضی آسانی سے سمجھ میں نہیں آنے والا تھا، لیکن آپ نے اور آپکے مقلدین نے اِسے ''انقلابی اسلام'' کا نام دیا، کہ اللہ تعالیٰ ''رحمان و رحیم'' ہونے کیساتھ ''جبار اور قہار'' بھی ہے، اور قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ''ظلم کو مٹانے والا ہے''۔ انکے اِس اقدام نے مذہب کے سہارے اِس بے رحمی پر پردہ ڈال دیا۔ جس میں رہنمائے انقلاب خمینی اور بازرگان کے انسانی حقوق کے بارے میں نظریات میں ہم خیالی ہے، لیکن بازرگان کی حیثیت

Marfat.com

ثانوی ہے، اصل طاقت خمینی کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا مظاہرہ ۴ رنومبر ۱۹۷۹ء کے روز خمینی کے حامی طلباء نے امریکی سفارت خانہ کا محاصرہ کر کے اُس پر قبضہ کر کے کیا، جو بازرگان کے نزدیک صحیح نہیں تھا، چنانچہ اُس نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دیدیا، جسے خمینی نے فوراً منظور کر کے شاہی اور دیگر نظامِ حکمرانی کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا اور نظامِ حکومت ایک ''انقلابی کونسل'' کے حوالہ کر دیا، جو قانون ساز شیعہ کی ایگزیکٹو ہوگی، اور آئینی ریفرینڈم اور صدارتی انتخابات کا اہتمام کریگی۔

اِس موقعہ پر آپ کی پوزیشن کھل کر سامنے آگئی، کہ بطور ایک حکمران آپ کے کیا عزائم ہیں۔ ''آئینی کونسل'' کو بلا کسی محاکمہ اپنا تابع قرار دے کر اُسے حکم جاری کیا، وہ تمام بے گھروں کو گھر دے۔ جن کو آپ نے انقلاب کا ستون قرار دیا۔ تمام بے گھروں کو گھر مہیا کرنیکی دو وجوہات تھیں۔ ایک نظریاتی نمونہ اور ایک سیاسی۔ اِس اقدام سے اُنکی غرض یہ تھی کہ بزعمِ خود دانشور طبقہ، بائیں بازو، قوم پرستوں اور آزاد خیالوں کی زبانیں بند کر دی جائیں۔ جبکہ امریکی سفارت خانہ کے اہلکار جن کو یرغمال بنایا گیا تھا، اسلامی حکومت کو اِس امر کی اجازت ہے کہ اگر امریکی حکومت کے خلاف کوئی عدم اطمینان ہے تو عدم اطمینان کا ساتھ دے، کیونکہ امریکہ نے بزورِ قوت نہیں بلکہ بذریعہ قلم مداخلت کی تھی۔

آہستہ آہستہ طاقت کے تمام ستونوں پر انکے ہم خیال علما کا قبضہ بڑھتا گیا، اور تمام مخالفت کو غیر موٴثر کر دیا گیا، یا دبا دیا گیا یا بالکل ختم کر دیا گیا، یا اپنا ہم نوا بنالیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء تک جبکہ اختیارات ایک ''انقلابی کونسل'' کے ہاتھوں میں تھے، بطور صدر حجۃ الاسلام خامنہ ئی کو منتقل کر دیئے گئے۔ جبکہ اپنی فکر کے مطابق آپ نے ایران کی حکومت کا اقتدار سنبھالنے کے بعد ایران کو ایک اسلامی ریاست سمجھ لیا تھا۔

یہ مقاصد حاصل کرنے کے بعد اب سوال یہ تھا، کہ ایران میں اسلامی ریاست جاری رہے اور اب اِس کے بعد کون جانشین ہو؟ چنانچہ نومبر ۱۹۸۵ء میں خمینی کے مشورے سے ''ماہرین کونسل'' نے آیت اللہ حسین علی منتظری کو خمینی کے بعد آپ کا جانشین مقرر کر دیا۔ جو ایک معروف عالمِ دین اور خمینی کے علاوہ خود جناب خمینی کے شاگرد تھے۔ لیکن بطور ایک جانشین مقرر کیے جانے

Marfat.com

کے جناب خمینی نے دیکھا کہ انسانی حقوق بدستور پامال ہیں، بالخصوص جیلوں میں جو لوگ قید ہیں، وہ تشدد کا شکار ہیں، بدعنوانی مکمل طور پر ختم نہ کی جا سکی، سرکاری ملازمین بھی بدستور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال میں آزاد ہیں اور وہی ''سُرخ فیتہ'' ہے، جس کی بنا پر جناب خمینی نے محسوس کیا، کہ یہ لوگ اِسلامی جمہوریہ کیلئے خطرہ ہیں، چنانچہ مارچ ۱۹۸۹ء آپ نے منتظری سے استعفیٰ طلب کر کے اُنکو حکومت سے علیحدہ کر دیا اور آئین پر نظر ثانی کیلئے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔

منتظری کی منظر سے علیحدگی غالباً ایک نئی تبدیلی کا آغاز تھا، جبکہ منتظری کی شخصیت بحیثیت ایک سرکردہ مذہبی عالمِ دین آخری موثر دینی شخصیت تھی۔ اب اُن کی جگہ اسمبلی نے جس شخص کو منتخب کرنا تھا، اُس کی حیثیت ایک کمتر درجہ کے عالم کی تھی، جناب خمینی کے فلسفہ ''ولایت'' کے مطابق ملکی نظام چلانے کے لیے کوئی بلند پایہ فقیہ موجود نہ تھا۔ جبکہ منتظری کے ہٹائے جانے سے قبل بھی جناب خمینی کو بطور ایک حکمران ملکی نظام چلانے میں کافی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ایسے حالات میں جب روزمرہ کے معاملات حل کرنے میں دباؤ بڑھ رہا تھا، جناب خمینی کو سخت اقدامات اختیار کرنا پڑے۔ جنوری ۱۹۸۸ء میں ''ولایت متعلقہ فقیہ'' کے عنوان سے ایک اہم بیان جاری کیا۔ جس کا مطلب ایک مذہبی شخص کا مکمل اختیار کا مالک ہونا تھا۔ اِس بیان میں آپ کا اِس امر پر زور تھا، کہ ''اِسلامی ریاست جو نبی آخرالزمان ﷺ کی مکمل رہنمائی کی پابند ہے، عبادات، روزہ اور ادائیگی حج تک کے معاملات میں اپنے اختیارات استعمال کر سکتی ہے۔'' اِس نظریہ کے مطابق ایک اسلامی ریاست کسی آئین کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ کیونکہ اِس سے قبل کوئی ایسی مثال نہ تھی، اِس سے یہ نظر آنے لگا، کہ (خمینی بطور فقیہ) کوئی تبدیلی لانے والے ہیں، یا کسی اور ''اعلیٰ'' مقصد کی خاطر اُن اِسلامی احکامات کو بھی غیر موثر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جو اسلامی قانون کا حصہ ہیں۔ جبکہ شیعی نقطہ نظر سے یہ بیان ہر لحاظ سے کوئی جواز نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی شیعی تاریخ میں اِس کی کوئی مثال ہے۔ اِس بارے میں یہ سوال پیدا ہو رہے تھے:

۱) کیا صرف خمینی کی ذات ہی واحد قانون ساز ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبہ میں حاکمیت قائم کر کے فردِ واحد کے طور پر اپنا دائرۂ حکومت بڑھا رہے ہیں یا

Marfat.com

۲) وہ ایک ایسے صوفی ہیں جو سیاست میں ''ولایتِ مطلقہ عرفانی'' میں جگہ دے کر تصوف کو حاکمانہ اختیارات دے رہے ہیں؟

البتہ واقعات کے ردِ عمل میں جناب خمینی کے رویہ سے یہ صاف ظاہر تھا، کہ آپ نے جن علماء کو حکومت میں حکمرانی کے مواقع دے کر اُن سے جو خیر کی توقعات وابستہ کی تھیں، وہ اُن سے غیر مطمئن ہیں، اور اُن کو یہ کہنے کا موقعہ ملا، کہ صرف ایک ''فقیہ'' ہی کامل اختیارات کا جواز رکھتا ہے۔ لیکن اِس بارے میں آپ نے اِس کے حق میں جو دلائل دیئے، وہ دلائل ناکام ثابت ہوئے۔

بحیثیت ایک ''فقیہ'' آپ کا آخری فتویٰ بدنام زمانہ سلمان رشدی کے خلاف تھا۔ جو آپ نے ۱۴ ارفروری ۱۹۸۹ء کو جاری کیا کہ اِس مرتد نے اُمتِ مسلمہ اور اِسلام کے خلاف گستاخانہ کتاب تصنیف کر کے اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ کے غضب کا شکار بنایا ہے، ایسے میں جو مسلمان اُس کو قتل کرنے کے نتیجہ میں موت سے ہم کنار ہو وہ بلاشبہ شہید ہے۔ آپ کے نزدیک عراق کے محاذ پر شکست (جہاں آپ فتح کے منتظر تھے) اور رُشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' اِسلام کے خلاف بین الاقوامی سازشیں ہیں۔ جبکہ یہ سازشیں ایران کے اِسلامی انقلاب کے خلاف ہیں۔

آیا کہ یہ موضوعات جو آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں منصۂ شہود پر لائے، اپنی زوال پذیر شہرت کو زندگی بخشنے کی خاطر تھے، کوئی فیصلہ قبل از وقت ہے، لیکن ایران میں انقلاب سے جو توقعات تھیں، اور جن افراد نے اقتدار سنبھالا۔ وہ انقلاب کے بارے میں اپنی توقعات کی کامیابی میں ناکام کہے جاسکتے ہیں۔

حرفِ آخر:

بحیثیت ایک دانشور ایران میں اُن کا مقام نفاذِ شریعت اور سیاست کو مربوط کرنا تھا۔ اِسلام کے بارے میں اُن کی فکر کو عملی شکل دینا تھا۔ بجائے اِس کے کہ بے عمل منصوبے بنائے جائیں۔ اقتدار سے باہر اپوزیشن میں اُن کے نظریات ایک اثاثہ تھے، لیکن اِن نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے جب اقتدار میں آئے، تو اثاثہ کی بجائے عذابِ جان بن کر سوار ہو گئے۔ اِسلام کی ترجمانی میں کسی قسم کی مصالحت و مفاہمت اُن کے تصور سے بعید تھی۔ جب عملی سیاست میں آئے،

Marfat.com

تو مصالحت و مفاہمت دونوں سے کام لینا پڑا۔ لیکن اِس سے قبل مصالحت و مفاہمت کی پالیسی نہ اپنانے کے نتیجہ میں عراق کے ساتھ جنگ میں ایران کو اربوں ڈالر کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ بین الاقوامی سیاست میں وہ حقائق کا اندازہ لگانے میں بُری طرح ناکام ہوئے اور امریکہ اور رُوس دونوں کو اپنے خلاف بنا کر نقصان اُٹھایا۔ مزید برآں جلاوطنی سے ایران آنے کے بعد آپ نے اندرونِ ایران کوئی سفر نہیں کیا اور اپنے رہائش گاہ پر بند ہو کر بیٹھ گئے اور آپ کا ذریعہ معلومات آپ کے صرف اُن اصحاب پر محدود تھا، جو وقتاً فوقتاً آپ سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد آپ یہ سمجھتے رہے کہ ایرانی عوام کی اکثریت اُن کی حمایت میں ہے اور مرتے دم تک آپ یہی سمجھتے رہے۔ اِس کی وجہ یہ تھی، کہ اقتدار میں جو طبقہ تھا، وہ نوجوان اور آپ ہی کا تیار کردہ تھا۔ لیکن آپ کی سب سے بڑی کمزوری اپنے بارے میں یہ شدید خوش فہمی تھی، کہ جو لوگ اُن کے اور اُن کی حکومت کے خلاف ہیں، وہ کافر ہیں، اور اسلام و ایران کی بقا کی خاطر اُن کا قلع قمع کر دیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اِس عقیدہ کے تحت آپ نے جن لاتعداد لوگوں کو تختہ دار پر چڑھایا، پندرھویں صدی میں ہسپانیہ کے بادشاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا نے Spanish Inqubilis کے نام سے ہسپانیہ سے مسلمانوں کا وجود ختم کیا، اُس لحاظ سے مذہب کے نام پر خمینی کی یہ سزائیں دوسرے نام پر قرار دی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ خمینی کے ''انسانِ کامل'' کے تصور میں مخالفین کی دُنیا میں کوئی جگہ نہ تھی۔

افراطِ زر، غیر ملکی تجارت، معاشی طور پر پرائیویٹ سیکٹر کے رول، ایک فرد زیادہ سے زیادہ کتنے اثاثہ کا مالک ہو وغیرہ وغیرہ ایسے موضوعات تھے، جن پر کوئی حتمی رائے یا فیصلہ نہ دینا سرکاری اہل کاروں کے لیے پریشان کُن رہا۔ اِسی طرح ''قناعت'' کے موضوعات پر ہر حلقہ نے خود جناب خمینی کے حوالے سے اپنے اپنے مفادات کی خاطر مختلف معانی پہنائے۔

اِسلامی ریاست کی بقا کے بارے میں بین الاقوامی اور داخلی دباؤ پر آپ کی رائے کہ ''حکمران کی مکمل تابعداری'' کا بہ الفاظ دیگر اہلِ سنت کا اِسلام ہے، جس سے اہلِ تشیع جو ایران کا مذہب ہے، اختلاف رکھتے ہیں۔

جناب خمینی کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو ''اِسلام میں آئین کی عملداری'' تھا۔ اِس پہلو پر

Marfat.com

عمل درآمد نے ایران کی بقا کا سرمایہ فراہم کیا۔ لیکن اپنے بعد جو حکومت کا ڈھانچہ چھوڑا، وہ جمہوریت نہیں ہے۔ جس میں اِسلام پسندوں کے مختلف نظریہ ہائے فکر ہیں۔ جو ایران کے سماجی اقتصادی مسائل کے حل میں کارفرما ہیں۔ (یہی وہ عوامل ہیں، جو آپ کو احیائے اِسلام کے درخشندہ ستاروں میں کھڑا کرتے ہیں)۔

جناب خمینی جو بڑی شدت سے اِسلامی ریاست کی بقا کے حق میں تھے، کہ حالات کے لحاظ سے تبدیلیاں آہستہ آہستہ عمل میں لائی جائیں۔ بعض باتیں مثلاً شطرنج کا کھیل، آلاتِ موسیقی کی خرید وفروخت، ملکیت اراضی کا انتقال وغیرہ جو قبل ازیں ممنوع تھے، آپ نے اُن کی اجازت دی۔ جناب خمینی کی رائے میں حکومت کا اِسلام کا پابند ہونا ضروری ہے، نہ کہ اِسلام کسی حکومتی قانون کا اور اِس لحاظ سے آپ نے صرف اور صرف اپنی شخصیت کو (بحیثیت ایک فقیہ) واحد قانون ساز قرار دیا۔ اِس لحاظ سے جناب خمینی نے صرف اپنی ذات کو اِسلام کا واحد ترجمانی قرار دے کر حکومتی مشینری کے معاشرتی، اقتصادی، خارجی امور اور دیگر شعبوں کے لیے ایسے لاینحل مسائل پیدا کیے، جن سے آج ایران کی حکومت دوچار ہے اور اِس نے اس نظریہ کو ہوا بخشی کہ اِسلام بطور ایک مذہب تمام مسائل حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اِس کے نتیجہ میں آپ کے پیروکاروں میں کئی طبقے پیدا ہوئے، ایک علماء کا وہ طبقہ کہ سیاست سیاستدانوں پر چھوڑ دی جائے، دوسرا وہ کہ سیاست کو دین سے جُدا نہ کی جائے۔ ایک وہ طبقہ ہے، جس کے پاس آج ایران کی حکومت ہے اور اِسلام کی ترجمانی میں قدرے وسیع الخیال ہے۔ اِسلام کی رُوحانی اور دُنیاوی ضروریات پورا کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ پہلا طبقہ جس کا خیال ہے کہ سیاست کا میدان سیاستدانوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اِسلام کو ریاست سے خارج کر دیا جائے۔۔ مؤخرالذکر رویہ اختیار کرنے میں اِسلام کا دخل ایک آمیزش اور ملاوٹ کی شکل اختیار کر جائیگا اور یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جائیگا، کہ قبل از انقلاب اور بعد از انقلاب کیا تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ جبکہ خمینی کے جانباز پیروکار آپکی تصاویر انگلینڈ میں بریڈفورڈ کی گلیوں میں رُوس میں ''باکو'' میں مقبوضہ کشمیر میں لیے پھرتے ہیں۔ کوئی اِسکے نظریات کی نئی نئی تاویلات کر رہا ہے، کوئی اُسکی حکومت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔

Marfat.com

بحیثیت ایک سیاستدان اُسکے ایک مضبوط سیاستدان ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جس میں اُنہوں نے تصوف کا عنصر شامل کر کے سیاست کو ایک نیا "نشہ" بخشا اور یہی تاثر دیا کہ آپ بحیثیت ایک عادل قانون ساز حکمران اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔ بحیثیت ایک "صوفی"، آپ بلند پایہ مذہبی سکالر بحیثیت ایک سیاستدان بوقت ضرورت، جسکے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اپنی شخصیت کے بارے میں آپکے تین اندازے تھے۔ (۱) ایک قانون ساز (۲) ایک صوفی (۳) ایک سیاستدان۔ اِس لحاظ سے آپ اپنے آپ کو تینوں کا مرکب سمجھتے تھے اور اِن تینوں میں علیحدگی کا کوئی عنصر نہیں تھا اور اِس طرح آپ اپنی ذات میں "انسانِ کامل" تھے۔ اِس حیثیت سے موجودہ اِیران کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو اُس سے انکار ممکن نہیں، لیکن مستقبل میں آپکے نیک ارادوں اور ترجیحات سے قطع نظر کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔

اِس کے ساتھ جناب باقر معین کا مضمون امام خمینی کی شخصیت پر ختم ہوتا ہے۔

جناب باقر معین نے اپنے مضمون میں صرف امام خمینی کی ذات کو ایران میں انقلاب کا سبب بیان کیا ہے۔ جو قطعاً صحیح نہیں۔ کیونکہ آپ کو رضا شاہ نے ۱۹۶۴ء کے اواخر میں ملک بدر کر دیا تھا۔ جبکہ انقلاب ۱۹۷۷ء کے عین آخر، ۵ دسمبر ۱۹۷۷ء میں رونما ہوا۔ اِس طرح آپ پورے تیرہ سال بغیر کسی آزمائش ملک سے باہر عراق میں شاہ کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، اور اِن تیرہ سالوں میں مقبولِ عوام نوجوان اِسلامی لیڈر ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۷ء جناب علی شریعتی ایران میں رہ کر بادشاہت کے خلاف قید بند کی پوری صعوبتوں کے ساتھ انقلاب کی راہ ہموار کرتے رہے، اور ۱۸ر جون ۱۹۷۷ء کو انتہائی خفیہ طریقہ سے ایران سے لنڈن پہنچے اور اگلے روز اپنے کمرہ میں مردہ پائے گئے، جس کا ذکر اِس کتاب میں کتاب کے مصنف علی رہنما کے مضمون سے مطالعہ میں آئے گا۔ البتہ آپ کی جدوجہد امام خمینی کے حق میں گئی اور آپ بحیثیت حکمران واپس لوٹے۔ جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ اگر جناب علی شریعتی زندہ ہوتے، تو عین ممکن تھا دونوں کے حامیوں کے درمیان عظیم تصادم ہوتا اور وہ انقلاب برپا نہ ہوتا۔ جس کی ایران کو سامراجی طاقتوں کے مقابلہ میں ضرورت تھی۔

Marfat.com

۶

سید قطب شہیدؒ

۱۹۰۶ تا ۱۹۶۶ء

چارلس ٹرپ

Charles Tripp

جناب سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی پاکیزہ زندگی پر یہ مضمون مغربی سکالر چارلس ٹرپ کا مرہون ہے، جو اِس لحاظ سے اہم ہے، کہ شہید کی پاکیزہ زندگی کے بارے میں مغربی سکالرز بھی کتنی اچھی رائے رکھتے ہیں اور ہمارے بعض مسلمان دوست جمال عبدالناصر جیسے معمولی شخص کو اِسلام کا ہیرو خیال کرتے ہیں، جس نے ایک سازش کے ذریعے مصر کے اقتدار پر قبضہ کیا، اور سیکولرذہن کا مالک ہوتے ہوئے ''پین عرب نیشنلزم'' کے نام پر اِسرائیل کے خلاف عالمِ عرب کا مسلّمہ واحد لیڈر ہونے کا داعی ہونے کیساتھ اِسرائیل کو مٹا دینے کا دعویٰ کیا، اسرائیل کو تو کیا مٹنا تھا' ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی جارحیت کی چھ روزہ جنگ کا بھی مقابلہ نہ کرسکا اور مصر کو ایک انتہائی شرمناک شکست سے دو چار کیا، البتہ اپنے دورِ آمریت میں نہ صرف مصر کے سید قطب اور اُنکے ساتھ دیگر کئی مقبولِ عوام داعیانِ اسلام کو اولاً جیلوں میں محبوس کر کے اور بعد ازاں تختہ دار پر لٹکا کر اُن کو درجہ شہادت سے ہم کنار کیا، بلکہ اِنکے علاوہ ہزار ہا دیگر اِسلام کے سچے نام لیواؤں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا۔

مضمون نگار نے اپنے اِس مضمون کی تیاری میں کوئی ۹۰ کے قریب حوالہ جات خود سید قطب شہید کی تصانیف کے علاوہ مغربی سکالرز اور مصر کے معروف سکالرز کی عرب تصانیف سے دیئے ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اُن تصانیف کے نام بمعہ اسمائے مصنّفین تحریر میں لائے

Marfat.com

جائیں، تاکہ شہید کی عظیم شخصیت کا قدرے اندازہ ہو سکے، کہ مغربی سکالرز اپنی تصانیف اور آرٹیکلز میں کتنی محنت کرتے ہیں۔

۱) مع سید قطب فی فکرۃ السیاسی والدین	ماجدی فضل اللہ
۲) موسسات الرسالتہ	محمد توفیق برکات
۳) التصویر فنی فی القرآن الکریم	سید قطب
۴) المطتطاف	سید قطب
۵) اخوان المسلمون: احداث صنعت التاریخ	محمد عبد الحلیم
۶) معلم فی الطارق	سید قطب
۷) الاخوان المسلمون: فی میزان الحق	فرید عبد الخالق
۸) معرکۃ الاسلام والو اسمالیۃ	سید قطب
۹) العدلیۃ الاسلام فی الاسلام	سید قطب

اسی طرح اس مضمون کی تیاری کیلئے نامور مصنفین کی متعدد انگریزی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

قاری کے دل میں اُمید کی ایک کرن اُبھرتی ہے کہ آپ ناصری آمریت کا شکار ہو کر گیارہ سال قید میں گزارتے ہیں۔ لیکن اِس میں ایک سچے مومن کی حیثیت میں قرآنِ کریم کی آیت کی روشنی میں ''شر میں خیر'' کا پہلو دیکھتے نظر آتے ہیں۔ اِن تمام تجربات میں سے گزرنے کے بعد یہ سمجھنا دُشوار نہیں کہ آپ کا ''معاشرہ، سیاست اور دُنیا میں اِسلام کا کیا مقام ہے؟''

تاہم آپ کے نظریات کو اپنی ''خودنوشت سوانح حیات'' سے ہٹ کر اِس امر کی ضرورت ہے کہ آپ کی اُس فکر اور بنیاد کا جائزہ لیا جائے، جن کو سامنے رکھتے ہوئے آپ مسائل کا حل کرنے کے قائل تھے۔ یہ اِس وجہ سے ضروری ہے، کہ آپ یہ سمجھتے تھے، کہ آپ جو کچھ تحریر میں لا رہے ہیں، وہ اِسلام کا نکتہ نظر ہے، اور اِس کے خلاف جو ہے وہ ''جاہلیت'' یا غیر اِسلامی ہے اور منطقی طور پر درست نہیں۔ آپ بیسویں صدی کے نصف کے اہم مسلم دانشور ہیں، جبکہ آپ

Marfat.com

کو اُن قوتوں اور دانشوروں کا بھی سامنا ہے، جن کے خلاف آپ صف آرا ہیں۔ آپ کا اِس امر پر اصرار تھا، کہ آپ کی تحریروں کو محض تحریریں خیال کر کے نظرانداز نہیں کرنا چاہئے، بلکہ موثر عمل کی بنیاد ہونا چاہئیں۔ آپ کی تحریروں نے نوجوانوں کے ایک حلقہ کو متاثر کیا، اور آپ کی تحریروں کو حرفِ آخر یقین کر کے بذریعہ حصولِ اقتدار ''حیاتِ نو'' قائم کرنا اپنا مطمع نظر قرار دیا۔

سید قطبؒ کی زندگی کا کردار اور تحریریں:

آپ کی زندگی مصر کا وہ دور ہے، جب بادشاہت دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے، اور اُس کے بعد اُس پر ناصرازم کی فرعونیت مسلط ہو جاتی ہے۔ آغاز میں جب مصر پر برطانیہ کی عملداری ہے۔ جہاں اُس سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک ہے۔ وہاں یہ تحریکیں اِس بحث کا شکار بھی ہیں، کہ برطانیہ کے چلے جانے کے بعد حکومت کا ڈھانچہ کیا ہو۔

آپ ۱۹۰۶ء میں بالائی مصر کی ایک دیہاتی بستی کے مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ کی عمر پندرہ سولہ سال بھی نہ ہوئی تھی کہ اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے لیے قاہرہ چلے آئے۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد درجہ بدرجہ اولاً ایک ٹیچر، بعدازاں انسپکٹر اور اِس کے بعد وزارتِ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدہ تک پہنچے، لیکن ۱۹۵۳ء میں آپ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ دورانِ ملازمت اپنی خداداد علمی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اُٹھایا، اور بطور ایک معروف کالم نگار، مصنف اور نقاد ملک میں مشہور ہو گئے، بالخصوص وقت کی معروف علمی شخصیت عباس العقاد سے متاثر ہو کر اُن کے حلقہ مزید نشو ونما پختگی اور علمی مباحث میں حصہ لینے لگے۔ مباحث کا محور زیادہ تر مصری معاشرہ تھا، اور بحیثیت ایک قومی برادری عوام اپنے تشخص اور خودمختاری کے خواہاں تھے، کیونکہ مصر پر برطانیہ کا کنٹرول تھا، اور کلیدی سوال ''مصر صرف مصریوں کا ہے'' جو ۱۸۸۰ء سے ایک عام نعرہ تھا۔ ایک طرف خلافت عثمانیہ کا حصہ لیکن عملاً یورپین طاقتوں کے قبضہ میں تھا۔ اس کے بعد سے اِن طاقتوں کا کنٹرول ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ لازمی تھا، کہ اب مصر کا سیاسی ڈھانچہ کیا ہو، جو بتدریج اُبھر رہا تھا۔

اِس لحاظ سے جو اُس دور کی معروف شخصیات تھیں، اجتماعی طور پر یہ تصور تھا، کہ مصر کی جو

Marfat.com

تاریخ اور معاشرہ ہے۔ اُس کا تقاضہ تھا، کہ مصر اِسلام کا حصہ ہے۔ لیکن اِس کو عملی شکل دینے کے لیے مختلف نظریات تھے۔

۱) ریاست کے ڈھانچہ میں مسلم اور غیر مسلم کی جو مخلوط اجتماعیت ہے، اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۲) ایک وہ لوگ تھے، مصری قوم اپنے مسلم تشخص سے معروف ہے، لہٰذا اس کی سیاسی بنیاد شریعت کے مطابق ہوگی۔

۳) پھر ایک تیسرا طبقہ وہ تھا، اِسلامی نظریہ قدرے نئے تصور کا متقاضی ہے، جو مغربی تصور اور ریاست سے ہٹ کر ہو، لیکن اِسلامی ڈھانچہ میں ہو۔

سید قطبؒ قدرے مختلف لیکن مستقبل کے بارے میں قدرے پُر اُمید نظر آئے۔ جبکہ اکثر لوگ خواہ سماجی ہو یا اقتصادی، سیاسی ہو یا تہذیبی، مایوسی کا شکار تھے۔ لہٰذا ضروری ہو گیا، کہ کوئی بہتر نقشہ پیش کیا جائے۔ لہٰذا صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں جب مصر مایوسی کا شکار ہے، آپ محسوس کرتے ہیں، کہ مصری بحیثیت قوم اِس پوزیشن میں ہیں کہ وہ اِس کا علاج کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اِس کا علاج سیاسی تبدیلی یا کوئی انقلاب ہو، لیکن عوام کی تبدیلی، قسمت کو نئے سرے سے بدلا جائے، یا اُس کا مناسب تشخص قائم کیا جائے، اگرچہ آسان نہیں، لیکن اس پر غور کیا جائے۔ یہ مباحث خواہ مصر میں جاری تھے یا باہر، اِن کے بارے میں مرکزی سوال یہ ہوتا تھا، کہ کیا تبدیلی لائی جائے، کہ حالات بہتر ہو سکیں۔

اِن مباحثوں میں آپ کا زور اخلاقی اقدار کی بحالی پر ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ معاشرہ اور آپ کے گرد جو لوگ ہیں، بُری طرح اخلاقی زوال میں مبتلا ہیں، اور اِس وجہ سے اُن کے لیے جہاں یہ سمجھنا مشکل نہ تھا، کہ زوال کی اصل وجہ اخلاقیات کا زوال ہے، لہٰذا ایک اچھی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی بحالی پر زور دیا جائے۔ اُس وقت بعض ادبی حلقوں میں احیائے اسلام کا ذِکر بھی جاری تھا، جن سے آپ متاثر تھے۔ مزید برآں قرآنِ کریم میں بعض قوموں اور اُن پر عذاب کا جس افسانوی انداز میں ذِکر ہے، اُن کو نہ صرف اپنے

Marfat.com

ذوق کے مطابق پایا، بلکہ جن لوگوں نے مغربی طرزِ فکر اپنا لیا تھا، اُن کو اُن کے اپنے حال پر چھوڑ دینا مناسب خیال کیا اور زیادہ تر مناسب یہی خیال کیا، کہ اُن کو ورثہ میں جو اسلامی اقدار ملی ہیں، جس قدر ممکن ہے، دوسروں کو بھی اُن سے آگاہ کیا جائے، جو اُن کی صلاحیتوں کا تقاضہ ہے۔

اِس لحاظ سے صدی کے چوتھے عشرے میں آپ اسی رُخ پر کام کرتے رہے۔ آپ کی اخلاقی سوچ کا یہ وہ مرکز ہے، جس کے بل بوتے پر آپ نے دوسروں کو جانچا، جس کی بنیاد سماجی تقاضے تھے یا وہ انسانی نفسیات جن کی رُو سے آپ اسلام سمجھتے تھے۔ اِس مرحلہ پر بطور ایک فرد اِسلام کے بنیادی تقاضوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں، محض اپنے ماحول کے اردگرد مسلمان معاشرے کے نکتہ نظر سے نہیں، بلکہ اپنے نکتہ نظر سے، جس کے مطابق آپ نے باقی دُنیا کا مطالعہ کیا یا اپنی صلاحیتوں اور تحریر کے لحاظ سے۔ المختصر! واقعات اِس امر کے شاہد ہیں، کہ اُن دِنوں اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ کوشش کر رہے تھے، کہ اِسلام اپنی ذات میں ایک فرد کے مفاد اور اُس کی ضرورت پورا کرنے میں بے مثال ہے۔ جسے دُوسرے لوگ بھی سمجھیں۔

اِسلام کی اِس خصوصیت کے بارے میں جتنا غور و فکر کرتے تھے، بالخصوص اِسلامی نظام کے بارے میں، آپ دوسروں سے دُوری اختیار کر رہے تھے۔ لہٰذا اوّلاً جیسا آپ فرد کا با اخلاق ہونا ضروری خیال کرتے تھے، اب یہ خیال کرنے لگے، ایسے لوگ تمام معاشرہ میں یہ تبدیلی لائیں، جو تمام معاشرے کے تحفظ کی ضامن ہوگی۔ اِسکے نتیجہ میں تمام دیگر نظام محض بیکار ثابت ہونگے۔

بطور ایک مصری شہری، جو ایک طویل عرصہ سے برطانوی کنٹرول میں تھا، وہ بخوبی یہ سمجھتے تھے کہ اُن کے ملک کا اصل دُشمن کون ہے۔ لیکن اِس کے بعد آپ ۵۰-۱۹۴۸ء عرصہ دو سال کے لیے وزارتِ تعلیم کی طرف سے امریکہ مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے، تو محسوس کیا، کہ ”ایک دوسرے سے بڑھ کر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے“ چنانچہ برطانوی سامراج کا وسیع حلقہ دُشمنوں میں ایک دشمن حلقہ کہا جا سکتا ہے، جبکہ مغربی دُنیا کے سیکولرازم، مادہ پرست، سرمایہ دار اور دیگر تمام حلقے دشمنی میں سبھی برابر ہیں۔ لہٰذا ۱۹۵۰ء میں امریکہ سے واپسی کے بعد آپ کے لہجہ میں بطور ایک فرد زیادہ سخت تبدیلی رونما ہوگئی۔

Marfat.com

۱۹۵۰ء میں امریکہ سے واپسی کے بعد مشاہدہ کیا، کہ ملکی سیاست سخت تناؤ کا شکار ہے، جس کے نتیجہ میں چند گمنام فوجی افسروں نے فائدہ اُٹھایا اور کرنل کے عہدہ کے ایک معمولی افسر جمال عبدالناصر نے جولائی ۱۹۵۲ء میں حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار سنبھال لیا۔ جبکہ یہی وہ دور تھا، کہ آپ کی تحریریں ملکی سیاست اور معاشرتی زندگی پر سخت تنقید کا باعث بن گئیں اور آپ نے بخوبی یہ یقین کر لیا تھا، کہ آپ کا ہم عصر جو مصری معاشرہ ہے، وہ ایسا لاتعداد بیماریوں کا شکار ہے کہ اِن سب کا علاج صرف اور صرف اِسلام کو اپنانے میں ہے۔ جو معاشرے اور ریاست دونوں پر لاگو ہوتا ہے۔ ایسے میں آپ کی اِسلامی فکر اور اُن کو عملی شکل دینے کے لحاظ سے اپنے ارد گرد حلقہ کو اپنی تحریروں کے ذریعہ مخاطب کرنا ضروری اور مقدم خیال کیا۔

۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۱ء یہ تین کتابیں تحریر میں لائیں۔

۱) العدالة الاسلامية فى الاسلام
(اِسلام میں سماجی انصاف) ۱۹۴۹ء

۲) معركة الاسلام والرأس الماليه
(اِسلام اور سرمایہ داری کے درمیان معرکہ آرائی) ۱۹۵۱ء

۳) السلام العالمى والاسلام
عالمی امن اور اِسلام ۱۹۵۱ء

اِس لحاظ سے بیسویں صدی کے عین نصف میں یہ تصانیف نہ صرف علمی نقطہ نظر سے بلکہ مناسب عملی شکل دینے کے لحاظ سے سید قطب کا انکشاف کہا جا سکتا ہے۔ آپ اِس فکر کے مالک تھے، کہ صرف اِسلام ہی تمام سماجی، سیاسی اور دیگر مسائل کا حل ہے۔ جس سے اُن کے دور کی دُنیا دوچار ہے۔ جس کو محبت اور امن کی خواہاں عالم گیر برادری ممکن بنا سکتی ہے۔

شاید یہ ہی حیران کن امر ہو، کہ آپ نے "اخوان المسلمون" کو اپنے نظریات اور اپنی فکر کے نزدیک پایا ہو، اِس وجہ سے آپ اِس کے نزدیک ہو گئے ہوں۔ آپ نے دیکھا، کہ یہ ایک ایسی اِسلامی سیاسی تنظیم ہے، جو پورے خلوصِ نیت سے ایسا عوامی حلقہ ہے، جو قوتِ ایمانی کے بَل

Marfat.com

بوتہ پر امنِ عالم کی داعی ہے اور یہ بھی دیکھا کہ ایک طرف اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی جنگ میں اور دوسری طرف نہر سویز کے علاقہ میں برطانوی جنگی اڈوں پر یہ ''اخوان المسلمون'' کے ارکان ہی ہیں، جو باطل کے خلاف معرکہ آرا ہیں، جس سے آپ متاثر ہوئے، اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہی وہ واحد تنظیم ہے، جو اُن خصوصیات کی مالک ہے، جو آپ کی فکر پر پورا اُترتی ہے۔ چنانچہ اپنی بعد کی تحریروں میں آپ نے اُن کو نمایاں کیا۔ جو اُن کے خواب کی عملی تعبیر ہے جس کی دُنیا کو ضرورت ہے۔ چنانچہ بعدازاں ''اخوان المسلمون'' کی معروف شخصیات سے تعلقات ہوئے۔ پھر آپ کی تحریریں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت کے نظریات اور اُس کا عمل آپ کے نظریات کے عین مطابق ہیں، لیکن یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ آپ کھل کر جماعت کی رُکنیت اختیار کر لیتے ہیں اور آپ ''اخوان المسلمون'' کے شعبہ تبلیغ و اشاعت کے ناظم اعلیٰ مقرر کیے جاتے ہیں۔ جبکہ خداداد صلاحیتوں اور ہر طرح کی بے غرضی کی وجہ سے یہ آپ کے شایان شان اِس عظیم جماعت میں مناسب تقرری تھی، اور ''اخوان المسلمون'' کے لیے بھی ضروری تھا، کہ کوئی ایسی شخصیت جماعت کی اعلیٰ ذمہ داریاں سنبھالے، جو اِسلامی نظریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ اعتدال کی راہ اختیار کرنے والی ہو، کیونکہ جماعت میں تشدد کا رجحان بھی غالب تھا۔ جبکہ ۱۹۴۹ء میں ''اخوان المسلمون'' کے بانی حسن البناءؒ کی شہادت کے بعد ضروری تھا، اُنہی کی ہم پایہ شخصیت ہو، جس کی عالم اسلام کے مرکزِ اسلامی ملک مصر میں اُس وقت ضرورت تھی۔

پیشتر اِس کے کہ ''اخوان المسلمون'' جناب سید قطب کی قیادت میں قدم آگے بڑھاتی، کہ کرنل ناصر کی قیادت میں چند ''فری آفیسرز'' Free Officers نے حالات سازگار پا کر جولائی ۱۹۵۲ء میں اقتدار پر قبضہ کر لیا، جبکہ اِسی سال، دو تین ماہ قبل سید قطب نے جماعت کی قیادت سنبھالی تھی۔ ناصر نے محسوس کیا، کہ ''اخوان المسلمون'' ملک کی مضبوط منظم جماعت ہے، لہٰذا اِس جماعت کا تعاون حاصل کیا جائے۔ چنانچہ واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ناصر نے سید قطب کو ''آزاد گروہ'' Liberation Rally کے نام سے اپنے ہمراہ اقتدار سنبھالنے والوں کے ساتھ سیکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھالنے کی پیش کش کی کیونکہ وہ سمجھتے تھے، کہ چھپٹا مار کر حکومت پر قبضہ کرنا

Marfat.com

آسان کام نہیں اور شروع دنوں میں کسی کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے۔لہٰذا اگر ناصر نے سید قطب کا اتحاد اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہو، تو اِس پر شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، سید قطب نے جلد اندازہ لگالیا، کہ یہ فوجی آفیسر قول وفعل میں مخلص نہیں ہیں۔جس میں ''اخوان'' کے دوسرے رہنما بھی آپ کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ناصر نے نہ صرف ۱۹۵۴ء کے ابتدائی دنوں میں ''اخوان'' کو خلاف قانون قرار دے دیا، بلکہ سید قطب کو بھی پابندِ سلاسل کر دیا۔لیکن چند دنوں بعد فروری/ مارچ میں رہا کر دیا، کہ خود اقتدار سنبھالنے والے اِن فوجی افسروں میں ناصر کی قیادت شکوک کا شکار ہوگئی تھی۔ جسے ''انقلابی کمان کونسل'' کا نام دیا گیا تھا، جس میں ایک ٹولہ ناصر کے خلاف تھا اور کہا جاتا ہے، کہ ''اخوان'' خفیہ طور پر اُس کے ساتھ تھے، لیکن بعدازاں جیسے ہی ناصر نے اپنی بہتر مکارانہ فطرت سے اِس ٹولہ کو ناکام بنادیا، فوراً خودساختہ مخالفوں کو مختلف الزامات تراش کر مصائب کا نشانہ بناڈالا۔

اِن میں سب سے بڑا الزام یہ تراشا گیا، کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ناصر کے قتل کی سازش کی گئی، جس میں ''اخوان'' کے چیدہ چیدہ رہنما شامل ہیں۔اِس الزام کے تحت ناصر نے نہ صرف ''اخوان'' کو مکمل طور پر خلافِ قانون قرار دے دیا۔ بلکہ اقتدار کے نشہ میں ہر مخالف کو قتل کی سازش میں شامل اور ملک دُشمن بھی قرار دے دیا۔جن میں ''اخوان'' کے چھ سر کردہ رہنماؤں کو بغیر کوئی مقدمہ چلائے تختہ دار پر چڑھا کر درجہ شہادت کا اعزاز بخشا۔جبکہ سید قطب کا معاملہ مؤخر کر کے آپ کو نومبر ۱۹۵۴ء میں گرفتار کیا گیا۔لیکن گرفتار کرنے کے بعد ناصر کا یہی وہ نشہ اقتدار ہے، کہ آپ پر کوئی مقدمہ چلائے بغیر آپ کو اِس جُرم کا مجرم گردانا گیا، کہ آپ ملک دُشمن ہیں اور ۱۹۵۵ء میں آپ کو پندرہ سال قید بامشقت سنادی گئی۔ اِس لحاظ سے نومبر ۱۹۵۴ء میں گرفتاری کے بعد سے ۱۹۵۵ء تک آپ کو جس ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا۔اُن کا ذکر کرنے سے ہر رُوح کانپتی ہے، کہ ظالم کے دل میں نرمی ورحم نام کو بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سزا سنائے جانے سے قبل دورانِ نام نہاد تحقیقات اتنا تشدد کیا گیا کہ آپ کی صحت بُری طرح جواب دے گئی۔ یوں تو پندرہ سال قید بامشقت کی سزا ۱۹۵۵ء میں سنائی گئی تھی، جس کے نتیجہ میں آپ نے ۱۹۷۰ء میں رہا ہونا

Marfat.com

تھا، لیکن آپ کو ۱۹۶۴ء میں رہا کر دیا گیا۔ لیکن دورانِ قید با مشقت بذاتِ خود وہ سزا ہے، جس میں سزا یافتہ شخص بالخصوص معصوم عالم و فاضل اور سکالر ہو۔ اُس پر کیا کچھ بُری نہ بیتی ہوگی۔ لیکن آپ کی زندگی کا یہی وہ دور ہے، کہ جب آپ کی وہ نادر تحریریں رقم ہوئیں، جنہوں نے آپ کو دُنیا کا ایک بڑا نامور مصنف قرار دیا، لیکن اِس میں ناصر کے وہ بعض فوجی افسر بھی ہیں۔ جو آپ سے متاثر تھے اور اُنہوں نے آپ کو اجازت دی کہ آپ اپنی تحریریں جاری رکھ سکتے ہیں۔ جو اِس لحاظ سے حیران کُن امر ہے کہ نیک نیت لوگوں کی کہیں کمی نہیں۔ جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی تحریروں پر نظر رکھنے کے لیے ایک "سپیشل سنسر شپ کمیٹی" بھی قائم کی گئی تھی، کہ آپ کی تحریریں ایک حد سے زائد نہ ہوں (نوٹ: یہ دُنیا کی تاریخ میں فرعونیت کی بدترین مثال ہے، بلکہ اِس کی دیگر کوئی مثال نہیں)۔ لیکن یہ تمام پابندیاں اور مظالم آپ کے اُس کام میں ذرا بھی کوئی رُکاوٹ نہ بن سکے، جس کی اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں بخشی تھیں۔ بلکہ جس قسم کی ریاست کا قیام وجود میں لانا اور عوام کو اُن سے آگاہ کرنا مقصود تھا، اُسے بھی تحریر لائے بغیر نہ رہے۔ یہی وہ دور ہے، کہ آپ کے ذہن میں "اِسلام اور صحیح معنوں میں ایک مومن کا کردار تھا، اُس میں عملاً کیا کردار ہو۔ جو آپ کی آخری تصنیف" معلم فی الطریق "اشاراتِ راہ" Signposts of the Road ہے جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ کتاب ہے، جس کی اشاعت کی اجازت مصری حکومت نے دی اور اِس کے پانچ ایڈیشن صرف ایک سال میں شائع ہوئے، جس پر ناصر کی حکومت بعد ازاں اتنی بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی، کہ اگلے سال نہ صرف اُس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ بلکہ آپ پر یہ الزام عائد کر کے مقدمہ کھڑا کر دیا کہ "یہ حکومت کے خلاف بغاوت کی کھلی سازش ہے۔"

دراصل یہ کتاب آپ کی قرآنِ کریم کی مشہور تفسیر "فی ظلال القرآن" کے بیشتر حوالہ جات پر مشتمل ہے جو آپ نے اپنی دورانِ قید ۶۵-۱۹۵۲ مکمل کی اور یہ تفسیر مکمل کرنے میں دیگر مفسرین کا طریقۂ کار اپنایا ہے، جن سے آپ خصوصی طور پر متاثر ہیں۔ جن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی، عباس العقاد، عبدالقادر عودہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ اِس کے اجزا باقاعدگی سے دس سال اقساط میں رسائل میں شائع ہوتے رہے، جب

Marfat.com

تک آپ قید میں رہے۔

اِس تفسیر میں آپ نے خصوصاً اِس امر کا جائزہ لیا ہے، کہ اِسلام کا اصل پیغام جو قرآنِ کریم میں ہے، وہ تمام نقطہ نظر جو آپ کے ذہن میں ہے، کیونکر اُس کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ جبکہ یہ وہ ایمان ہے، جو نہ صرف اُس طریقہ کو بدل دے گا۔ جس میں ایک فرد دنیا کے بارے میں سوچتا ہے، بلکہ اُس کے ساتھ اُسے ایک ایسے کردار کا پروگرام مہیا کرنے والا ہے، جو اخلاقی ضرورت کے ساتھ سیاسی عمل کی دعوت بھی دیتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر سید قطب یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ قرآنِ کریم نے نسلِ انسانی کو اُن ذرائع سے نوازا ہے، کہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد پوری طرح معلوم کر کے اُس کے مطابق اپنی زندگی ڈھال سکے، جو پیغمبر اسلام کو مطلوب ہے اور آپ کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ کو۔ چنانچہ آپ کی تفسیر میں نسلِ انسانی پر زیادہ زور اِس امر پر ہے، کہ اُس کی رسائی وجدانی طور پر بلاواسطہ ایمانِ کامل تک اِس انداز سے ہو، جس میں کسی فلسفہ کا ذرا بھی سہارا نہ ہو۔ پھر اِس کے ساتھ آپ یہ بھی ضروری خیال کرتے ہیں، کہ ایمانِ کامل کا یہ علم عملاً نہ صرف فردِ واحد کی زندگی میں عیاں ہو، بلکہ سماجی اور سیاسی نظام کا حصہ ہو۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا، کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ''دوبارہ وہ دور لوٹ آئے، جب قرآنِ کریم نازل ہوا تھا۔'' آپ کی اِس فکر کو اِن معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے، کہ آپ ایسے اِسلامی بھائی چارہ کے قیام کے داعی تھے، جس کی مثال پیغمبر اسلام کے دور میں آپؐ کے اصحابِ مکہ تھے اور بعد ازاں اُنہوں نے مدینہ جا کر اِسلامی ریاست قائم کی۔ اِس عمل نے دینِ اسلام کے مطابق ''اقتدار فی الارض'' کی راہ ہموار کی، اور پیغمبر اسلام کی قیادت میں ایک مثالی معاشرہ قائم ہوا، اور بعد ازاں آپ کے خلفائے راشدینؓ نے۔

ظاہر ہے کہ جس معاشرہ اور حکومتی ڈھانچہ میں آپ رہ رہے تھے، اُس میں وہ مطلوبہ تبدیلی جو آپ کے پیشِ نظر تھی، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور نہ ہے۔ سید قطب کو اُسی طرح بڑے پیمانے پر یہ کام کرنا تھا، جو پیغمبر اسلامؐ نے اپنے دور کی ''جاہلیت'' کے مقابلہ میں کیا۔ یعنی اپنے اردگرد عرب معاشرہ کے خلاف مقابلہ، جس نے پیغامِ حق سُن کر بھی بدستور ''جاہلیت'' کی راہ پر چلنے سے دریغ نہ کیا اور آپ کو حق نافذ کرنے کے لیے سخت جدوجہد سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ

Marfat.com

بیسویں صدی عیسوی کا دور بھی ہر لحاظ سے "دورِ جاہلیت" ہی ہے۔ لہٰذا ہر صاحب ایمان مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے، کہ اِس جاہلیت کو مٹا دینے کے لیے پوری جدو جہد کرے۔ جو پُر امن عالمی برادری ہو۔ زیادہ الفاظ میں اسلام، جس کا کُرہ ارض پر کامل اقتدار ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اُس کا صحیح مقام دیا جائے، کہ صرف اُس کی ذات ہی کائنات کی حاکمِ اعلیٰ ہے، اور اُس کا عطا کردہ قانون، قانونِ شریعت ہی دُنیا کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ سید قطب یہ چاہتے تھے، کہ اُن تمام قوانین کو ختم ہونا چاہیے جو "انسان بناتا ہے" اور Man Made ہیں اور اُن سیاسی نظاموں کو بھی ختم ہونا چاہیے، جو یہ قوانین انسان پر مسلط کرتے ہیں۔

اپنے ہم عصر دور کی "جاہلیت" اور "جاہلانہ نظریات" کو سمجھنے اور خدائے واحد کی حاکمیت کو نافذ کرنے کے لیے جدو جہد (بہ الفاظِ دیگر جہاد) کرنے کے نتیجہ میں معاشرہ میں نفاذِ شریعت کو اُس کا صحیح مقام دلانے کے بارے میں شک وشبہ کی کم گنجائش ہے کہ آپ سید مودودیؒ اور ابوالحسن علی ندویؒ سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ نہ صرف متاثر بلکہ بیشتر موقعوں پر آپ نے برملا اِس کا اظہار کیا ہے، اور صدی کے پانچویں عشرے میں اُن کے علمی کام شائع بھی کیے۔ جن کی مصر میں شدید ضرورت تھی۔ لیکن جب آپ قید میں تھے اور موت کی شکل میں جو قیامت آپ پر ٹوٹنے والی تھی، حکمران بڑی کوشش میں تھے کہ اپنی شرائط پر مفاہمت کی کوئی راہ نکالیں۔ لیکن جہاں تک آپ کی ذات کا اور "اخوان" کے دیگر افراد کا تعلق تھا اور اُن پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ جس کی مجرم ناصر کی ذات اور اُس کی نام نہاد "نیشنلسٹ پارٹی" تھی، اور اِس کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کے دعویدار تھے، اِن کے بارے میں سید قطب کا ایک ہی جواب تھا، کہ نہ یہ حکمران اور نہ اِن کے حامی کسی طور بھی مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں۔ بلکہ یہ تو اُسی "جاہلیت" کی مثال ہیں، جو اِسلام کے دورِ آغاز میں تھی اور یہی اِسلام کا پیغام ہے کہ اِن کی طاقت کو منتشر کر دیا جائے۔

جب آپ جیل میں محبوس تھے، آپ کا "صحیح اسلام اور جاہلیت کے درمیان واضح تمیز کرنے کا عزم" جو آپ کی دیگر تحریروں میں بھی سامنے آتا ہے' نے آپ کی شخصیت کو اُجاگر کر دیا۔

Marfat.com

بالخصوص اِس وجہ سے آپ کا یہ یقین کہ حق کی جو منزل آپ نے پائی ہے اور آپ کے دیگر ساتھیوں نے بھی اور اِس کے مقابلہ میں ''جاہلیت'' ہی ہے، جس نے دیگر لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ ایسے میں آپ کے لیئے یہ فرض ہے کہ جاہلیت کے شکار اِن گمراہ لوگوں کو متنبہ کریں، کہ ہر وہ چیز جو دیکھنے میں خوبصورت ہے وہ فی الحقیقت خوبصورت بھی ہے؟ اِس کا اشارہ کون لوگ تھے؟ جبکہ آپ قید میں تھے؟ مصری حکومت، جیل کا عملہ، تمام مصری معاشرہ، معاشرہ کی اکثریت جو کہنے کو مسلمان ہے، لیکن فی الحقیقت کچھ اور۔

جیل کی تنہائیوں میں سے گزر کر آپ کی یہ تحریریں باہر آنا آپ کی طرف سے اِس امر کا اظہار تھا، کہ باہر کی دُنیا بھی ''حق و باطل میں تمیز کر سکے''۔ ایک سطح پر آپ نے اِس امر کا اظہار اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں کیا، جس میں مخاطب آپ کی اپنی ذات ہے، پھر دوسرے لوگ جو قرآنِ کریم کو کلامِ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی ایسی ''جاہلیت'' کی گمراہی سے نکل کر اپنی زندگیاں قرآنِ کریم کے احکامات کے مطابق ہر طرح اُس کا مقابلہ کریں۔

تسلسل کے ساتھ اِس پس منظر میں آپ نے بڑے عزم کے ساتھ اپنا تحریری کام جاری رکھا۔ جس میں سب سے زیادہ زور اِس امر پر دیا گیا، کہ صرف اسلام ہی واحد برتر نظام ہے۔ جو دیگر ادیان اور ''انسان ساختہ'' نظاموں اور قوانین کے مقابلہ میں ''انسانی ضروریات'' پوری کرتا ہے۔ جن میں آپ نے بار بار اپنے مؤقف اور فکر کو زیادہ سے زیادہ زور کے ساتھ دُہرایا، جو آپ کی اِن تحریروں سے ظاہر ہے۔ جو یہ ہیں۔

۱) هذ الدين — This Religian — ۱۹۵۵ء

۲) المستقبل لهذالدين

The Future belongs to this Religion ۱۹۵۶ء

۳) خصائص التصور الاسلام والمقرية

The Characterstics and Vision of Islam ۱۹۶۰ء

۴) الاسلام والمشكلات السدارة

Marfat.com

Islam and Problems of Civilization ۱۹۶۰ء

سید قطب کی یہ مطبوعات ایسی ہیں، جو قدرے معذرت خواہانہ انداز کے ساتھ فطری دلائل کا مرکب ہیں۔ اِس لحاظ سے آپ نہ صرف اِسلام کی فطری منکسر المزاجی اور باہمی اخوت کو بنیاد بناتے ہیں، بلکہ اِس کی ”حیاتِ انسانی کے نظریہ“ تک رسائی تجویز فرماتے ہیں اور دوسرے نظریات اور ادیان کے مقابلے میں اِسلام کی برتری ثابت کرنے میں بڑا محتاط انداز اختیار کرتے ہیں۔ البتہ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ آپ جب صرف اِسلام کو بحیثیت دین اور اخلاقیات کو واحد دین قرار دیتے ہیں، تو اُسے سرتاپا کلامِ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ بار بار اپنی اِس بات کو دُہراتے ہیں۔ تو اِس سے آپکی یہ مُراد ہوتی ہے کہ انسانی بیماریوں کا واحد علاج ”نسخہ اِسلام“ کا استعمال ہے۔ بالخصوص اِس وجہ سے کہ یہ انسانی فطرت کی مناسبت سے ودیعت شدہ ہے۔

یہ اِس وجہ سے بھی ممکن ہے کہ اپنے مستقل عزم کے ساتھ قارئین پر یہ زور دینا ہے کہ اِسلام ایک ایمان ہے، جس کا تعلق صرف رُوح سے ہے۔ اور کرۂ ارض پر آباد انسانی زندگی کے نظامِ حیات سے ہے۔ سید قطب کے نقطہ نظر سے یہ اسلام کی عملی فطرت ہے جسے فراموش کر دیا گیا ہے اور اب یہ اُمتِ مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ دُنیا کو برائے سماجی بقا اِسے بنیاد بنائے اور اِسے نمونہ ہدایت بنائے۔ چنانچہ جب آپ اِس کا دیگر نظاموں سے مقابلہ کرتے ہیں، تو اُن کو زوال پذیر، ناقابلِ اعتماد، بالآخر اُن کو منافقت کا شکار قرار دیتے ہیں، جو انسانوں نے اپنے طور تراشے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کی بجائے نرے ”جاہلانہ“ ہیں۔ چنانچہ اِن سب کو رسمی طور پر حق کے مقابلہ میں نہ صرف ایک معمولی رکاوٹ قرار دیتے ہیں، بلکہ عملی طور پر بھی اِسلام کے مقابلہ میں ایک بڑی رکاوٹ۔ لہٰذا جو لوگ صدق دل سے صاحبِ ایمان ہیں، اُن پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے اردگرد معاشرہ میں اِسلام کا قلعہ بنائیں۔ اُن کے لیے ایسی جدوجہد لازمی ہے، جو اِسلام کے پیغام کو صرف رسمی طور پر اُس کے تقاضوں کو نہ سمجھیں، بلکہ اُس کے احکامات کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں نافذ کرنے کے لیے کام کریں۔ چنانچہ اِس راہ میں کتنی بھی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں، اور ”جاہلی“ قوتوں کا کتنا بھی غلبہ اور اثر کیوں نہ ہو، اُمتِ مسلمہ کا فرض ہے کہ دُنیا پر اللہ تعالیٰ کے وہ احکامات نافذ

Marfat.com

کرنے کیلئے کام کریں، جو قرآنِ کریم میں نازل ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ قوانین ہیں، جو انسانی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں، اور اُن کی تابعداری لازم ہے۔ یہ وہ ضابطہ حیاتِ انسانی ہے، جسے آپ نے اپنی آخری تصنیف ''معالم فی الطریق'' میں بڑے پُرزور انداز میں بیان کیا ہے۔

اِس کتاب کو ''اخوان المسلمون'' کی گرتی ساکھ کو بحال کرنے کی کوشش قرار دی جانی چاہیے، جبکہ صدی کے چھٹے عشرے سے ''اخوان'' کے بیشتر رہنما قید میں تھے۔ یہ وہ دور ہے، جب ناصر بطور ایک فردِ واحد اقتدار میں ہے۔ جس کو سیکوریٹی کی تمام تحفظاتی سہولتیں حاصل ہیں، بلکہ ملک میں ''ناصر اِزم'' کی بُت پرستی نے بھی دین سے دُور عوام کے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ اِس ''ازم'' کا مُرکب نیشنلزم، سوشلزم اور ''عدم وابستگی'' تھی، کہ یہ مثالی مصر ہے، جو مطلوب ہے۔ جبکہ اِسلام، یہ تو الازہر کا ایک تخیل ہے اور اُس کی حدود بھی وہیں تک ہیں۔ ''ناصر ازم'' کے اِس فلسفہ میں نہ صرف مصر کے بڑے سکالر تھے، بلکہ ''اخوان'' کے بعض ارکان بھی شامل ہو گئے، جن کو اعلیٰ ملازمتی عہدوں پر متمکن کر دیا گیا۔ اِس کے باوجود یہ کوئی حیران کن بات نہیں، کہ سید قطبؒ کا ''پیغامِ اُمید'' اور جدوجہد جاری رکھنے کی دعوت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ ایسے میں جب ''اخوان'' پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، اور سید قطب جیل میں تھے، جیل سے باہر بعض اصحاب نے دِل نہیں چھوڑا اور اُنہوں نے تحریک کے کارکنوں کو خاموشی سے منظم کیا، اور ۶۲۔۱۹۵۹ء کے عرصہ میں ''سٹڈی گروپس'' Study groups قائم ہوئے۔ جو دین کے اصولوں کی بات کرتے تھے اور اِس میں سید قطب کی کتاب ''معالم فی الطریق'' ''اشاراتِ راہ'' Signposts of Road اِن گروپس میں حوصلہ افزائی کا موجب تھی اور ''ناصر اِزم'' کے نام سے مصری قوم بڑی مایوسی میں تھی۔ البتہ حوصلہ کن اور اُمید افزا امر یہ تھا، کہ عوام ناصر ازم سے ''راہِ نجات'' کے حامی تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ مصر میں صحیح اِسلامی برادری وجود میں آئے۔

ایسے میں مئی ۱۹۶۴ء میں آپ کو قید سے رہا کر دیا گیا، ویسے تو آپ کی بیماری کو وجہ قرار دیا گیا، لیکن بڑی وجہ عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی بطور صدر مصر آمد تھی، جنہوں نے ناصر پر آپ کی رہائی کے لیے زور دیا۔ رہائی کے بارے میں جو بھی وجوہات ہوں، آپ کو ایک بار

Marfat.com

پھر ''اخوان المسلمون'' کے رہنماؤں، کارکنوں اور ہمدردوں سے روابط قائم کرنے کا موقعہ مل گیا۔

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے کہ سرکاری طور پر ''اخوان المسلمون'' پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، لیکن مختلف افراد نے اپنے طور ''سٹڈی گروپس'' قائم کر لیے تھے، اِن میں سے ایک گروپ جس کا لیڈر عبدالفتح اسماعیل تھا۔ اُس نے آپ سے گزارش کی، کہ وہ آپ کی تحریروں سے متاثر تھا، کہ آپ گروپ کی لیڈرشپ قبول کر لیں، جو آپ نے قبول کر لی۔

اب ایک بار پھر ناصر کا ''اخوان'' کے خلاف غضب اُبھرا اور ۱۹۶۵ء کے موسمِ گرما میں ''اخوان'' کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ جبکہ اگست ۱۹۶۵ء میں خود آپ اور آپ سے وابستہ گروپ کے کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ پھر اسی سال، اگلے ماہ ستمبر میں سماعت کے لیے فوجداری مقدمات تیار کر لیے گئے، اُنکے خلاف ایک بڑا مقدمہ یہ تیار کیا گیا کہ ''اخوان المسلمون'' کے شعبہ ''خفیہ کارخانہ Secret Apparatus'' نے بڑے پیمانے پر ایک سازش تیار کی ہے، جس کا مقصد صدر ناصر کے قتل کے بعد عام بحران پیدا کر کے ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا ہے۔

یہ مقدمہ ملک کے ''وکیل استغاثہ'' نے تیار کیا۔ جس میں زیادہ تر حوالہ جات کیلئے آپ کی تصنیف ''معالم فی الطریق'' کا سہارا لیا گیا، اور مقدمہ کی سماعت کے لیے خصوصی فوجی عدالت قائم کی گئی، جس نے ۱۲/اپریل ۱۹۶۶ء سے مقدمہ کی سماعت شروع کی۔ الزامات ثابت کرنے کے لیے زیادہ سہارا آپ کی تحریروں کے علاوہ کچھ ''دوسروں'' کے اعتراضات کا سہارا لیا گیا، کہ آپ طاقت کے ذریعہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ بالآخر ۲۱/اگست ۱۹۶۶ء کو فوجی عدالت نے آپ کی ذات کے علاوہ ''اخوان'' کے ایک رہنما عبدالفتح اسماعیل اور آپ کے دوسرے سابق جیل کے ساتھی محمد یوسف حواش کو مجرم قرار دے کر سزائے موت کی سزا سنا دی اور صرف پانچ روز بعد ۲۶/اگست ۱۹۶۶ء کے روز تینوں اصحاب کو تختۂ دار پر لٹکا کر موت سے ہمکنار کر دیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

تصانیف:

''العدالیة الاجتماعیة فی الاسلام تا معالم فی الطریق''

Marfat.com

اِن واقعات کی روشنی میں یہ مطالعہ کرنا زیادہ ضروری مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید قطب کے سیاسی نظریات کے علاوہ آپ کے دیگر نظریات جو آپ کی سیاسی فکر کا مظہر ہیں، کا جائزہ لیا جائے۔ البتہ یہ امر بالکل واضح ہے، کہ آپ نے ابتدا ہی میں اپنی سماجی اور سیاسی تحریروں کے پس منظر میں معاشرے کی بیماریوں کی تشخیص کر کے اُن کا علاج بھی تجویز کر دیا تھا۔ جن میں آپ نے یہ بالکل واضح کر دیا تھا، کہ ہمارے معاشرے پر مغربی قوتوں کے تسلط نے ہمارے معاشرے کی اندرونی خوبیوں کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ آپ نے اِسلام کی خوبیوں کو نہ صرف بذریعہ جدید نظریات بلکہ متعدد وسائل مغرب کے خوشہ چین مسلم نام نہاد لیڈروں کے لیے چیلنج بنادیا ہے، اور اُن کے لیے سید قطب شہید کی شخصیت غیر مطمئن شخصیت تھی۔ جن کے ذہن مغرب کی محض ترقی پسندانہ اصطلاحات سے پُر تھے۔ اس پہلو سے اگر چہ سیّد قطب شہید مغرب کی مادی ترقی کے قائل تھے۔ لیکن اِس مادی ترقی کے قائل ہونے کے باوجود آپ کو یہ ترقی انسانیت کے لیے بہ حیثیت مجموعی ایک نقصان قرار دیتی تھی، وہ اِس کا بے رُوح، بے بنیاد اور کھوکھلا پن تھا۔ جبکہ سید قطب کے نزدیک ایک معاشرہ، جس کی بنیاد اور رہنمائی اخلاقیات کی تابع ہوں۔ انسان کو اُس کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ اِسی کی تلاش میں سرگرداں تھے، کہ کوئی اِس خلا کو پُر کرے۔ ایک گم کردہ باہمی ہم آہنگی اور ایمان کی تازگی کے اجارا کرنے ہی میں بقائے انسانی ممکن ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں اور صرف اسلام میں ودیعت کی ہیں۔ ان خوبیوں کی ذاتی دریافت کے بعد آپ نے اپنی زندگی ہمیشہ کے لیے وقف کر دی، کہ اپنی تمام صلاحیتیں اور تمام توانائیاں معلوم کر کے اُن کو بروئے کار لایا جائے، جو معاشرہ کو امن اور باہمی وابستگی عطا کر سکے۔ ایسا کرتے وقت آپ نے ماضی کے بزرگوں کی مشکلات اور مصائب کو مدِ نظر رکھا، جن کا اُن بزرگوں کو پالا پڑا تھا۔

"العدالية الاجتماعية فی الاسلام" (شائع شدہ ۱۹۴۹ء) میں آپ نے دیگر لبرل قسم کے مصنفین سے استفادہ کیا ہے، جو مسلم معاشرہ کے بارے میں پریشانی کے ساتھ اُس کو زوال سے نکالنے کے آرزومند ہیں۔ لیکن بعد ازاں آپ نے اپنی تحریروں میں جو انداز اختیار کیا

Marfat.com

ہے، وہ عین بے باکانہ ہے، جن میں اِسلام ہی کو واحد علاج قرار دے کر دیگر تمام نظاموں کی نفی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ جب آپ نے اپنی آخری کتاب "معالم فی الطریق" ۶۲-۱۹۵۹ء، جس کو بنیاد بنا کر ناصر کی حکومت نے بڑے پیمانے پر اپنے قتل اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش قرار دے کر سزائے موت سے ہم کنار کیا۔ اِس میں فردِ واحد کی خدمت سے ہٹ کر تمام مسلم معاشرہ مخاطب تھا کہ وہ اجتماعی طور پر بُرائی ختم کرنے کے لیے باہر نکلے۔ اِس سے آپ کے سامنے دو مقاصد تھے۔ (**نوٹ:**...... جنہیں صوفیانہ انداز قرار دیا جاسکتا ہے)۔

اولاً سیاست ماسوائے اِس کے کسی دیگر نام کی چیز نہیں، دُنیا میں لوگ ایک دوسرے کے غم میں خوشنودی الٰہی کی خاطر شریک ہوں۔

ثانیاً سیاست کا مقصد ایسے ابدی حق کی تلاش ہے، جس میں وہ وجدانی علم مضمر ہو، جس میں باہمی محبت اور ہم آہنگی کیساتھ انسانیت کی وہ تشکیل نو ہو، جسکی صدا دُنیا بھر میں گونجتی سنی جائے۔

اِس کے نتیجہ میں ایک ایسا مستحکم عالمی معاشرہ قائم ہوگا، جس میں فردِ واحد کی دل پسند سیاست کے مظاہر بحال ہوتے نظر آئیں گے، اور زیادہ سے زیادہ ذاتی مفاد کے حصول کی خواہشات ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ آپ کی یہ فکر اِس لحاظ سے اُن لوگوں کے لیے حیران کن نہیں قرار دی جاسکتی، جو اپنے اپنے معاشروں کی بُرائیوں سے دُور تھے۔ لیکن یہ فکر اُن لوگوں کے مفادات سے متصادم تھی، جو نام نہاد معمولی اصلاحات کا سہارا لے کر اپنی لیڈری کی دکان چمکا کر لوگوں پر مسلط رہنا چاہتے ہیں۔ کہنے کی اصل بات یہ ہے، کہ وہ معاشرہ جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور احکامات کی تعمیل پر رکھی جائے، وہ کتنی سادہ، حسین اور پاکیزہ ہے، خواہ اُس میں ایک فرد کی اصلاحِ نو ہو۔

سید قطب کی سیاسی تحریروں میں دو باتوں پر زیادہ زور ہے۔

اولاً: سیاست کی بنیادیں، جن کا مفہوم اِسلامی معاشرے کی فطرت اور اُس کا فرد سے تعلق۔

ثانیاً: اُن بنیادوں کے حصول کے لیے ذرائع کا استعمال جن میں طاقت اور اختیار کے سوال کے جواب میں مضمر ہے۔

Marfat.com

یہ دونوں باتیں سید قطب کی تحریروں میں سلی ہوئی ہیں۔ جنھیں آپ نے موقع بہ موقع مختلف انداز میں اختیار کیا ہے۔ ابتداً آپ مغربی لبرل ازم سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کسی قدر سوشلزم سے بھی یا دیگر ایسے ہی مسلم ریفارمرز بھی، جو مغربی لبرل ازم اور سوشلزم سے متاثر ہیں۔ لیکن بعدازاں آپ نے اِن تاثرات کی نفی کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور ایسا کرتے ہوئے میدانِ سیاست میں خالصتاً اسلامی فکر نمایاں کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ نہ صرف الفاظ سے بالکل عملاً بھی۔ ایسے میں اِسلام اور غیر اسلامی سیاست کا تصادم ناگزیر ہے۔ البتہ آپ کی اِس معصوم فکر میں درپردہ جو چیز کام کرتی نظر آتی ہے، اُس میں صوفیانہ حل کی آمیزش ہے۔ جبکہ مادی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا، کہ عملی سیاست میں یہ فکر دُور از کار نظر آتی ہے۔

جہاں تک سیاست کے مقاصد کا سوال ہے۔ ''اِسلام میں سماجی انصاف'' بے مثال پاکیزہ معاشرہ کا نام ہے، جس کا قیام مناسب سیاسی جدوجہد کے ذریعہ ممکن بنایا جائے۔ ایسا نمائندہ معاشرہ اور جو افراد اِس کا قیام عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ سید قطب اِس بارے میں دو مختلف بنیادیں تجویز کرتے ہیں۔ ایک میں قدرے افلاطونی فلسفہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جس میں وحدانیت اور انسان کی بحیثیت اللہ کی تخلیق ''کامل انسان'' ہونا ہے۔ جب انسان کو جنت سے اُتار کر زمین پر لایا گیا کہ وہ زمین پر اُتر کر دوبارہ جنت میں جانے کے لیے وہ پاکیزہ اعمال کرے، جو اُسے دوبارہ جنت میں جانے کا مستحق بنا دیں۔ لہٰذا اِس لحاظ سے سیاست معاشرے کی ہم آہنگی کا حصول ہے۔ جس میں اپنی دُنیاوی قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی خدمت میں مامور کر دیا جائے۔ اغلباً اسے ایک مستحکم معاشرہ کا موضوع تو قرار دیا جا سکتا ہے، جبکہ سیاست معاشرے کو قائم و دائم رکھنے کا نام ہے، جس کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان اپنی زندگی رضائے الٰہی کے مطابق گزارے، اور اُس کا سیاسی عمل بھی ایسا ہو، جس کی اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے۔ اِس یقین کے ساتھ کہ اِس کے خلاف اُس کا معمولی عمل کہیں ایسی خرابی کا باعث نہ ہو۔ جو معاشرے کی ہم آہنگی اور محبت کو ہلا دے۔

اِس کتاب میں ایک اور فکر نمایاں ہے۔ جو اپنے ہم عصر لبرل فکر کے دانشوروں کی

Marfat.com

مرہون نظر آتی ہے۔ وہ دانشور جو معاشرے میں "حقوق انسانی" کے علم بردار ہونے کے دعویدار ہیں۔ ایک اِسلامی ریاست کے حکمران اور اُس کے اختیارات کی حدود کے موضوع پر جب اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں، تو آپ یہ بھی کہتے ہیں، کہ یہ مسئلہ غیر اسلامی ریاست کے حکمران کے سامنے بھی ہے۔ لیکن اِس بارے میں آپ کا زیادہ اصرار اِسی امر پر ہے، کہ اِسلامی سیاسی نظام ہی ایک کامل نظام ہے۔ قبل ازیں آپ کی مخاطب فرد کی ذات تھی کہ وہ معاشرے کے سامنے جوابدہ ہے، اب آپ مخاطب ریاست کا حکمران ہے کہ وہ اور اُس کا اقتدار معاشرے کے سامنے جوابدہ ہے۔ لیکن اِس بارے میں آپ کا اِس امر پر زور ہے کہ "اگر کوئی حکمران معاشرے کی رائے سے اقتدار حاصل کر لے، تو اُسے پورے اختیارات حاصل ہیں، لیکن یہ اختیارات اور اُن کا استعمال قوانینِ الٰہی کے تابع اور اُن سے ہی اخذ کردہ ہونا لازمی ہیں۔ لیکن اگر وہ اِس میں ناکام ہو جائے، اور مسلم معاشرہ اُس کی حکومت سے غیر مطمئن ہو، تو اُسے اقتدار سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ جو تمام مسلم معاشرے کے ذریعہ ممکن العمل ہو گی۔ جو غیر مطمئن ہے۔ آپ کی رائے میں مسلم معاشرہ ایک "جسدِ واحد" کی مانند ہے۔ جبکہ جسم کا کوئی حصہ دوسرے حصہ سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ لیکن حکمران کے کیا اختیارات ہیں اور کیا اُن کی حدود ہیں۔ حکمران لامحدود اختیارات کی ضرورت کا خواہش مند ہے اور قوانینِ الٰہی اُس کو ایک حد کا پابند رکھتے ہیں۔ آپ ایک درمیانی راہ تجویز کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف آپ کی رائے یہ ہے کہ اگر "حکمران قوانینِ الٰہی کی پابندی کرتا ہے، اور احکامِ دین کی بجا آوری کا یقین دلاتا ہے، جہاں تک اُس کے لیے ممکن ہے، بہ الفاظِ دیگر اِس کا یہ مطلب ہو گا، کہ عوام پر اُس کے اختیارات کی یہ انتہا ہے، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اپنی طاقت سے اُن کی حفاظت فرمائے گا۔ اِس سے ایک قدم اور آگے آپ کا دعویٰ ہے، کہ معاشرے کی خیر و بہبود کے لیے جو متعلقہ امور ہیں، ضروری ہے کہ حکمران کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیارات ہوں۔ اپنی جگہ پر یہ بات صحیح ہے کہ حکمران کے پاس ایسے اختیارات کا ہونا ضروری ہے، کہ وہ جو اقدامات کر رہا ہے، اُن کے بارے میں اُسے یہ یقین ہے، کہ دین کے عام تقاضے حاصل کرنے کے ساتھ عام فرد، معاشرہ اور تمام انسانیت کی بہبود کا حصول بھی اِن

Marfat.com

اقدامات میں ہے۔ اب جیسا کہ فرد اور معاشرہ کے درمیان تعلق کا معاملہ ہے۔ اِس بارے میں اِن دونوں اور حکمران کا عوام کے ساتھ تعلقات کے بارے میں آپ کی کئی آرا ہیں۔ اُس وقت آپ اپنی کتاب ''اشاراتِ راہ'' Signposts on the Road تحریر میں لا رہے تھے۔ جب یہ کتاب آپ تحریر میں لانے لگے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ اِن تضادات کو دُور کرنے میں اپنے خصوصی انداز کے مطابق کامیاب ہو گئے تھے۔ اوّلین طور پر ''قدرتی نظام اور سیاسی نظام'' کے درمیان تشخص واضح ہو گیا تھا۔ یعنی قانونِ قدرت جس کی حیاتِ انسانی اور حیاتِ کائنات دونوں پر حکمرانی ہے، دونوں میں باہمی ہم آہنگی کی خاطر ضروری ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے تابع ہوں۔ اِس لحاظ سے سیاست کا مقصد باہمی محبت اور ہم آہنگی کی تخلیق اور فساد و انتشار کو دُور کرنا ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ اسلام ہی ہے، جو راہِ حق کی لیڈر شپ کے ذریعہ تمام انسانیت کو خیر و بہبود فراہم کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ وہ خیر جو انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور تمام انسانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ باہمی یگانگت کے ذریعہ اور صرف خدائے واحد کی مکمل تابعداری کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، پھر جب زندگی کا مقصد تمام انسانوں کی بھلائی ہو، ایسے میں اپنی ذات اور ترجیحات از خود ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ ''لوگوں کی جو دِلی خواہشات، عادات، جاہلی رسم و رواج اور غلط تنظیمیں ہیں، اسلام اُن کو معاف کرنے کے لیے نہیں آیا۔'' آپ کی یہ فکر جو ابتدائی طور پر کارفرما ہے، اُس کی بنیاد رضا کارانہ، لبرل اور سوشل بہبود ہے آپ کے اِن واضح الفاظ سے ظاہر ہے ''اگر یہ سوال کیا جائے، کہ افراد کے مفادات اپنی عملی شکار نہ اختیار کریں؟'' تو دوبارہ اگر ہم اپنے سوال پر غور کریں تو جواب ''دِلی طور پر اِسلام ہو گا'' پھر سوال یہ ہو گا کہ ''کیا تم جانتے ہو یا خدا جانتا ہے؟''

تو جواب ہو گا ''خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے!''

کیونکہ فرد کا مفاد قانونِ خداوندی میں شامل ہے اور اُس کا اُس کے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا۔

اِس لحاظ سے جب لوگ یہ خیال کرنے لگیں، کہ اُن کی خیر و بہبود اُس سے مختلف ہے،

Marfat.com

جس کی خداوندِ کریم نے توضیح فرمائی ہے، تو اِس کے نتیجہ میں اولاً خود فریبی کا شکار ہیں اور ثانیاً ''کافر'' Non-believers ایسے میں یہ واضح ہے، کہ نظامِ الٰہی اور قانونِ خداوندی کو لوگوں کے اُن دعاوی اور خواہشات پر برتری حاصل ہے جن کے وہ خواہش مند ہیں۔ کیونکہ اِس سوچ کا سب سے اہم اور ضروری تقاضہ یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی اللہ تعالیٰ کے اُن قوانین وضوابط پر کار فرما ہو، جو اُس نے تمام کائنات کے لیے بنائے ہیں تو اگر نسلِ انسانی اِس پر عمل پیرا ہوتی ہے، تو یہ ہر فرد کا باہمی آہنگی کی خاطر فرض ہے، جو وہ قطعہ ارض پر اپنی حیثیت میں ادا کر رہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر سید قطب نے اپنے طور پر یہ کوشش کی ہے کہ فرد کا فرد سے اپنے اپنے مفادات کی خاطر جو ٹکراؤ ہے، باہمی ہم آہنگی کی خاطر اِسے کیونکر حل کیا جا سکتا ہے۔

آپ کی اِس فکر کو اگر صحیح معنی پہنائے جائیں تو اِس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ ایسا معاشرہ قیام میں لانا چاہتے ہیں، جس میں کسی حکمران کی ضرورت نہیں۔ جب کوئی حکمران ہی نہ ہوگا، تو اُس کے اختیارات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یا جیسا کہ آپ نے ''اشاراتِ راہ'' میں بار بار اِس امر پر زور دیا ہے، کہ وہ ایسا معاشرے کے قیام کے متمنی ہیں، جس میں ایک ہی حکمران ہو اور ایک ہی منصف اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی ذات کس طرح حکومت کرے، اُس کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں، ماسوائے اِس کے اِنسان کی انسان پر حاکمیت جتانے کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ایسا مثالی اسلامی نظام کس شکل میں ہو، اِس بارے میں آپ ذرا کوئی بات نہیں کرتے، ماسوائے اس کے وہ کہتے نظر آتے ہیں، ''جہاں تک میری ذات کا'' تعلق ہے، میں یہ سمجھتا ہوں، کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی حاکمِ اعلیٰ ہے۔'' اِس میں نمایاں بات سیاسی نظام کا معاملہ ہی نہیں، بلکہ وہ کیا طریقے ہیں، جن کے ذریعہ کوئی ملکی نظام چلایا جانا ممکن ہو۔

آپ نے جب یہ کتاب لکھی، غالباً آپ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا تھے، اور جس اِسلامی نظام کے قیام کے آپ متمنی تھے، کہ کیونکر ایسی قوت ممکن بنائی جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ آپ کا یہ یقین تھا، کہ اگر صلح پسندانہ انداز میں اِسلامی نظام کا قیام عمل میں آجائے، تو لوگ بڑی خوشی سے اُسے قبول کریں گے۔ جو مثالی اِسلامی نظام آپ کا خواب تھا، وہ صرف اِس بنیاد پر نہیں تھا، کہ

Marfat.com

اللہ تعالیٰ ایسا چاہتا ہے، بلکہ سماجی خیر و بہبود کی بنیادوں پر بھی، جن کی بنیاد انسانی حقوق اور ضروریات ہیں۔ پھر اِس کے ساتھ آپ ''سدّ الظواہری'' اور ''مصالح مراسلہ'' میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی ترجمانی اور طریقے اختیار کرتے نظر آتے ہیں، اُن میں زیادہ رجحان لبرل ہے۔ تاہم آپ کا سارا زور اِسلامی نظام کی برتری پر ہے۔ اپنی مطبوعات تحریر میں لانے سے آپ کا مقصد دوسروں کو بذریعہ دلائل اور تبلیغ یہ تسلیم کرانا تھا، کہ اِسلام ''وحیِ الٰہی'' ہے، جس میں انسانیت کی فلاح و بقا ہے۔ چنانچہ ''اشاراتِ راہ'' اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے انسانیت کی فلاح و بقا کے لیے کام کرنا ہے، ایسی دعوتِ عمل ہے، جنہوں نے اِس دُنیا میں بڑھ چڑھ کر ''جاہلیت'' کے وسیع میدان میں سے گزر کر کامیابی حاصل کرنا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کتاب اُن افراد کے لیے لکھی گئی ہے، جن کو مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اب وہ باقی دُنیا میں اپنی اپنی صلاحیتوں اور وسائل کے مطابق عملاً کام کریں۔ ایسے میں جن لوگوں کو آپ ہدایت دے رہے ہیں۔ اُس کا دائرہ مزید تنگ کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ ڈائریکٹ عمل معلوم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ''دُنیائے جاہلیت'' کی ماضی کی فضول رسومات کے خلاف جدوجہد پر اُبھارتے ہیں۔ اِس طرح ''زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی قائم کرنے اور انسانوں کی حکمرانی ختم کرنے کا مطلب یہ ہے، کہ طاقت یا حکمرانی غاصب انسانوں سے چھین کر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے کر دی جائے...... بہ الفاظِ دیگر شریعت کی حکومت قائم کر کے انسان کے وضع کردہ قوانین ختم کر دیئے جائیں۔'' آپ کا یہ عام مطالبہ کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کی غلامی کے انسانوں کو ہر طرح کی غلامی سے رہائی دلائی جائے، کوئی فلسفیانہ یا خیالی قسم کی دُنیا کا مطالبہ نہیں تھا، بلکہ ایک مثبت، پُرعزم اور پُرزور مطالبہ تھا۔ اِن کی جگہ آپ ''فلسفیانہ دلائل'' پر لعنت بھیجنے کے ساتھ یہ مطالبہ بڑے پُرزور الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی کُرہ ارض پر بجا آوری اِس انداز میں ہو کہ وہ انسانیت کے لیے قوانین کی شکل اختیار کر لیں۔ المختصر! ''اشاراتِ راہ'' کُرہ ارض کے لیے مکمل نظامِ حیات قائم کرنے، فساد و انتشار کو ختم کر کے باہمی ہم آہنگی قائم کرنے اور دُنیا کو امن کی راہ دکھانے کی کاوش ہے۔

Marfat.com

آپ ''اِسلام اور جاہلیت'' کے درمیان جو واضح فرق ہے، نہ صرف اُس کو بیان کرتے ہیں، بلکہ اِس پر زور دیتے ہیں، کہ دونوں میں جو واضح فرق ہے، اِس امر کی ضرورت نہیں، کہ اِسلام اپنے آپ کو حق ثابت کرنے کے لیے کوئی دلائل پیش کرے کہ ''جاہلیت'' امرِ باطل کا دوسرا نام ہے۔ آپ ''اشاراتِ راہ'' اِن الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں: ''اِسلام اور جاہلیت'' کو ملانے کے لیے کسی پُل کی ضرورت نہیں۔ ماسوائے اِس کے کہ جو لوگ جاہلیت کی راہ پر ہیں، وہ اِسلام کی راہ اختیار کریں۔ جس کے لیے آپ ایک دوسرے کے طریقہ ہائے کار اور اثرات کے ساتھ اِسلام کو جاہلیت سے علیحدہ کرتے ہیں۔ بالآخر اِسلام ''جاہلیت'' اور اِس کے اثرات ختم کر سکے، کہ یہی وہ مثالی باہمی وابستگی اور محبت کا نمونہ ہے۔ جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں، اور جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے، آپ فرماتے ہیں:

> ''لوگوں کی جو دلی خواہشات، عادات، جاہلی رسوم و رواج اور غلط تنظیمیں ہیں۔ اِسلام اُن کو معاف کرنے کے لیے نہیں آیا۔'' بلکہ انسانیت کی بقا خاص بنیادوں پر رہنے کے لیے آیا۔ ''اور صرف ایک مرتبہ کے لیے اور بس۔''

چنانچہ ''جاہلیت'' کے مارے لوگوں کے سامنے اِسلام بڑے سادہ الفاظ میں پُر اثر انداز میں پیش کیا جائے۔ جس میں کچھ ''لین دین'' کا سوال نہیں۔ بلکہ اُن کو یہ سمجھایا جائے:

> ''جس دُنیا میں تم زندگی گزار رہے ہو، وہ نری جاہلانہ اور غلاظت ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ اِسے پاک کرنا چاہتا ہے۔''

''اشاراتِ راہ'' Signposts of Road میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حقانیتِ اسلام پھیلانے کے لیے دلائل اور بحث و تمحیص جو اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں، کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ کہ اچھی زندگی کی جاوداں خوبصورت جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کاملہ نے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو انسانیت کے لیے بطور نمونہ عنایت فرمائی، اُسے دکھانے کے لیے کسی فلسفہ یا دلیل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ صرف ''ایمان'' کا تقاضہ ہے اور کچھ نہیں۔ ایسا ایمان گویا کہ یہ خوبصورتی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے جس کے لیے عملاً اِسلامی

Marfat.com

طرزِ حیات اپنا کر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ کہ کسی فلسفیانہ ذہن (بغیر عمل)۔ اِس لحاظ سے (مضمون نگار چارلس ٹرپ کے مطابق) سید قطب قنوطیت اور انسان کے بارے میں عدم اعتماد کا شکار نظر آتے ہیں۔ (نوٹ: جو صحیح نہیں، کیونکہ مظاہر قدرت انسان کو یہ سوچنے کی دعوت دیتے ہیں، کہ اِس تمام کائنات کی خالق و مالک ایک ایسی ذات ہو سکتی ہے، جس کا کوئی احاطہ کیا جانا یا انسانی نظروں سے دیکھنا ناممکن ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے)۔

سید قطب نے ''جاہلیت'' کی اصطلاح جسے وہ مردود کے معنوں میں لیتے ہیں، صرف غیر مسلم معاشرے اور افراد کے بارے میں استعمال نہیں کی۔ بلکہ اُن نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں جو اُن کے نزدیک فکری لحاظ کے ساتھ عملاً بھی غیر اسلامی زندگی گزارنے کے روادار ہیں۔ ایسے میں اُن کے ساتھ بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کہ اُن کے نزدیک غیر مسلموں کے ساتھ اُس طرح کے مسلمان بھی ''جاہلیت'' کا شکار ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر آپ کی طرف سے اُن کے بارے میں مذمت کرنا کہ ''یہ لوگ اِس لائق ہی نہیں، کہ اُن کے سامنے دلائل پیش کیے جائیں'' ظاہر ہے کہ آپ نے اُن سے اپنے آپ کو بالکل کاٹ کر رکھ دیا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ پیغام دُنیا کو کیسے پہنچایا جائے۔ اب ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ ایسا کوئی فرد یہ پیغام سنجیدگی سے پھیلانا چاہتا ہو، اُسکے پاس بہ مشکل کوئی راہ رہ جاتی ہے۔ بنیادی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ چاہتے ہیں، بالخصوص وہ لوگ جو دل سے مسلمان ہیں، وہ آپ سے متفق ہیں، اور اُن سے اپنی بات کہنے میں کوئی ہرج نہیں، جبکہ دوسرے مسلمان جو سنجیدگی سے خالی ہیں' اِس فکر کا حامل ہونے کے باعث یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ بحث و تمحیص کے بارے میں آپ بڑے محتاط تھے۔

بلاشبہ آپ عمدہ اخلاقیات، سچائی، ''فعال'' فقہ اور سنجیدہ فکر کے مالک اصحاب کے بڑے معترف تھے، اور یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ ایک بڑی تعداد نے آپ کی تحریروں کو برائے عمل انقلابی منشور سمجھ کر مطالعہ کیا۔ جو ملک کے حکمران عملہ اور سیاسی ڈھانچہ پر ڈائریکٹ شدید حملہ تھا۔ اور ''اشاراتِ راہ'' کے صفحات کو اِس ''انقلابی منشور'' کا ترجمان قرار دیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ حکومتِ مصر نے آپ پر جو ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے' وہ کوئی خیالی دُنیا کا

Marfat.com

نقشہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہی ہے، کہ یہ لوگ عملاً ''جاہلیت'' کا نمونہ تھے۔ جن کو آپ نے مصری معاشرہ میں خود دیکھا اور اُن کے ہاتھوں ظلم و تشدد کا شکار ہوئے۔ تاہم ''اشاراتِ راہ'' کے صفحات آپ کے اُس صوفیانہ انداز کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جس طریقہ سے آپ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی طرف آپ اشارہ کرتے ہیں۔

آپ کی تحریروں میں کوئی تضاد نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا ''آئیڈیل'' جنگ سے ''معمور تصوف'' تھا۔ یعنی جس شخص نے پورے صدق دل سے حقیقت سے آگہی حاصل کر لی ہے اور یہ پیغام دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے، کہ اُن کے دل بھی اُسی طرح کھل جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع ہوں۔ سید قطب کے پیشِ نظر ''جاہلیت'' کے اِس مستقل خطرہ کے خاتمہ کے لیے اُن کے ذہن میں جو صوفیانہ طریقہ تھا اور اُس کا مخاطب ضمیر ہے، اُس کے یہ الفاظ ہیں:

''اِس میں کوئی شک نہیں، کہ ''جاہلیت'' کے اقتدار کے متمنّی بے شمار سماجی دباؤ، غلط رسومات اور بدعات میں مبتلا ہیں...... بالخصوص اپنے انداز میں۔ لہٰذا نہ ہمیں ایسے ''جاہلی'' معاشرے متاثر ہونا چاہئے اور نہ اُس سے وفاداری کا مظاہرہ کرنا چاہئے...... بلکہ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو تبدیل کریں۔ تاکہ ہم معاشرہ کو تبدیل کر سکیں۔''

کئی معنوں میں آپ کی تحریروں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے طریقوں کا پورا زور آپ کی تفسیر قرآنِ کریم ''فی ظلال القرآن'' میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ایک مثال کی شکل میں بلکہ ڈائریکٹ حوصلہ افزائی کے ذریعہ جو ''پیدائشی'' مسلمان نہیں، کہ ہمیں ورثہ میں اِسلام ملا ہے بلکہ ہم نے دل و ضمیر کی پوری آواز کے ساتھ ''اِسلام دریافت کیا ہے''۔ اور اُن لوگوں کے لیے جو اِسلام کو ''قرآنِ کریم کی نئی نسل'' سمجھ کر دُنیا میں اِسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔

اس سوچ و فکر کے ساتھ غالباً آپ نے محسوس کیا ہو، کہ آپ نے درپیش مسائل اور متصادم افکار حل کر لیے ہیں۔ پہلی شکل میں جو ''صوفیانہ حل'' ہے اور جس کا مفہوم ''قُربِ الٰہی کا حصول'' اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل ایسے عوامل ہیں۔ جن میں ایمان اور عقل Faith &

Marfat.com

Reason کلیدی نظریات کے طور پر ہم نوا ہیں۔ اِس لحاظ سے ''ایمان اور عقل'' کا ہم نوا ہونے کے بعد عقل ''کامل حق'' تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ جس کے نتیجہ میں اُس اختلاف سے بچا جا سکے گا، جو عقل کے معاشرتی اور عام اصول ہیں اور بے مقصد، فضول عزائم بھی۔ ثانیاً یہ کہ جو افراد تصوف کی راہ اختیار کرنے کے بعد صالح افراد بن جائیں اور معاشرہ میں گھل مل کر ایک باہم اخوت ومحبت کا معاشرہ تشکیل دے دیں۔ جو کائنات کے قوانین کے لوازم ہیں ایک فرد کی اپنی جگہ ایک مصلحانہ کوشش ہوگی، جو اُن کی تحریروں میں ہیں۔

ایمان اور عقل اور فرد و معاشرے کے درمیان وہ اخلاقی غیر فیصلہ کن اقدار جن کا اظہار آپ کی تالیف ''سماجی انصاف'' Social Justice میں نظر آتا ہے۔ اِن سب عناصر کو آپ نے ''اشاراتِ راہ'' میں وابستگی الٰہی کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ کہ یہی چیز اِسلام کی توصیف ہے۔ اِس فکر کے ساتھ اختلاف یا انتشار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ ''ایمان اور عقل'' کے تقاضے خواہ وہ انفرادی طور پر خواہ تمام معاشرے کے لحاظ سے، انسانی آزادی اور عبودیتِ الٰہی سب مِل جُل کر ہی باہمی اخوت ومحبت کی خاطر کام کریں گے۔ اِس فکر کے ساتھ آپ نے ایسی ''خوش نما افسانوی دُنیا'' کا نقشہ پیش کیا۔ جس میں انسان خوشنودیٔ الٰہی حاصل کرتا نظر آتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں افراد کی باہمی مخاصمت ختم ہو کر رہ جائے گی، اور انسانیت اس علم کے ساتھ اپنے آپ کو محفوظ خیال کرے گی کہ جو راہ اُس نے اپنائی ہے وہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

مزید برآں اِس ''خوش نما افسانوی جنت'' کیلئے ایمان اور سماجی سیاسی عمل کے ساتھ ذرائع بھی تجویز کیے ہیں۔ جس کی تعمیر میں لوگوں کے لیے ایمان کی وہ اینٹیں ہیں، جس میں اُن کی عملی زندگی کیلئے رہنمائی ہے۔ اِس بارے میں آپ اِس حد تک پُر اعتماد ہیں، کہ آپ کہتے ہیں کہ:

> ''جب ایسے تین افراد صاحبِ ایمان ہو جائیں، تو اُن کے ایمان کا یہ تقاضہ ہے، کہ تم یہ کہو کہ
>
> ''تم ایک معاشرہ ہو، اِسلامی معاشرہ، ''جاہلی معاشرہ سے بالکل علیحدہ''......

اِس طرح اِسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جو یقیناً ایک بڑا خوش نما رہنما اصول ہے

Marfat.com

اور جذباتی طور پر اُن لوگوں کے لیے جو روزمرہ کی زندگی میں غیر مطمئن، ذہنی انتشار اور اکثر مظلوم ہیں۔ امتحاناً یہ کوشش، خواہ قولاً ہو یا عملاً اور پھر اُس میں ثمر آوری کا وعدہ بھی ہو، اکثر لوگوں کے لیے یقیناً حوصلہ افزا ہوگی۔ پھر اس پورے اعتماد کے ساتھ کہ فردِ واحد کی یہ کوشش خواہ وہ چھوٹے پیمانے پر شروع کی جائے، اُس میں اتنی دُور رس قوت ہے، جو تمام معاشرہ کو بدل کر رکھ دے، نہ صرف معاشرہ کو بلکہ پوری ریاست اور بالآخر تمام دُنیا کو۔ اِس میں اُن افراد کے لیے بڑی پُر زور کشش ہے، جو معاشرے کی بدحالی کو دیکھ کر اُس کو بدلنے کے لیے سید قطب کے ہم خیال ہیں۔

سید قطب شہیدؒ کی تصانیف کے اثرات

یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ یہ تعین کرنا انتہائی مشکل امر ہے کہ کسی ''صاحب تصنیف'' کی تصانیف کے کس قدر اثرات ہیں۔ ایک طرف یہ معاملہ کسی ایک ''صاحب تصنیف'' کا نہیں کہ یہ معاملہ کہیں کم کہیں زیادہ کی بحث کے ساتھ ہر ایک کے ساتھ ہے۔ دوسری طرف ایک ایسے ''صاحب تصانیف'' کا معاملہ بالخصوص اُس کی موت کے بعد اُس کی تصانیف اور اُس کی اپنی عملی زندگی کے پھیلاؤ کا معاملہ جس کے اثرات ایک خاص علاقہ تک محدود ہوں۔ اِس حقیقت کے باوجود گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں مصر میں سید قطب واحد شخصیت ہیں، جن کا دائرہ اثر مختلف گروہوں پر ہے، جو اگرچہ اپنے آپ کے ساتھ مرحوم کا لیبل نہیں لگاتے ہیں، لیکن اُن کو ''قطبیون'' Qutbions کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے کہ شہید کو جیل سے رہا کیا گیا اور آپ سے متاثر عبدالفتاح اسماعیل نے آپ کی تحریروں اور نظریات سے متاثر کرانے کے لیے ''سٹڈی گروپس'' حلقہ جات قائم کیے۔ آپ کا کتابچہ ''معالم فی الطریق'' آپ کی ہدایت کے مطابق مختلف شکلوں میں جگہ جگہ پھیلا دیا گیا تھا، جس نے ''اخوان المسلمون'' کے اراکین اور ہمدردوں میں ایک ایسی رُوح پھونک دی تھی کہ وہ صفِ اوّل کے طور پر آپ کے کام کو آگے بڑھائیں۔ مزید برآں باقاعدگی سے ''فی ظلال القرآن'' کی بالاقساط اشاعت نے حلقۂ اثر کو مزید وسعت دے دی تھی، کہ اُن مسلم عوام کے لیے ''یہ تفسیر بلاشبہ دِل کی آواز تھی، جس کے وہ خواہاں تھے۔ بالخصوص ایسے موقعہ پر

Marfat.com

جب ناصر کی آمرانہ حکومت کو "الازہر" کی "اسلامی" درسگاہ نے پورا جواز بخشا تھا، اُن مصریوں میں اِس تفسیر نے وہ جوش وجذبہ اُبھارا، جو اِس آمریت کی پیداوار نہ تھی۔

سید قطب کے اثرات ایک خاص حلقہ کے حق میں جلد ہی باعثِ موت ثابت ہوئے، کہ ناصر کی آمریت کے استغاثہ نے اِس امر کا مجرم گردانا، کہ آپ عوام کو حکومت کے خلاف اُبھارنے کے ساتھ اُس کا تختہ بھی اُلٹنا چاہتے ہیں۔ اِس کے نتیجہ میں آپ کو ناصر کی حکومت کی طرف سے تختہ دار پر چڑھانے پر موت سے ہم کنار کرنے کے عمل نے بہت سے لوگوں کے دِلوں میں آپ کی مقبولیت کا اضافہ کیا اور آپ کی تحریریں خاص طور پر قابلِ مطالعہ بن گئیں اور آپ کے اِس نظریہ کو فوری طور پر یہ تقویت مِلی، کہ موجودہ حکومت اسلام دُشمن پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اِسلام دُشمن بھی ہے۔ جس نے اِس امر کو مزید تقویت بخشی، کہ ریاست کے تشدد و مظالم کے لیے جوابی کارروائی لازمی ہے، تاکہ "جاہلیت کی شکار" ریاست کا وجود ختم کرنے کے ساتھ ایک مثالی ریاست تشکیل دی جاسکے۔

اِس آزادیٔ فکر کے نتیجہ میں بعض اہلِ علم حضرات نے آپ کو "خارجی" قرار دیا، جن کے ہاں بعض وہ امور معمول پا گئے تھے، جن کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ اسی طرح بعض کے نزدیک یہ کوئی فلسفیانہ فکر نہ تھی کہ اسے نظرانداز کیا جائے بلکہ باعثِ پریشانی تھی کہ جو لوگ اُس سے متاثر ہو کر اُس پر عمل پیرا ہوں گے وہ تشدد کا حامل سیاسی عمل ہوگا۔ اِس کتاب نے صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کی حسن البنا شہید کی یادداشتوں کو تازہ کر کے حکومت کو مشتعل کر دیا، جبکہ بعض کے نزدیک اِسے "دعوتِ اسلام" کا صحیح طریقہ قرار نہیں دیا گیا۔ حتیٰ کہ خود "اخوان المسلمون" اور اُس کے اکثر ہمدردوں نے کہ اُن اسلام کے نام لیوا مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے، اِس بنا پر کہ وہ اسلام کے ایک خاص رکن یا دیگر قابلِ مبحث ارا کین پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ اِس سے اختلاف کیا، جس کی مثال آپ کے بعد جناب حسن الہضیبی سربراہِ اعلیٰ "اخوان المسلمون" کی کتاب "دعوۃ لاقضاۃ" Preachers not Juages ہے۔ جو آپ نے سید قطب شہید کی شہادت کے فوراً بعد تالیف کی لیکن ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

Marfat.com

یہ بعض حلقے ہیں، جنھوں نے آپ کی تحریروں کو محض اشتعال انگیز قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود ''اخوان المسلمون'' کی بڑی تعداد اور دیگر ایک بڑی تعداد نے سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اِن میں خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بالخصوص آپ کے بھائی جناب محمد قطب نے آپ کے علمی کاموں کا علمی اور عملی دونوں میدانوں میں ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ جس میں آپ نے پوری طرح یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ دُنیا میں اِسلامی نظام برپا کرنے کے لیے وہ عملی میدان میں تشدد کی پالیسی اختیار کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بالکل اُمتِ مسلمہ کے دلوں میں یہ رُوح پھونک رہے تھے کہ وہ اِسلام کے دفاع کے ساتھ لوگوں کو اِسلام کی ایک ایک بنیاد استوار کرے۔ لہٰذا جیسا آپ نے تسلیم کیا، کہ سید قطبؒ نے غیر جذباتی انداز میں ''جہاد'' کی ضرورت پر زور دیا، کہ ''جاہلیت'' کی طاقتوں کا مقابلہ کیا جائے، اُس کا مقصد ایسے ذہن اور طرزِ عمل سے مقابلہ کیا جائے۔

دوسرے معنوں میں شہید قطب کے ''جہاد'' کے یہ معنی تھے کہ ''صحیح معنوں میں ''بندۂ مومن'' دل کی پوری گہرائیوں کے ساتھ خود اپنے اندر ''جہاد'' کی رُوح پھونکے اور ثانیاً اُس کے بعد معاشرے میں بذریعہ دعوت و تبلیغ یہ کام کرے۔ اِس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو محمد قطب اپنے شہید بھائی کی تصانیف میں اِس سمت اکثر حوالہ جات دیتے تھے۔ جس میں ایک حوالہ یہ بھی تھا:

> ''نہ ''جاہلیت'' کی پیروی کرو، نہ اِس کے پیروکاروں سے قطع تعلق کرو......
> لیکن جب اِن لوگوں سے مِلو جُلو، تو قدرے علیحدگی کا رویہ اختیار کرو، امتیاز برتو، کھل کر اپنا برسرِ حق ہونے کا مظاہرہ کرو، جس میں محبت ہو اور خلوص نیت سے ''ایمان'' کی برتری کا اظہار ہو۔''

محمد قطب اور دیگر افراد جنھوں نے شہید کی رہنمائی اختیار کی ہے، اُنھوں نے شہید کی اِسلام کی پکار کو ذہنی اور اخلاقی طور پر عملاً متحرک بنانے پر زور دیا ہے۔

ایسے مصنّفین کے لیے آپ رُوحانی بالیدگی اور تعمیر پر زور دیتے ہیں کہ وہ ہر مرد و خاتون کو اِس طرف توجہ دلائیں، کہ جن امور میں ''ایمان'' کی دعوت ہو، وہ اُسے اپنے ایمان کا تقاضہ

Marfat.com

یقین کر کے اپنی زندگیوں کا فریضہ بنائیں۔ مزید برآں آپس میں باہمی وابستگی کا وہ جذبہ جو آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کی تحریروں سے حاصل کیا ہے، آپ کی رائے میں وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ رسائی ہے۔ جو اُن کو معاشرے کے عام افراد کے ساتھ مربوط کر دیتی ہے۔

جیسا کہ دیگر کئی مذاہب میں ہے، آپ کی ایسی تحریروں مین اخلاقیات، غیر سیاسی دخل اور رواداری کا وجود ہے۔ بہت سے مسلمانوں نے اس کا بھی اثر لیا ہے۔ لیکن ایک وہ بھی ہیں اور وہ بھی بڑی تعداد میں ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں اور اُنہی تحریروں سے اثر لیا ہے کہ استعمالِ قوت کے بغیر دُنیا میں خیر کی تبدیلی لانا ممکن نہیں۔ یہ رجحان مصر میں بالخصوص ہے۔ جو گزشتہ بیس پچیس سالوں میں مختلف اسلامی گروپس کی شکلوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔

اِن میں سے قابلِ ذکر اول گروپ ''الجماعۃ الاسلامیہ'' ہے۔ جس نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز مصری یونیورسٹیوں سے کیا اور بعد ازاں اپنی سرگرمیاں یونیورسٹیوں سے باہر زیرِ زمین بڑھا دیں۔ اِس گروپ کی تشکیل کی بڑی وجہ صدی کے ساتویں عشرے میں اقتصادی اور سماجی بدحالی تھی۔ مزید برآں ایک اور بڑی وجہ مصری معاشرے میں لادینی اور مغربی تہذیبی اقدار کا اسلامی اقدار کی جگہ لینا تھا، جو اِس گروپ کے لیے باعثِ تشویش تھا، اور اِس بارے میں وہ غیر نمائندہ اور جابر فوجی حکومت کو اِس کا مجرم گردانتے تھے۔ اِس کے ساتھ ''الازہر'' یونیورسٹی اور خود ''اخوان المسلمون'' کو خرابی کا مجرم گردانتے تھے۔ اول الذکر کو اس وجہ سے کہ یہ سرکاری ملازمین کی بھرتی کا ادارہ ہے اور ثانی الذکر کو اس وجہ سے کہ یہ جماعت اپنی تشکیلِ نو کے بارے میں اتنی مصروف ہے کہ یہ حکومت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ (مصر کے حالیہ پر امن انقلاب نے، جس میں اخوان المسلمون نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، یقیناً اس تاثر کو زائل کر دیا ہوگا۔ ناشر)

اِس لحاظ سے سید قطبؒ کی تحریریں اس طبقہ خیال کے افراد میں ہر فرد اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہے، کہ معاشرہ ''جاہلیت'' اور اندھی تقلید کا شکار ہے، اور ضرورت ہے کہ ہر صاحبِ صلاحیت اِس ''جاہلیت'' کے خلاف جہاد کرے، اور یہ اثر آپکی بعد کی تحریروں میں تھا، جس سے ایسے افراد متاثر تھے۔ ایسے افراد دوسرے اسلامی

Marfat.com

گروپس کے اراکین کو بھی اُسی انداز سے متاثر کرتے تھے، اور مصری معاشرے کو بھی۔ مزید برآں سید قطبؒ کا جذبۂ عمل اور تحریکی انداز میں اِسلامی تقاضوں کی ترجمانی اور اِس کے ساتھ یہ یقین دہانی کہ اگر "ہم بھی اِسلام پر اُسی طرح عمل کریں، جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے کیا تھا تو ہم بھی یقیناً فتح یاب ہوں گے۔" ایسے گروپس کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث تھی، جس کی جابر اور ظالم مصری حکومت کے خلاف ضرورت وقت تھی۔

آپ کی تحریروں کے بارے میں مختلف گروپ اُن کو مختلف معنی پہنانے کے ساتھ مختلف حکمتِ عملی اختیار کرنا روا رکھتے تھے۔ لیکن سب اِس امر پر متفق تھے کہ اولین کام شریعت کی حکمرانی ہے جیسا قرآن کا حکم ہے۔ لیکن اِس کام میں اولاً فقہی مشکلات حائل ہیں اور اِسکے بعد ریاست اور معاشرے کی بنیادوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِس نیت کے ساتھ کہ دونوں ہی شرعی نظام کے نفاذ میں بڑی رکاوٹ ہیں، اِن دونوں رکاوٹوں کا دُور کرنا اِن گروپوں کا مطمحِ نظر تھا۔ چنانچہ اِن میں ایک گروپ جس کا نام "تنظیم التحریر الاسلامی" تھا۔ جس نے اولاً ۱۹۷۴ء مصری ملٹری اکیڈمی پر حملہ کیا اور بعد ازاں ۱۹۷۷ء میں ایک اور گروپ بنام "التکفیر والھجرۃ" نے سابق وزیرِ اوقاف کو اولاً اغوا کیا اور بعد ازاں قتل کر دیا، اور ایسا ہی ۱۹۸۱ء میں صدر سادات کا قتل ہے۔ جس کی ذمہ داری "جہاد" تنظیم پر ڈالی گئی ہے۔ جبکہ اِن سب گروپوں کو "قطبییون" کہا جاتا ہے۔

یہ امر تو شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اِن تمام گروپوں نے سید قطب شہیدؒ کی تحریروں سے اثر و جذبہ لیا۔ جہاں تک تنظیم "جہاد" کا تعلق ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے، یہ تنظیم اِس کے رُکنِ اعلیٰ عبد السلام فرج کے ایک پمفلٹ "الفریضۃ الغائبۃ" "غائبانہ فریضہ" کی بنیاد پر عمل میں آئی، جس کے تمام حوالہ جات سید قطب کی اُن تحریروں سے ہیں، جن میں صدق دلی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ مسلمانوں کو "جہاد" پر اُبھارا گیا ہے۔ اِس پمفلٹ کی بہت زیادہ تشہیر اُن دنوں ہوئی، جب جناب عبد السلام فرج پر صدر سادات کے قتل کی سازش کا مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا۔ جنہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں سید قطب شہیدؒ کی تحریریں اور زبان استعمال کی تھی اور یہی تحریریں اور تقریریں دیگر اِسلامی گروپس کی تھیں، جنہوں نے شہیدؒ کی شخصیت کو

Marfat.com

ابدیت کا درجہ دیا۔

تاہم اِس سے ہٹ کر بھی عالمِ اسلام میں آپ کی شخصیت کو اِسلام کا نمائندہ قرار دینے والے لاتعداد افراد ہیں، جو ''احتجاجی'' گروپوں پر مشتمل ہیں۔ سید قطب کی طرح یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اردگرد معاشروں کو اخلاقی اقدار سے محروم مادیت کے رنگ میں رنگے گئے ہیں، اور اِس سے بڑھ کر اُن کی اور اِسلامی اقدار دُشمن حکومتوں کی غلامی اُن پر حاوی ہوگئی ہے۔ جنہیں وہ کسی شکل میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اِس فکر کے حامل لوگ سید قطب کی طرح جب ایسے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، جن میں عام روایتی زندگی ساتھ دینے سے عاری ہے یا کوئی دیگر ممکنہ حل روا نہیں رکھتی، جبکہ مشکل سے دوچار فرد مجبور ہیں، کہ حل کی کوئی راہ نکالے اور ایمان کے تقاضے پورا کرے تو اُس کے پاس انفرادی ''اجتہاد'' کی راہ ہی مسئلہ کا حل ہے۔ خواہ اِس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوں۔ لیکن سید قطبؒ نے یہ راہ اپنانے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جن کے اپنانے میں اکثر مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔

حرفِ آخر:

دراصل سید قطب کی سیاسی فکر ''کمالِ فکر'' Vision of Perfection تھی، جس میں ''اُخروی جنت اور زمین'' کے درمیان، ''انسانیت اور کائنات'' کے درمیان ''افراد کا افراد'' کے درمیان اور ''انسان اور اُس کے خالق'' کے درمیان باہمی استواریٔ تعلق کا تصور ہے۔ جو ''تعمیر رُوحانیتِ قلب'' میں پنہاں ہے۔ جس میں ایک طرف اِس امر پر زور ہے، جیسا کہ خود اُنہوں نے اپنی ذات کو اُس کا نمونہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے، کہ فرد اپنی ذات احکامِ خداوندی کی تعمیل میں متعارف کرائے، جسے دلکش قدرتی خوبصورتی کا نام دیا جائے گا۔ اِس امر کو اوّلیت کا درجہ دینے کی شکل میں ''تصوف'' کے خلاف راہ نکلتی ہے۔ جس میں فرد سماجی تعلق کا پابند نہیں ہے۔ اَب معاشرہ ایک وجہ ہو، یا معاشرہ کا حصہ، بالآخر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر ذاتِ الٰہی کے ساتھ تعلق قائم کرے۔ جناب سید قطبؒ کا یہ رجحان یقیناً آپ کی تحریروں میں قابلِ ذکر ہے۔ تاہم آپ نے اِس کے محاسبہ پر بھی زور دیا ہے، اِس یقین دہانی کے ساتھ کہ سیاسی

Marfat.com

قوت حاصل کرنے کے لیے یہ عمل ضروری ہے، جس کے نتیجہ میں تمام انسانیت ''حکمِ خداوندی'' کا پابند بنائی جا سکے گی۔

اِس سلسلہ میں آپ نے اپنی ''فکر کمال'' کو نتیجہ خیز خیال کیا، اور اِس امر پر زور دیا، کہ غور و فکر کی باتیں کرنے کی بجائے کم از کم اللہ تعالیٰ کے اُن احکامات کی عملاً بجا آوری میں کوئی کمزوری نہ دکھائیں، جن میں کسی تاویل وغیرہ کی گنجائش نہیں۔ ''عملی مسلم'' Activist کی اصطلاح جو آپ کی بعض تحریروں میں نظر آتی ہے، ایسے لوگوں کو سمجھانے کی ایک صحیح کوشش کہی جا سکتی ہے، جو یہ پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ اُن کی کوششیں نتیجہ خیز ہوں گی۔ مزید برآں سید قطب ایسے صاحب ایمان افراد کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اُن کے اعمال کا ثمر آور ہونا ضروری ہے، کہ اُنکے اندر ''انقلاب آوری'' کے بیج ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کیلئے آپ نے ''دھماکہ خیز اصول'' Dynamic Principle اپنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جو آپکے الفاظ ہیں۔ بہ الفاظ دیگر فلسفیانہ اور دیگر قسم کی بحث و تمحیص کی بجائے جو ''عمل'' سے فرار کی راہ ہے۔ ''عمل'' کی راہ اپنائی جائے، جو سادہ، سیدھی سادی اور غیر پیچیدہ ہے۔ اِس بارے میں اگرچہ آپ کا یہ دعویٰ تھا، کہ ''فکر و عمل'' کے درمیان جو دُوری پیدا ہوگئی ہے، اُسے بحال کیا جائے، جو ایک نتیجہ خیز عمل ہوگا۔

سید قطب کی مختلف تضادات کو مٹانے کی کوشش کے ساتھ اُن لوگوں کو عوام میں غیر مقبول کرنے کی کوشش تھی، جن کا رویہ معذرت خواہانہ تھا یا یہی حکمتِ عملی تھی۔ دراصل آپ کا دلیل کا بالکل نفی کرنا...... بہ الفاظِ دیگر اُن اصولوں کی نفی کرنا جن کا دلیل سے تعلق...... بالخصوص ایمان کے معاملہ میں...... اُس سمت کی نشاندہی تھی، جس سمت آپکی تحریریں تھیں۔ البتہ بحیثیت ایک مسلم دانشور اگرچہ باعثِ تعجب تو ہے، لیکن بے مثال نہیں، کہ جس قسم کے حالات سے آپ دوچار تھے، جہاں آپ نے اسلامی روایات سے استفادہ کیا، وہاں آپکی نظریں مغربی روایات پر بھی تھیں۔ دراصل آپ کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ آپ اُن تمام باتوں کی نفی کرتے ہیں...... اسلام کی نئی تعبیر...... جسکی خاص تشریح نہیں۔ آپ کا تمام تر زور ایسی قوتِ ایمانی پر ہے، جس میں گرمی کردار اور ایمانِ کامل کی قوت پر بھروسہ کے ساتھ ہر طرح کے مخالف حالات سے مقابلہ کرنا ہے۔

Marfat.com

اِس لحاظ سے یہ خیال کرنا غالباً حیران کُن ہوگا کہ آپ کی تحریریں اُن لوگوں پر ضرور اثر انداز ہوئی ہوں گی، جو حالات کے بگاڑ کی اصلاح کے لیے کسی کلید کی تلاش میں ہوں اور اُنہوں نے انفرادی طور پر اِن تحریروں کو کلید پایا ہو، کہ حالات کا جُوں کا توں رہنا مسائل کا حل نہیں ہے۔ ایسے میں آپ اُن لوگوں کیلئے اپنی آواز بلند کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں، جو آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے قبل یہ سوچ بیٹھے تھے کہ مغربی افکار و اقدار کا اپنانا اور اُنہی جیسا نظامِ زندگی اختیار کرنا مسلمانوں کے سامنے درپیش مسائل کا حل ہے، لیکن جب ایسے لوگوں نے آپ کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ آپ کی زندگی کو اُن کا نمونہ پایا، تو اُنہوں نے اُسے دل کش پایا، کہ انفرادی طور پر ہر شخص نے اُس پر عمل پیرا ہونا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اور ایسے لوگوں نے خواہ ''صوفیانہ'' انداز میں خواہ معاشرتی اور سیاسی نقطہ نظر سے اِس میں ایک جذبۂ عمل پایا ہے، سید قطب کی تحریروں نے اُمت کو ''قوتِ ایمانی'' سے ایسا ہم کنار کیا ہے کہ اُن میں گزشتہ بیسویں صدی یہ قوت بخشی اور آئندہ اکیسویں صدی عیسوی میں یہ ''جذبۂ عمل'' جاری رہے گا۔

اِن الفاظ کے ساتھ سید قطبؒ کی شخصیت اور اُن کی ''قوتِ ایمانی'' سے پُر ایک مسلم سکالر کا نہیں بلکہ ایک مغربی سکالر کا یہ مضمون ختم ہوتا ہے۔ گزشتہ صدی کے دوران تُرکیہ میں کمال اتاترک کی شکل میں، مصر میں جمال عبدالناصر کی شکل میں، اور عراق میں صدام حسین کی شکل میں اسلامی ناموں کے ساتھ آمر بن کر آئے، مرنے کے بعد نہ اُن کا کوئی نام لیوا ہے اور نہ لادین قسم کی قوم پرستی کا دم بھرنے والا، جبکہ سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، حسن البنّاؒ شہید اور سید قطب شہیدؒ جنہوں نے اِسی گذشتہ صدی میں عالم گیر سطح پر اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر اللہ کے دین، دینِ اسلام کو عالمی امن کا پروانہ قرار دیا اور اس کے حق میں اپنے قلم کے علاوہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اُمتِ مسلمہ کے سامنے نظریۂ اسلام پیش کیا۔ آج اُن کا نہ صرف نام زندہ جاوید ہے۔ بلکہ خود دینِ اسلام ایک طرف بتدریج اُمتِ مسلمہ کے دلوں کی آواز بنتا جا رہا ہے، ہر خطہ زمین اور ملک میں تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اور تمام تر اسلحہ کی قوت کے باوجود مغرب کے لیے ایسا چیلنج ہے جس میں اسلام کی فتح یقینی ہے۔

Marfat.com

۷

موسیٰ الصدر

۱۹۲۸ء تا......

آگسٹس رچرڈ نورٹن

مضمون نگار مڈل ایسٹ بالخصوص لبنان کے بارے میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ بوسٹن یونیورسٹی میں انٹرنیشنل ریلیشنز کے پروفیسر ہیں۔ وسیع المطالعہ اور شیعہ مذہب کے علاوہ سنی مذہب پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ مضمون میں مختلف مطبوعات سے ۲۸ حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔

آغازِ مضمون:

عالمِ مغرب کے سیاسی حلقوں میں شیعی اِسلام کی اہمیت ۱۹۷۹ء میں رضا شاہ پہلوی، شاہِ ایران کی حکومت کے خاتمہ کے بعد غیر متوقع طور پر نمایاں ہوئی۔ اِس کے بعد ایران کو مغربی مما لک نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ ہمسایہ مما لک کے لیے بھی ایک خطرہ قرار دینا شروع کر دیا۔ اگر مغربی مبصرین نے ایران کو ایک چیلنج قرار دینے کے ساتھ نئی انقلابی حکومت کے بارے میں غلط اندازے لگائے تو ایران کے نئے حکمرانوں نے بھی غلط اندازے لگانے روا رکھے۔ اِن مبالغہ آمیز غلط اندازوں کے ساتھ کہ ایران کا یہ انقلاب ''اُمتِ مسلمہ'' کے معاشرتی اور سیاسی مسائل کی طرف نمونہ کا اقدام ہے۔

کوئی انقلابی فتح مندی انقلابیوں کو فتح کے نشہ میں اتنا ست کر دیتی ہے، کہ وہ عقل و شعور سے خالی ہو جاتے ہیں۔ ایران میں اِس شیعی انقلاب کی فتح نے عرب شیعی ریاستوں بحرین، عراق، لبنان اور سعودی عرب کے کچھ شیعہ علاقہ کے شیعوں اور غیر شیعی مخالف انقلاب اپنے اپنے طور

Marfat.com

دونوں کو متاثر کیا۔ حالانکہ ان علاقوں میں ایران میں شیعیت کی ماضی کی تاریخ سے قبل سیاست سمیت کسی شعبہ میں کوئی تاریخ نہیں، تا آنکہ حالیہ انقلابِ ایران اور ''ولایت الفقیہہ'' کی حاکمیت۔

گزشتہ صدی میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خاتمہ اور آیت اللہ خمینی کے انقلاب سے قبل صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے میں لبنان میں معاشرتی اور سیاسی سطح پر شیعیت کے اثرات رُونما ہو چکے تھے۔ لیکن اُس کی کوئی تفصیل نہیں۔ البتہ اِسے ایک تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کی قیادت ایک شیعی عالمِ دین السید موسیٰ الصدر کر رہے تھے، جو ایران میں پیدا ہوئے، لیکن بعدازاں لبنان میں بیس سال کا عرصہ ایک معروف سیاستدان کے طور پر گزارا، لیکن انقلابِ ایران سے کوئی چھ ماہ قبل ۱۹۷۸ء میں اچانک غائب ہو جانا ایسا حیران کُن واقعہ ہے، کہ اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟ اگر تاریخ فائلوں کے ڈھیر کا نام ہے۔ تو اِس واقعہ میں ایک دلچسپ بات جو نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے، تو لبنان کی کیا تاریخ ہوتی؟

اقلیتی عرب قومیں:

مغربی مستشرقین کے لیے اہلِ تشیع کی یہ شکایت اور بعض مرتبہ اُن کی ناراضگی بجا ہونی چاہئے کہ اُنہوں نے اسلامی تاریخ کو تحریر لانے میں ''شیعیت'' کو خاطر خواہ جگہ نہیں دی۔ لفظ ''شیعہ'' کی اصطلاح جس کے بہ الفاظِ دیگر ''محبانِ'' علیؓ معنی ہیں، ازخود یہ واضح کرتی ہے، کہ ابتدائے اسلام کے دور سے ہے۔ لیکن ''عرب شیعہ'' کا اصطلاح مختلف تمثیلات کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ''عرب شیعہ'' کی اصطلاح سمجھنے کے لیے ضروری ہے، کہ اولاً اُن کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی کڑیوں کا جائزہ لیا جائے، جو اُن کی ہم عصر علیحدگی اور تعصب کا باعث ہیں، اور پھر شیعیت میں جس میں ''تصوف'' کا بڑا زور ہے۔

اِس وقت اہلِ اسلام میں اہلِ تشیع اور سنی المسلک دونوں میں علیحدہ علیحدہ دو شدت پسند گروہ ہیں۔ اِس میں ایک وجہ سنی المسلک خلافتِ عثمانیہ کا دور ہے، جس میں خلافتِ عثمانیہ کے حکمرانوں کا اہلِ تشیع کے خلاف تعصّبانہ رویہ ہے اور بعض مواقع پر اِن کا اپنی عثمانی حکومت کے خلاف حریف اہلِ تشیع ایران کی حکومت کے ساتھ وفاداری سے بھی بڑھ کر رویہ اُن کی تعلیمی، جنگی

Marfat.com

اور اہم سرکاری ملازمتوں میں محرومی کا باعث ہوا، تو جہاں اُن کی وفاداری مشکوک رہی، وہاں شدّتِ پسندی میں اضافہ کا باعث بھی ہوئی۔ یہ تعصّبانہ رویہ صدیوں سے سنی المسلک مسلمان ممالک اور اہلِ تشیع مسلک ایران، شام، لبنان وغیرہ ممالک میں جاری ہے، جس میں کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ جبکہ یہ تعصّبانہ رویہ بڑی حد تک دونوں مسالک کے عوام میں بھی ہے، ماسوائے ایک بڑی قلیل شرح کی غیر مؤثر اقلیت کے۔ جبکہ تعصب زیادہ تقویت اختیار کر لیتا ہے، جب اہلِ تشیع اپنے آپ کو "مستضعیفی" یعنی "مظلوم" قرار دے کر سنی المسلک مسلمانوں کو اجتماعی طور پر "متکبرین" یعنی "ظالم" قرار دیتے ہیں۔ بالخصوص عرب ممالک کے اہلِ تشیع نے یہ رویہ اختیار کر کے نفرتوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن اِن تمام تر نفرتوں اور سنی المسلک عربوں کی اپنے مسلک کی بالادستی کے باوجود یہ خیال کرنا کہ اِن ممالک میں اہلِ تشیع غربت کا شکار ہیں، صحیح نہیں۔ کیونکہ اِس مسلک کے بحرین، کویت اور لبنان وغیرہ کے علاقوں میں تجارت اور دیگر شعبوں میں بے انتہا دولت مند ہیں اور اُس کا اقلیتی فرقہ ہونے کے باوجود بڑے فخر و غرور سے اکثریتی سنی مسلک آبادی پر مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو نفرتوں میں اضافہ کرتی ہے، کے علاوہ "اعوان" نام سے ایک اور سرکردہ طبقہ ہے، جو اُنکی "مظلومیت" کی پکار کو بے معنی بنا دینے کیلئے کافی ہے۔

صدیوں کے یہ تعصّبات بالخصوص حکمران اور بلند مرتبت حلقوں کی وجہ سے چند سالوں میں نفرتیں ختم نہیں کر سکتیں۔ اگرچہ بعض اوقات اِن باہمی نفرتوں کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی، کہ اہلِ تشیع مسلک کے افراد کو اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں پورا مقام دیا جائے۔ جس کی مثال لبنان میں فواد شہاب ۶۴-۱۹۵۸ء کی صدارت ہے، اور اُنہوں نے بھی اپنے آٹھ سالہ دورِ صدارت میں لبنان کی تعمیر و ترقی کے علاوہ باہمی اخوت و محبت پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن اُن کی صدارت کے خاتمہ کے بعد لبنان اُسی بدقسمتی سے ہم کنار ہو گیا۔

شیعیت اکثر اوقات ایک ایسی مثال ثابت ہوئی ہے، جو ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کرنے والی ہو، کیونکہ ایک اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی کمتر اقلیتی طبقہ کے پڑھے لکھے فرد کے لیے یہ ممکن نہیں، کہ وہ معاشرہ میں بلند مقام بنانے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ مڈل ایسٹ کی

Marfat.com

سیاست میں اہلِ تشیع کی یہ فکرا کثر دھماکہ خیز رہی ہے۔

عالمِ اسلام میں ایران واحد ملک ہے، جہاں شیعہ کثیر آبادی کے مالک ہیں اور سیاسی نظام کے مالک، اِس کے بعد عراق ہے، جہاں وہ ایک مؤثر قوت ہیں، لیکن اتنی بڑی نہیں، کہ اکیلے ملک کی حکمرانی کر سکیں، ۱۹۲۰ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد عراق کے اہلِ تشیع نے موقعہ کو مناسب خیال کر کے برطانوی قبضہ کے خلاف بغاوت کی۔ لیکن یہ وہ دور تھا، کہ کسی مغربی نو آبادیاتی طاقت کے خلاف تمام تر مخالفت اور نفرت کے باوجود اُس کا تسلط ختم کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ برطانیہ نے اِس بغاوت کو بُری طرح سے کچل دیا، جس میں ہزاروں کی تعداد میں شیعی قبائلی، علما اور دیگر بااثر افراد کام آئے، اِسی طرح مغربی طاقتوں نے عالمِ عرب کے دیگر ممالک میں بھی اہلِ تشیع حضرات کو حکمرانی سے دُور ہی رکھنا روا رکھا ہے۔ بالخصوص لبنان میں۔ حتیٰ کہ صدی کے نویں عشرے یعنی ۱۹۹۰ء اور بعد میں جب اِس ملک میں یہ لوگ واحد اکثریتی پارٹی کے طور پر ملک میں حکومت قائم کر سکتے تھے، مغربی سازشیں آڑے آئیں۔ اِس وجہ سے کہ ملک میں اِن کی آبادی ایک تہائی ہے، لیکن سیاسی قوت مضبوط ہے، اور اکثر سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اِس ملک میں شیعہ زیادہ مضبوط قوت بن جائیں گے اور میرونی کیتھولک Maronite Catholic کی متبادل قوت بن جائیں گے، جو نصف انیسویں صدی سے اب تک لبنان میں سیاسی قوت رہے ہیں۔ تاہم وہ قوتیں جنہیں علاقائی اور بین الاقوامی حمایت حاصل ہے، وہ داخلی مالی مشکلات دُور کرنے پر توجہ نہیں دیتیں۔ اگرچہ ملک میں کوئی سیاسی پارٹی واحد طور پر ملک میں واحد اکثریتی پارٹی ہونے کی دعویدار نہیں۔ لیکن شیعہ کے خلاف ایک متحدہ قوت کے طور حکومت بنا سکتی ہیں۔ جبکہ خود اہلِ تشیع بھی اندرونی اختلافات کا شکار ہیں۔

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ۱۹۸۹ء میں ملک میں خانہ جنگی بند کرنے کے لیے معاہدہ ''الطائف'' طے پایا تھا۔ اِس میں سنی، میرونی کیتھولک کے ساتھ اہلِ تشیع بھی تیسری مساوی آبادی شمار ہوں گے۔ یہ معاہدہ سعودی حکومت کی کوشش کا نتیجہ تھا، جو اپنی جگہ ایک حیرت انگیز واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سعودی حکومت خلافِ تشیع مسلک رکھتی ہے۔ جبکہ سعودی عرب میں بھی

Marfat.com

شیعہ آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ سعودی عرب جو تیل کی دولت سے مالا مال دنیا کا بڑا ملک ہے، جس علاقہ سے تیل نکلتا ہے۔ وہاں سعودی آبادی کی پانچ فیصد شیعہ ہے۔ غالباً ''الطائف'' معاہدہ کی یہی ایک وجہ ہوگی جو سعودی عرب کے شہر ''طائف'' میں طے پایا تھا، اور سعودی عرب نے لبنان کے اہلِ تشیع کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ معاہدہ کرایا تھا۔

شیعیت تاریخ کی بنیادیں:

جیسا کہ عیسائیت کی فرقہ بندی عیسائیوں کو آرتھوڈوکس، کیتھولک اور پراٹسٹنٹ فرقوں میں تقسیم کرتی ہے، ایسے ہی اسلام میں مختلف مذہبی مسالک اور فقہی اختلافات ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں شیعیت کا اُمتِ مسلمہ میں بطور ایک منظم فرقہ کا ظہور ہے۔ جس چیز نے شیعیت کو ''اُمتِ مسلمہ'' میں ایک علیحدہ مسلک کے طور پر متعارف کرانے کا موقعہ بخشا، وہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ۶۳۲ء میں وفات کے بعد آپ ﷺ کی جانشینی کا مسئلہ تھا۔ جانشینی کے موضوع پر بنیادی اختلاف شدت اختیار کر گیا۔ جبکہ آپ بطور پیغمبر ''پیغمبر آخرالزماں ﷺ'' یا ''مہر انبیاءؑ'' ہیں۔

آپ ﷺ پیغمبر ہونے کے ساتھ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے فاتح اور سیاستدان ہیں، اور مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی ریاست کے حکمران۔ آپ ﷺ کی وفات کے وقت غالب ترین اہلِ اسلام کی یہ رائے ہے، کہ بطور حکمران اسلامی ریاست مدینہ آنحضور ﷺ نے جانشینی کے بارے میں کوئی وصیت نہیں چھوڑی اور یہ معاملہ اپنے بعد اُمت پر چھوڑ دیا، جبکہ چند کا اس سے اختلاف ہے۔ جو یہ کہتے ہیں، کہ آپ کا جانشیں ''اہل بیت'' یعنی آپ کے گھرانے سے ہونا چاہیے۔ اِن قلیل افراد کی رائے میں حضرت علیؓ جو آپ کی بیٹی فاطمہؓ کے خاوند ہیں، اور یہ قلیل افراد جو اپنے آپ کو ''شیعانِ علیؓ''، بمعنی ''علیؓ کے ساتھی'' کہلاتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے دو موقعوں پر اپنا جانشین نامزد فرمایا تھا۔ جبکہ بطور ایک اُمت، غالب ترین اکثریت کی یہی رائے ہے کہ آپ ﷺ نے یہ معاملہ اپنے بعد اُمت پر چھوڑ دیا تھا، جس نے آپ ﷺ کے بعد آپ کے ابنِ عم حضرت ابوبکرؓ کو بطور خلیفہ آپ کا

Marfat.com

جانشین منتخب کیا۔ اِس انتخاب کو اُمتِ مسلمہ جس کی غالب اکثریت ''سنی العقیدہ'' ہے۔ ''اجماع'' قرار دیتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کو ''خلیفہ'' قرار دیتی ہے۔ جبکہ شیعیت میں ''خلافت'' کی بجائے ''امام'' کا مسلک ہے اور شیعی علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے۔

اہلِ تشیع کا بلا اختلاف یہی مسلک ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ''اہلِ بیت'' ہی کا کوئی فرد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اُن کے نزدیک پہلے تینوں خلفائے راشدین حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ غاصب ہیں اور علی رضی اللہ عنہ اصل جانشین ہیں۔

پہلے تین خلفاء کی وفات کے بعد ۶۵۶ء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ کے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عم زاد تھے اور شام میں دمشق کے گورنر تھے۔ اُنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم سے انکار کر دیا۔ جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اِسے بغاوت سمجھ کر کچلنے کے لیے ایک فوجی دستہ مدینہ سے دمشق روانہ کیا۔ اہلِ تشیع کے نزدیک بلکہ اُمتِ مسلمہ کے نزدیک یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ آپ نے مناسب خیال کیا، کہ اُمتِ مسلمہ میں خون خرابہ کی بجائے یہ مسئلہ ایک ثالث کے ذریعہ حل کیا جائے جو آپ کے خود اپنے بعض ساتھی فوجی سپاہیوں کی ناراضگی کا باعث ہوا اور آپ کو ۶۶۰ء میں شہید کر دیا گیا۔ جبکہ یہ شہادت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے تمام اُمتِ مسلمہ کے لیے بلا کسی تنازعہ ایک خود مختار خاندانی حکمرانی کا باعث ہوئی۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے فرزند حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بلا کسی اختلاف اہلِ سنت و اہل تشیع خلافت بمعہ منصب حکومت ذمہ داریاں سنبھالنے سے معذرت کر دی، اور اِس کے بعد سے اب تک ''اہلِ بیت'' کا کوئی فرد اُمتِ مسلمہ اور عالمِ اسلام کے کسی علاقہ کی حکومت کا عہدہ نہیں سنبھال سکا۔ ماسوائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ جو جلد ہی وفات پا گئے۔ جبکہ اہلِ تشیع کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ زہر دیئے جانے کی وجہ سے دُنیا سے رُخصت ہوئے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بتانے سے معذور ہیں کہ کس نے آپ کو زہر دیا؟ جبکہ عامۃ المسلمین کی یہی رائے ہے، کہ آپ کی وفات طبعی طور پر واقع ہوئی۔

Marfat.com

اہلِ تشیع میں حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا تصور مفقود ہے چنانچہ وہ اولاً تین خلفائے راشدینؓ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی خلیفۃ المسلمین کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی امام قرار دیتے ہیں، جو اول امام ہیں اور آپ کے بعد یکے بعد دیگرے گیارہ امام ہیں۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت تمام اماموں کی تعداد بارہ ہے، اور بارھویں امام ''امامِ غائب'' ہیں اور عقیدے کے مطابق وہ امام مہدی ہیں۔ جن کا ظہور قُربِ قیامت کے عرصہ میں ہوگا۔ اِن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سب امام حکمرانوں کے مظالم کا شکار ہو کر دُنیا سے رُخصت ہوئے، جبکہ امام مہدی یا امامِ غائب بارھویں امام ہیں، اہلِ تشیع جہاں یہ کہتے ہیں، کہ اُن کا ظہور قُربِ قیامت کے دنوں میں ہوگا۔ وہاں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ وہ کون تھے، جو بارھویں امام تھے، کس حکمران کے دور میں تھے، کب اور کس طرح اور کن لوگوں کو مخاطب کر کے غائب ہوئے۔ جہاں تک قُربِ قیامت کے دِنوں میں ''شر کے خلاف'' ایک اِسلامی قیادت خیر بن کر اُس کا کامیاب مقابلہ کرے گی۔ اِس سے اہلِ سنت کا اختلاف نہیں اور یہ بھی قرآنِ کریم کی آیات کے مطابق مسلمانوں کا ایمان ہے، کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ جو زندہ آسمانوں کی طرف اُٹھائے گئے تھے، قُربِ قیامت کے دنوں میں دوبارہ زمین پر اُتریں گے۔ اور ''دجال'' جو شر کی قوتوں کا لیڈر ہوگا، جعلی مسیح کا دعویٰ کرے گا اور اصل مسیح عیسیٰ بن مریمؑ اُس کا مقابلہ اور دجال کو جو یہودیوں میں سے اور اُن کا لیڈر ہوگا، اور اُس کو شکست دے کر اُسے قتل کریں گے، جبکہ مسلمان اور اُن کا لیڈر حضرت عیسیٰ بن مریم جو مسیح ہوں گے اُن کا ساتھ دیں گے۔ لیکن وہ لیڈر بطور امامِ غائب نہ ہوں گے بلکہ اُنہی دِنوں میں پیدا ہوں گے نہ کہ اہلِ تشیع کے عقیدہ ''امامِ غائب'' جو کہ زندہ ہیں اور نا معلوم کہاں زمین پر کس جگہ اور اُن کے کیا مشاغل ہیں؟

اہلِ تشیع کے نزدیک ایک عقیدہ ''تقیہ'' کا ہے۔ جس کے مطابق اگر کسی شیعہ کو بزور قوت عقیدہ تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے، تو وہ اِس عقیدہ کے مطابق عارضی طور پر اپنا عقیدہ خفیہ طور پر تبدیل کر سکتا ہے۔ تا آنکہ خطرہ نہ ٹل جائے، جبکہ اہلِ سنت والجماعت اور اِسلام کے دیگر کسی مسلک میں یہ عقیدہ جائز نہیں۔ لیکن حالیہ دور میں آیت اللہ خمینی نے اِس کی نفی کی اور کہا

Marfat.com

"میں حسین ہوں حسن نہیں"، اِس لحاظ سے آپ امام حسن کو عقیدہ "تقیہ" کا مالک خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کے قریب کر دیتے ہیں۔

شہادت امام حسین ﷛:

شیعیت میں حضرت امام حسن ﷛ کا خلافت کے منصب سے معذرت کرنے کے بعد بلاشبہ سب سے اہم واقعہ شہادتِ امام حسین ﷛ ہے۔ یوں تو شیعیت بے شمار قصہ کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن اہم ترین اور بے حد المناک واقعہ پیغمبر آخرالزماں ﷺ کے نواسے، برادرِ امام حسن ﷛، عراق کے اُس وقت کے صوبہ کُوفہ کی گمنام آبادی کربلا میں ۶۸۰ء میں امام حسین ﷛ کی شہادت ہے۔ تاریخ اسلام میں بلکہ دُنیا بھر کی تاریخ میں پیغمبر آخرالزماں ﷺ کی بے مثال جرأت و دلیری کے بعد حضرت امام حسین ﷛ کی بے مثال جرأت و دلیری ہے، اور یہ آپؓ ہی کی شہادت ہے، کہ شیعیت مسلک کی عمارت جس پر قائم ہے، جبکہ اُمتِ مسلمہ کے دیگر تمام مسالک کے عوام بھی اُسی طرح آپؓ کی شہادت پر نوحہ خواں اور بے مثال جُرأت و دلیری کی وجہ سے اپنے دِلوں میں ظلم اور جارحیت کے خلاف جذبۂ جہاد لیے ہوئے ہیں۔ امام حسین ﷛ ۷۲ افراد کی قلیل تعداد لے کر یزید جس نے اپنے والد امیر معاویہ ﷛ کی وفات کے بعد خلافت کا منصب سنبھالا تھا، کی بھاری فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے تھے، آپؓ نے اُن کو متنبہ کر دیا تھا۔ اے میرے ساتھیو! اس مہم کا نتیجہ ہم سب کا شہید ہونا ہے، چنانچہ جب وہ کربلا پہنچے، تو سامنا بھاری تعداد کا تھا اور آپ کی پیش گوئی عین درست ثابت ہوئی۔ چاروں طرف سے گھیراؤ کر لیا گیا، کھانا پینا ہر طرف سے بند کر دیا گیا۔ اور کافی دنوں کے محاصرہ کے بعد بالآخر سب ۷۲ ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا، اِن سب شہدا کی لاشوں کو کئی روز تپتی ریت پر پڑی رہنے دیا گیا۔ پھر آپؓ کا سر مبارک بڑے کروفر سے یزید کے دربار میں دمشق میں پیش کیا گیا۔ اِس واقعہ میں صرف آپؓ کے واحد فرزند (مشیتِ ایزدی سے) علی زین العابدین (جو حضرت علی ﷛، امام حسن ﷛، امام حسین ﷛ کے بعد چوتھے شیعی امام ہیں) زندہ بچ سکے۔ جن کو بھی یزید کے سامنے پیش کیا گیا تھا، لیکن اُس نے آپ کو مدینہ واپس بھیج دیا۔

Marfat.com

کربلا کا یہ واقعہ جو اِسلامی قمری سال کے ماہِ محرم کی دس تاریخ جسے ''یومِ عاشورہ'' کہا جاتا ہے، کے روز پیش آیا۔ جو اہلِ تشیع ہر سال بڑی عاجزی اور عبادات کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس موقع پر ''تعزیہ'' کے ساتھ جلوسوں کی شکل میں نوحہ خوانی اور ماتم کیا جاتا ہے۔ لیکن لبنان اور برصغیر ہندو پاکستان میں یہ جلوس ''شبیہ'' کی شکل میں بھی نکالے جاتے ہیں۔ جبکہ سعودی عرب میں ایسے جلوسوں کا نکالنا ممنوع ہے۔ جبکہ بیروت میں بھی فرقہ وارانہ فسادات سے بچنے کے لیے ۱۹۷۰ء تک شہری آبادیوں سے باہر ایسے جلوسوں کی اجازت نہ تھی۔ لیکن ۱۹۷۰ء میں جب بیروت میں اِن جلوسوں کی اجازت دی گئی، تو ''یومِ عاشورہ'' پر سیاسی تقاریر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ ماضی میں کئی صدیاں مشرقِ وسطیٰ میں شیعیت ایک خاموش اور ماتحت درجہ کی آبادی شمار کی جاتی تھی، حالیہ سالوں میں ''یومِ عاشورہ'' ایک انقلابی نعرہ کی شکل اختیار کر گیا ہے، اور وسیع پیمانہ پر شیعیت کے پیروکاروں میں تین خلفائے راشدینؓ کو غاصب قرار دیتے ہوئے اُن حکومتوں کے خلاف انقلاب اور بغاوت تک کی دعوت دینا اپنا عقیدہ قرار دیتے ہیں۔ ماضی میں ''یومِ عاشورہ'' خفیہ طور پر اہلِ سنت کے خلاف تعصب کا مظہر تھا۔ اب اعلانیہ اُس کا اظہار ہے۔

''یومِ عاشورہ'' کے حالیہ سالانہ جلوسوں اور اُن میں شیعی علماء کی مذہبی تقاریر کے ساتھ سیاسی تقاریر اُن میں سیاسی بیداری کا باعث ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم عصر شیعہ لیڈروں نے امام حسینؓ کی شہادت کو بے مثال جرأت و بہادری کی مثال قرار دے کر اہلِ تشیع کو ہر طرح کی قربانی دینے پر اُبھارا ہے، کہ یہ اُن کی وراثت ہے۔

یہاں ایک معروف ماہرِ نفسیات کلفورڈ گرٹز Clifford Geertz کی اِس مسئلہ میں رائے بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ حقیقی معنوں میں ایک معرکہ خیز رسم عوام کے دلوں میں ایسی رُوح بیدار کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف وسیع پیمانہ پر ایک تحریک پیدا کرتی ہے۔ وہاں ایک رُوحانی فکر بھی۔ پھر یہ دن شیعوں کی رُوحانی بیداری کو نتیجہ خیز بناتا ہے۔ رسمِ عاشورہ جو شیعوں میں رُوحانی بیداری پیدا کرنے کا باعث ہے اُسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک وہ طبقہ ہے، جس میں ایک بدعنوان اور جابر اور ظالم طبقہ حکومت کی کرسی پر براجمان ہوتا ہے اور اپنے

Marfat.com

ظلم و جبر کی حکومت کے ڈنکے بجاتا ہے اور دوسرا وہ مظلوم اور محرومیت کا شکار طبقہ ہے، جو اپنی قربانیوں، دلیری اور تکالیف کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرتا نظر آتا ہے۔ یہ صرف قصہ ماضی نہیں، بلکہ ہر دور اِس کی یاد دہانی کراتا ہے، اور یہی آج کی صورتِ حال ہے۔

جناب موسیٰ الصدر کی ذہین شخصیت اِسی واقعہ کی یاد دہانی کراتی ہے، وہ ''یومِ عاشورہ'' کے معروف واقعہ کو جدید سیاسی معنی قرار دیکر اسلام کو ایک نیا سیاسی منشور سے متعارف کراتے ہیں، کہ ایک ایسا سبق جس نے جابر کی سجدہ ریزی سے انکار کیا۔ وہ ہمیشہ کیلئے سیاسی سرگرمیوں اور قربانیوں کا طلبگار ہے۔

اِسلامی ممالک اور شیعہ تحریکیں:

حالیہ شیعہ تحریکیں مثلاً لبنان میں ''عمل'' اور ''حزب اللہ'' کے بارے میں وسیع معنی میں اگر اِن کو ''اِسلامی تحریکیں'' نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آج کے دور میں معاشرتی اقتصادی وجوہات کی بنا پر دُنیا بھر میں یہ تحریکیں اپنا کام کررہی ہیں۔ جن میں حصہ لینے والے افراد اعلیٰ طبقہ کے مڈل کلاس کے افراد سے لے کر ادنیٰ درجہ کے مڈل کلاس کے افراد شامل ہیں۔ جو ملکوں کی قسمتیں بدل سکتی ہیں۔ لیکن اِس میں بڑی رکاوٹ بدعنوان اور غیر نمائندہ سرکاری بیوروکریسی ہے۔

حقیقی اسلام، جس میں ''نوکر شاہی'' کی کوئی گنجائش نہیں، اور نہ ہی کسی کے آگے جھکنے اور جھوٹی مفاہمت کے لیے کبھی تیار۔ بقائے باہمی کے اصول کا علمبردار ہے، اور اِس سے ہٹ کر جو مسلمان کوئی دیگر رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ ماسوائے اِسلامی ناموں کے دُشمنانِ اِسلام ہیں، جبکہ مصر میں ایسے مسلمان ''مرتد'' قرار دیئے گئے ہیں۔ اہلِ تشیع میں بھی یہی اصول کارفرما ہے، لیکن اِس کی باگ ڈور شیعی علماء کے ہاتھوں میں ہے، جبکہ سنی مسلمانوں کی سیاست میں سنی علماء کا کردار بہت کم ہے اور بھاری اکثریت اُن کے خلاف نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ اُن میں بیشتر حکمرانوں کے ایجنٹ قرار دیئے جاتے ہیں۔ البتہ اُن کی بہت سی جماعتوں پر مذہبی طبقہ بھی بڑا اثر رکھتا ہے۔ لیکن شیعیت کی سیاست تمام تر شیعی علماء کے ہاتھوں میں ہے۔

شیعیت میں سیاسی نظریہ کی تجدید:

پیشتر اِس کے کہ اِس بارے میں اہلِ تشیع کا نقطہ نظر پیش کیا جائے، اولاً اِس بارے

Marfat.com

میں اہلِ سنت کا مختصراً نقطہ نظر یہ بیان کیا جاتا ہے۔ اہلِ سنت کا یہ مسلمہ ایمان ہے، کہ پیغمبر آخرالزمان ﷺ کی وفات کے بعد وحیِ الٰہی کا سلسلہ تا قیامت بند ہو گیا ہے۔ جبکہ ''اجتہاد'' کے دروازے بھی دسویں صدی عیسوی میں بند ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اِس کے بعد سے سنی علماء شرعی قوانین میں مزید کسی ردو بدل کو روا نہیں رکھتے، لیکن اِس کے برخلاف اہلِ تشیع اِس نظریہ کو بالکل مسترد کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ ہر دور کے لیے ایک ''امام'' کا ہونا لازمی امر ہے۔ جو اُس دور کے مطابق قرآنِ کریم کے احکامات کی تعبیر و تشریح کرے۔ اِس تشریح کے مطابق اگرچہ تا قیامت اب ایک ہی امام ہیں اور وہ ''امام غائب'' ہیں، چنانچہ اب یہ تعبیر و تشریح شیعی علماء کے ہاتھوں میں ہے اور ایسے عالم کو ''مجتہد'' کا درجہ حاصل ہے۔

اِسلام میں کسی ایک خاص فرقہ کا رُکن ہونا ضروری نہیں کہ وہ کوئی جماعت قائم کرے۔ چنانچہ بعض جماعتوں کے قائدین بڑے پاکیزہ اخلاق کے مالک ہوتے ہیں اور بعض نمائشی اور منافقت کا سہارا لے کر اپنی لیڈری چمکاتے ہیں، لیکن زیادہ تر جماعتیں اول الذکر کردار کے لیڈر ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ لیڈر ایک خاص موضوع کو اپنی لیڈر شپ کا سرچشمہ قرار دے کر اپنے گرد افراد کا گروہ جمع کرتے ہیں۔ شیعہ اور سنی دونوں مسلکوں کے پیروکاروں میں حتیٰ کہ جہاں مسلمان مملکتوں کی حکومتیں آزادانہ طور پر سیاسی طرزِ عمل محدود کر دیتی ہیں' وہاں بھی اِسلامی ادارے سرگرمیوں کے مراکز کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ مراکز زیادہ تر مساجد میں قائم ہوتے ہیں، جہاں حکومتیں ہاتھ نہیں ڈال سکتیں۔

اہلِ تشیع مسلمانوں میں ''حسینیہ'' نام سے سیاسی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اہم اجتماعی مراکز ہیں۔ جو ''یومِ عاشورہ'' منانے کی خاطر خاص طور پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ جہاں مذہبی تقاریب اور سیاسی اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں۔

مجھے بھی ایک مرتبہ لبنان میں ۱۹۸۰ء میں ایک قصبہ کے ''حسینیہ'' مرکز میں ''شہدائے کربلا'' کی یاد میں ایک تقریب میں شرکت کا موقعہ ملا۔ اِس تقریب کو ''ذِکر'' کا نام دیا گیا، جس میں

Marfat.com

مذہبی اور سیاسی تقاریر دونوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مقررین زیادہ تر نوآموز تھے۔ جبکہ یہ تقریب ایک ڈرامائی انداز کی تھی۔ جس میں بعض ''شہدائے کربلا'' کے لباس میں تھے اور بعض یزیدی لشکر کے لباس میں، اور جو مقررین شیعی لباس میں تھے، وہ ڈرامائی انداز میں شہید ہوئے۔

حالیہ دور کی سنی سیاسی تحریکوں میں تحریک کے لیڈر کا مذہبی رہنما ضروری نہیں۔ لیکن اِس کے مقابلہ میں شیعہ مسلک کی سیاسی تحریکوں کی باگ ڈور کسی مذہبی عالم کے ہاتھ میں ہی ہو سکتی ہے۔ اِس طرح دونوں مسالک کی تحریکوں میں امتیاز کرنا مشکل نہیں۔ کیونکہ شیعیت میں صرف ایک ''مجتہد'' کو ہی یہ خصوصیت حاصل ہے۔ جو ''فقیہ'' بھی ہے۔ چنانچہ شیعیت میں اگر کوئی شیعہ ''مجتہد'' کا درجہ حاصل کر لے، اُسے بُرا بھلا کہنا ممکن نہیں۔

یوں تو جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ سنی علما کے مقابلہ میں شیعی علماء جن کو ''مجتہد'' قرار دیا جاتا ہے۔ فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایران جو غالب شیعی ملک ہے، میں شیعی علماء کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ معاشرہ پر اِن کی بالادستی محض ''اجتہاد'' کی مرہون نہیں، بلکہ ریاستی کنٹرول کے خلاف مالی آمدنی کا حصول اِسلام میں ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر ادائیگی زکوٰۃ فرض ہے۔ لیکن ایران میں صرف ''مجتہدین'' ایسی سہولت سے محروم ہیں، وہاں صاحب نصاب افراد پر منحصر ہے کہ وہ از خود کسی مستحق اور محتاج کو زکوٰۃ دیں، یا عرب ممالک کے ''شیعہ'' مجتہدین سیاست کے حکم کے ذریعہ۔ مزید برآں اگر 100% نہیں، تو بالخصوص محکمہ ''اوقاف'' ریاست کے دائرہ کار ہیں، جبکہ اِس کے برخلاف ایران میں اوقاف، خیراتی ادارے اور ایسے فاؤنڈیشن ''مُلّاؤں'' کے کنٹرول میں رہے ہیں۔ مثال کے طور پر عراق کی صدام حسین کی بعث پارٹی کی حکومت جس میں ہر ادارہ قومیا (Nationalise) لیا گیا تھا، سرمایہ دار شیعہ افراد کو اپنی زکوٰۃ حکومت کو دینی پڑتی تھی، اور یہی معاملہ شیعہ مڈل کلاس کے ساتھ تھا، جس وجہ سے عراق کے شیعہ علما اِس سہولت سے محروم تھے اور محتاج شیعہ آبادی بھی غربت کا شکار تھی۔

اِس وقت اہلِ تشیع میں جو سیاسی سرگرمیاں قدم آگے بڑھا رہی ہیں، اُن میں اہم کردار شیعہ علماء کا ہے۔ جن کی جڑیں عراق میں بالخصوص شہر نجف میں ہیں۔ جہاں اُس کے شہر

Marfat.com

کربلا کے اُس وقت کے بے آب وگیاہ میدان میں شہادت امام حسینؓ بمعہ اپنے ۲۷ رفقا کی المناک شہادت کا تاریخ ساز واقعہ پیش آیا، اور حالیہ سیاسی سرگرمیوں کو جاری کرنے کے لیے اِسی شہر میں ۱۹۶۰ء میں معروف شیعی علماء جمع ہوئے اور مستقبل کے لیے سیاسی لائحہ عمل بھی تیار ہوا۔ البتہ اِس سلسلہ میں بعض نے اختلاف بھی کیا، جن میں آیت اللہ ابوالقاسم الخوئی معروف ہیں۔ وہ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۹۳ سال کی طویل عمر پا کر ۱۹۹۳ء میں فوت ہوئے اور نجف کے ہی شیعہ ممتاز آیت اللہ عالمِ دین تھے۔ اُن کو سیاسی محاذ آرائی سے اختلاف تھا، اور کہنا تھا کہ ہمیں صرف خیر کے کاموں مثلاً یتیموں کی خیر و بہبود اور دیگر ایسے کاموں میں حصہ لینا چاہیے لیکن آیت اللہ خمینی جو اِسی اجلاس میں شامل تھے، انہوں نے ''ولایت الفقیہ'' کی اصطلاح استعمال کی۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، ۶۰ء کے عشرے میں ''نجف'' جو شیعہ تحریکوں کا مرکز ہے اور اِسی عشرے میں آیت اللہ خمینی سمیت کئی دیگر آیت اللہ حضرات نے سیاسی تحریکوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن میں ایک آیت اللہ محسن الحاکم تھے۔ جن کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا۔ وہ جبل العامل کے باشندے تھے، جو عرب شیعیت کا مرکز ہے۔ اُن کے چار بیٹے تھے اور چاروں ہی سرگرم سیاسی شخصیتیں تھیں، جن میں سے تین کو صدام حسین کی کمیونسٹ بعثی حکومت نے سزائے موت دی اور چوتھا جس نے سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں پناہ لی تھی اور ایران میں رضا شاہ کے خلاف بھی اپوزیشن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ اُن کو بھی صدام حسین نے اپنے ایک ایجنٹ کے ذریعہ قتل کرا دیا۔

آیت اللہ محسن الحاکم کے علاوہ عراق میں دوسرے شیعی سیاسی لیڈر محمد باقر الصدر تھے۔ جبکہ ۱۹۶۵ء میں آیت اللہ خمینی بھی رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خلاف، صدام حسین کی بعثی حکومت کے خلاف اِن کے ساتھ آ شامل ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے ایک اِسلامی حکومت کے قیام اور اُس خصائص و فرائض کے بارے میں سلسلۂ تقاریر شروع کیا۔ دوسرے علماء باقر الصدر کے پیدائشی ایرانی عم زاد موسیٰ الصدر محمدؒ مہدی شمس الدین، اور محمد

Marfat.com

حسین فضل اللہ تھے اور یہ سب لبنان میں بعدازاں شیعی سیاسی رہنما ہو گئے بالخصوص سیاسی تحریک حزب اللہ۔ محمد باقر الصدر جن کو اُن کے معتقدین امام خمینی کے ہم پلّہ قرار دیتے ہیں۔ شیعیت کے بارے میں اُن کا مطالعہ شیعی تصانیف کے حوالے سے بہت وسیع ہے، جس وجہ سے اہلِ تشیع کا اہلِ علم طبقہ اُن کا بڑا احترام کرتا ہے، جس نے اُن میں انقلاب کی رُوح پھونکی، جبکہ امام خمینی کی شخصیت اُمید و کامیابی ہے۔ اِس مضمون کے مقالہ نگار ''رچرڈ نورٹن'' کا کہنا ہے کہ جب اُنہوں نے لبنان میں باقر الصدر اور امام خمینی کے تقابل میں اِس ملک کے شیعہ علماء سے سوالات کیے۔ تو اُن کا جواب ہوتا تھا کہ گو وہ امام خمینی کو عزت و احترام کا درجہ دیتے ہیں، لیکن باقر الصدر کا ''الدعوۃ'' اور ''المجاہدین'' جیسی تحریکوں کو جنم دینا امام خمینی کے کردار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لیکن وہ ایک حقیقی اِسلامی ریاست کا نقشہ نہیں پیش کر سکے۔

اِن معروف شیعی علماء کے علاوہ چند دیگر نوجوان نجف میں ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۰ء کے عرصہ میں تعلیم و تربیت پا کر لبنان چلے آئے، جن کے نام راغب حرب، حسن نصر اللہ، ابراہیم الامین، عباس موسوی اور صبحی طفیلی قابلِ ذکر ہیں۔ افراد کئی رشتہ دار یا شادی کی وجہ سے نجف سے ہجرت کر کے لبنان آ بسے۔ مثلاً ایک آیت اللہ کے سب سے چھوٹے فرزند کی والدہ جنوبی لبنان کے ایک قصبہ ''بنتِ جبل'' کے البازی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔ فضل اللہ کی والدہ لبنان کے ممبر پارلیمنٹ علی البازی کی ہمشیرہ تھی۔ موسیٰ الصدر نے باقر الصدر کی ہمشیرہ سے شادی کی۔ جبکہ آپ کی ہمشیرہ نے لبنان کے مشہور شہر طائر کے شرف الدین خاندان میں شادی کی۔

موسیٰ الصدر کی شخصیت:

ماڈرن مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں موسیٰ الصدر کی ایسی انقلاب انگیز شخصیت ہے، جو ایک بڑی نمایاں اور دل کش سیاسی شخصیت کے طور پر پردۂ سیاست پر اُبھری۔ اگر لبنانی شیعہ باقر الصدر کی ذہانت کے معترف نظر آتے ہیں اور خمینی کی جُرأت و دلیری کے تو اِس کے ساتھ وہ

Marfat.com

موسیٰ الصدر کے لیے اپنے دلوں میں خاص جگہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ بذریعہ سیاست اقتدار کے خواہش مند تھے لیکن اِس کے ساتھ صبر وحوصلہ سے بھی کام لینے والے تھے۔ یہ دوطرفہ کردار لبنان کی شیعہ آبادی میں گوناگوں اثرات کا باعث ہوا ہے۔ ایک طرف وہ آپ کے معتقدین ہیں، جو آپ کو بے حد دُوراندیش، سیاسی رہنما اور بے غرض نمونہ محبت قرار دیتے ہیں، جبکہ مخالفین ذہانت کے معترف ہوتے ہوئے معاشرہ میں ایک ایسا مکار اور سازشی ذہن کا مالک قرار دیتے ہیں، جو اقتدار کا حریص ہونے کے ساتھ سیاسی طور پر بُزدل، مخالفین اُن کو طویل القامت ہونے کی وجہ سے کہ اُن کا قد چھ فُٹ سے زائد تھا، اُن کو ''بھگوڑا'' ہونے کا طعنہ دیتے ہیں کہ وہ ۱۹۷۸ء سے لاپتہ ہیں۔ جبکہ اُن کے لبنان میں اُن کے معتقد اُن کو ایسا شجاع اور دلیر قرار دیتے ہیں جو اپنے دُشمن کے تعاقب میں ہیں۔

وہ ۱۹۲۸ء میں ایران کے مشہور شیعی شہر ''قُم'' میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام صدر الدین صدر ہے جو معروف شیعی مجتہد تھے۔ اُنہوں نے پرائمری اور سیکنڈری ابتدائی تعلیم ''قُم'' میں ہی حاصل کی۔ آئندہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تہران آ گئے، جہاں اولاً ایک سکول سے میٹرک پاس کیا اور بعدازاں تہران یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جو ایران میں ایک مجتہد کی ڈگری کے مساوی ہے۔ وہ ایک مذہبی عالم کا کردار اپنانا نہ چاہتے تھے اور اِس کی بجائے کوئی دیگر اعلیٰ شعبہ اپنانے کے خواہش مند تھے۔ لیکن والد کے اصرار پر اپنا ارادہ ختم کر دیا، اور اِسی یونیورسٹی میں ''فقہ'' کے شعبہ میں تعلیم جاری رکھنے کو ترجیح دی۔ ۱۹۵۳ء میں والد انتقال کر گئے، اِس کے بعد ''نجف'' (عراق) آ گئے اور یہاں آیت اللہ محسن الحاکم اور آیت اللہ عبدالقاسم خُوئی جیسے معروف شیعی علماء کے ہاں درس تلمذ حاصل کیا۔

۱۹۵۷ء میں آپ پہلی مرتبہ اپنے آبائی وطن لبنان آئے، اور لبنان کی عام شیعہ آبادی کے علاوہ جنوبی لبنان کے شہر طائر کے اپنے ایک عزیز شیعی عالم عبدالحسین شرف الدین کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں جلد ہی امام شرف الدین انتقال کر گئے اور ایسے ہی طائر کے

Marfat.com

عوام نے آپ کو اُن کی جگہ لینے کے لیے طائر بلایا۔ اولاً تو آپ نے معذرت کا اظہار کیا۔ لیکن بعدازاں اپنے اُستاد آیت اللہ السید محسن الحاکم کے اصرار پر آپ ۱۹۶۰ء میں طائر منتقل ہو گئے۔ جس کے بعد آپ کو آزادی سے اپنے سیاسی اور مذہبی اثرات بڑھانے کا موقعہ مل گیا۔ لیکن ابھی ضرورت تھی کہ نئے ملک کے سیاسی اور مذہبی ماحول کو پوری طرح سمجھ سکیں جو دونوں شعبوں کے مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا، عدم تحفظ اور غیر یقینی صورتِ حال کا شکار۔ چنانچہ آپ نے گروہ بندی کو مٹانے پر زور دیا جو کہ آپ کی ذہانتِ طبع سے مرصع تھی۔ اِس سلسلہ میں اولاً آپ نے طائر کے قریب قصبہ ''برج الشمالی'' میں ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ جو شیعہ نوجوانوں کے لیے ایک ایسی علمی تربیت گاہ تھی جو تربیت پا کر معاشرہ میں اپنا کوئی کردار ادا کر سکیں۔ اِس ادارہ کے قیام پر کوئی ۱۶۳,۰۰۰ امریکی ڈالر کے قریب لاگت آئی، جس میں مخیّر شیعہ حضرات، لبنان کی وزارتِ تعلیم اور بنک قرضہ جات حصہ ہیں۔ یہ ادارہ ابھی تک قائم ہے، جو موسیٰ الصدر کی قابلِ قدر لیڈرشپ کا اہم نمونہ ہے۔ جس میں پانچ صد سے زائد یتیم شیعہ بچے تعلیم و تربیت پا کر اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں اور اُنکے لاپتہ ہونے کے بعد آپکی ہمشیرہ رباب اِس بڑے ادارہ کی نگرانِ اعلیٰ ہیں۔

آپ اعلیٰ ذہانت اور دُور اندیشی کے ساتھ انتہائی پُرکشش شخصیت کے حامل اور قوتِ بکار کے مالک تھے۔ اُن کے ایک سابق معاون نے مجھے بتایا کہ آپ اکثر اوقات بغیر کسی آرام چوبیس گھنٹہ کام کرتے تھے۔ جبکہ آپ کا وسیع دائرہ کار مغربی افریقہ تک پھیلا ہوا تھا، جہاں کے اکثر شیعہ تاجر اور دولت مند اِس ادارہ میں آپ سے ملتے اور مالی معاونت کرتے۔ یہ لوگ موسیٰ الصدر کی شخصیت میں ایک ایسا انسان محسوس کرتے تھے، جو اُن کے اندر خودداری اور عزتِ نفس پیدا کرنے کے ساتھ ماضی کے دُور دراز کار نظام کا نجات دہندہ ہے۔ انگریزی میں اُن کی شخصیت پر "Chrisma" کا صادق آتا ہے، جس کا اُردو ترجمہ ''صاحبِ کرامات'' ہو سکتا ہے۔ جبکہ اِس لفظ کی اہمیت لبنان سے کہیں دُور ''قُم'' اور ''نجف'' تک جا ملتی ہے۔

جیسا کہ آپ کو آپ کے معتقدین اور پیروکار اِمام موسیٰ کا نام دیتے ہیں۔ جہاں لبنان

Marfat.com

کی شیعہ آبادی کو آپ کی شخصیت میں ایک اہم لیڈر ملا۔ وہاں آپ نے اُن کو غربت اور افلاس کے احساس سے نجات دلائی اور لبنان کے مالدار شیعہ جو اپنے آپ کو وہاں کے ''زعیم'' ہونے پر فخر کرتے تھے اور عام شیعہ احساسِ کمتری کا شکار تھے، اِس فرق کو ختم کر کے نئی نوجوان شیعہ نسل میں لیڈر شپ نے احساس کو اُبھارا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ موسیٰ الصدر کی لبنان آمد سے قبل اِس ملک کی شیعہ آبادی ۱۹۶۰ء کے عشرے میں شہروں میں اقتصادی اور معاشرتی بدحالی کا شکار ہونے کے علاوہ دیہاتی شیعہ آبادی روایتی غلط نظام کی وجہ سے کہیں زیادہ بدحالی کا شکار تھی۔ مشرقِ وسطیٰ بلکہ اِسلامی ممالک میں جو لوگ اِسلامی اقدار کے مالک ہیں۔ وہ از خود بلا تصور فخر و غرور غربا پروری کرتے ہیں لیکن جو لوگ کہنے کو مسلمان لیکن فطرتاً مغرور ہیں، وہ نہ صرف غربا پروری کے منکر ہیں، بلکہ اپنے عوام مسلمان بھائیوں پر اپنی دولت کا رُعب جماتے ہیں، لبنان کے مالدار شیعہ اِسی حالت میں تھے۔

جن دنوں میں موسیٰ الصدر لبنان میں تھے، اُن دنوں آپ کے مقابلہ میں ایک اور شیعہ عالم عماد مغنیہ کی شخصیت بطور ''مجتہد'' معروف تھی۔ مضمون نگار کی رائے میں لبنان کے بعض شیعہ حضرات موسیٰ الصدر کے مقابلے میں عماد مغنیہ کو اعلیٰ مقام دیتے ہیں۔ جو ''جبل عامل'' کے باشندہ ہیں۔ لیکن موسیٰ الصدر کی تقرری نے لبنان کی شیعہ تاریخ کا رُخ موڑ دیا اور ۱۹۷۸ء میں لاپتہ ہونے تک آپ نے اپنے محسنوں اور مخالفوں دونوں سے کوئی تصادم اور بگاڑ کی راہ نہ پیدا کی۔ حتیٰ کہ شیعہ ''اعیان'' اور ''زعما'' جن کو آپ عوامی مفادات کا دُشمن قرار دیتے تھے، اُن کے خلاف بھی عوام کو نہیں اُبھارا۔ البتہ اُن سے اپنے اختلاف کو نہیں چھپایا۔

اُن کی نظریں دیہاتی آبادیوں میں اور اُن سے دُور بھی تھیں، اور کوشش تھی کہ یہ لوگ قبائلی جھگڑوں میں نہ اُلجھیں۔ وہ مخالفین کے ظلم وستم کو ذرا بھی خاطر میں نہ لانے والے شخص تھے۔ بلکہ ظالموں کے آگے ذرا نہ جھکنے والے ہو کر عوام میں ایک جذبۂ جرأت پیدا کرنے والے تھے۔ چنانچہ آپ نے تنظیمی صلاحیتوں، اپنی تقاریر اور عزم وصبر کا نمونہ بن کر لبنان کے شیعوں کو ایک علیحدہ تشخص کا مرتبہ دیا۔ مزید برآں اپنے پیروکاروں میں رُوح بخشی،

Marfat.com

کہ وہ جذبۂ محرومیت مٹا کر ہر حالت میں اپنا دینی جذبہ قائم رکھیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر آپ نے کہا کہ:

"ایک معاشرہ میں جب ایک محروم وغریب ایک انقلاب برپا کرنے کا تہیہ کرے، یہ اِس امر کا اظہار ہے کہ ناانصافی قائم نہیں رہ سکتی۔"

وہ یہ تسلیم کرتے تھے، کہ اُن کی قوت تبھی زور پکڑ سکتی ہے، جب وہ مذہبی اقدار کا نمونہ بن کر دکھائیں۔ جس میں وہ اکثر شیعی داستانوں کا سہارا لیتے تھے۔ بالخصوص کوئی تیرہ صدی کے قریب قبل کربلا میں امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ۔ جو آپ اپنے پیروکاروں کو یاد دلاتے تھے۔

۱۹۷۴ء میں "عاشورہ" کے روز ایک مجمع کو امام حسینؓ کی شہادت کے واقعہ یاد دلاتے ہوئے خطاب کیا۔

"انقلاب کربلا کے ریگستان میں نہیں مرا، بلکہ عالمِ اسلام میں ابدالآباد تک کے لیے جاری رہنے کے لیے واقعہ ہوا۔ جو نسل در نسل آج تک جاری ہے۔ یہ ایک خزینہ ہے، جو ہمارے پاس ہے۔ تاکہ ہم اُس سے نفع مند ہوں۔ اُس سے نیا ذریعہ اصلاح معلوم کریں۔ ایک ایسی نئی تحریک، ایک ایسا انقلاب کہ ہم اندھیروں کو دُور کر سکیں۔ ظلم وستم کو مٹا سکیں، اور برائیوں کو مفلوج کر سکیں۔"

اِس کے ساتھ آپ نے لکھا:

"اے میرے بھائیو! اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں، ایک راہِ حق اور دوسری راہِ باطل۔ راہِ حق امام حسینؓ کا راستہ ہے۔ میرا یقین ہے کہ تم سوائے راہِ حق راہِ امام حسینؓ جو باطل کے آگے نہ جھکنے والی راہ ہے، جس میں شہادت مقدر ہے۔ وہ اپنا کر ناانصافی اور ظلم وتشدد کو مٹاؤ گے۔"

آپ کا اندازِ سیاست:

اِس میدان میں آپ کسی قسم کے اپنی فکر کے مطابق نفع ونقصان کی پرواہ نہیں کرتے

Marfat.com

تھے۔ جہاں جہاں آپ نے سیاسی اتحاد کیے، اُن سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ایک عملی سوچ وفکر کے مالک تھے۔ جو آپ کو لبنان کی تاریخ میں ایسا خراجِ تحسین ہے کہ کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آئندہ آپ کا کیا اقدام ہوگا۔ باوثوق ذرائع کی معلومات ہیں، کہ آپ کے اُردن کے شاہ حسین اور مصر کے صدر سادات سے بھی تعلقات تھے، اور اکثر دُنیائے عرب اور یورپی ممالک کا سفر کرتے رہتے تھے، اِس لحاظ سے آپ ایک عالمی سیاسی لیڈر تھے۔

آج اُن کے پیروکار آپ کو شہنشاہِ ایران کے خلاف سخت نقاد شمار کرتے ہیں۔ اُس کے خلاف آپ نے یہ پالیسی تب اختیار کی، جب اُس نے ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کی حمایت کی، جس بنا پر آپ ۱۹۷۳ء کے موسمِ خزاں کے بعد شہنشاہ کے سخت مخالف ہو گئے اور اُسے سیاسی اختلاف کے ساتھ مذہب دُشمن بھی قرار دیا اور اسرائیل نواز ہونے کے ساتھ یورپی، سامراجی، حاشیہ بردار قرار دیا۔ جیسے ہی آپ نے شہنشاہ دُشمنی کا اظہار کیا۔ ایرانی حکوم نے آپ کی ایرانی شہریت ختم کر دی۔ جس وجہ سے آپ نے عراقی حکومت سے اپنے تعلقات مستحکم کیے۔ جس وجہ سے ممکن ہے، کہ اُس حکومت سے مالی امداد بھی ملتی ہو۔ البتہ شہنشاہ کی اسرائیل دوستی سے قبل آپ اُس سے بہت قریب تھے اور دونوں کے درمیان اتنے مضبوط روابط تھے کہ صدی کے چھٹے عشرے کے درمیان جب آپ تہران آتے تھے، تو آپ کا شاہانہ استقبال کیا جاتا تھا اور شاہ نہ صرف آپ کی مالی اعانت کرتا تھا۔ بلکہ عراق میں آپ کے عمزاد محمد باقر الصدر کی بھی۔ پہلی صورت میں وہ آپ کے ذریعہ لبنان کی حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات استوار رکھنا چاہتا تھا، جبکہ دوسری صورت میں وہ عراق کی بعث پارٹی کی حکومت کو مشکلات میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

آپ شاہ دُشمن آیت اللہ خمینی کے بھی زبردست حمایتی تھے۔ جس کی مثال پیرس کے مشہور روزنامہ "لی مانڈ" کی ۲۳ راگست ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں آپ کا انٹرویو ہے، جس میں شاہ کی بڑی مذمت کی گئی ہے اور آیت اللہ خمینی کی بے حد تعریف۔ لیکن آپ امام خمینی کے مقابلہ میں شیعہ سنی اختلاف سے ہٹ کر بڑے اعتدال پسند اور باہمی اخوت کے علمبردار تھے۔ آپ تحریک احیائے اسلام کے دوسرے شیعہ علمبردار علی شریعتی (شہادت ۱۹۷۷) کے بڑے قریبی دوست

Marfat.com

تھے، اور اِس مغربی مضمون نگار کے مطابق علی شریعتی بھی اہل تشیع میں بڑے وسیع القلب اور آزاد منش مخلص مسلمان تھے، اِس طرح رضا شاہ پہلوی کی شہنشاہیت کی مخالفت میں نہ صرف عوام میں ایک تحریک کا جذبہ پیدا کیا بلکہ "مجاہدین خلق" کے نام سے ایران میں بادشاہ مخالف تنظیم قائم کی۔ ظاہر ہے کہ رضا شاہ کیونکر اِسے پسند کر سکتا تھا۔ جبکہ شاہ کے گرد خوشامدی گروہ نے علی شریعتی کو شیعہ دُشمن قرار دیا۔ جبکہ وہ شیعہ ہونے کے ساتھ شیعیت کو فرقہ بندی سے دُور رکھ کر تمام اُمتِ مسلمہ کو متحد کرنے کے علمبردار تھے۔

ایران میں خود اعتمادی کے ساتھ مغربی سامراج کے خلاف اور انسانی برادری کے فلسفہ پر مبنی علی شریعتی کا پیغام نے، جس میں زیادہ زور شہادتِ امام حسینؓ پر تھا، تعلیم یافتہ طبقہ کو بہت متاثر کیا۔ کہ اِس میں اُن کے لیے معاشرتی اقتصادی مسائل کا انقلابی حل بھی موجود تھا۔ علی شریعتی کی تحریریں اور تقریریں تعصب سے پاک صبر و عزیمت کا نمونہ تھیں۔ جبکہ شاہ کے خوشامدی ٹولہ کی شناخت ان کا اُلٹ تھی۔ بہت سے مبصرین کی یہ رائے ہے، کہ موسیٰ الصدر ایران کے انقلاب کو اعتدال کی راہ پر لا سکتے تھے، اگر وہ اِس ملک کو بھی اپنی سیاست میں شامل کر لیتے، تاہم اگرچہ ابتداءً آپ اپنے عم زاد محمد باقر الصدر جیسی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے، لیکن بعد ازاں جیسے جیسے آپ کی عمر میں پختگی آتی گئی، ویسے ویسے آپ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے گئے، اگر زندہ رہتے تو آیت اللہ خمینی کے خلاف مثبت صلاحیتوں کے مالک سخت حریف ہوتے۔

میرونی Maronits عیسائیوں کی مانند کثیر الآبادی سنی العقیدہ عالمِ عرب میں شیعہ بھی اقلیتی آبادی ہے۔ لیکن لبنان دونوں اقلیتوں کے لیے ایسی پناہ گاہ ہے، جہاں دونوں کو اپنے علیحدہ تشخص کے ساتھ تحفظ بھی حاصل ہے۔ ۷۶۔۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی سے قبل آپ کی لبنانی حکومت کو دھمکی کہ وہ غیر جانبدارانہ پالیسی اپنائے، موثر ثابت ہوئی۔ آپ نے لبنانی عیسائیوں کے جلسوں میں بھی بڑی موثر تقریریں کیں، جس وجہ سے وہ بھی آپ کے خاطر خواہ مداح ہو گئے۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے، کہ وہ پہلے شیعہ مجتہد ہیں، جنہوں نے لبنانی عیسائی پیشوا سے اُن کے ہاں جا کر ملاقات کی، جو لبنانی عیسائیوں کے لیے حیران کُن امر تھا، کہ موسیٰ الصدر کی شکل میں اُن

Marfat.com

کو ایک غیر متعصب اتحادی نصیب ہوا ہے۔ آپ ایک انقلابی ہونے کی بجائے ایک صلح جو مصلح Reformer تھے، اور لبنان میں شیعہ آبادی کی خیر و بہبود کے متلاشی تھے۔ آپ اکثر ذکر کرتے تھے "لبنان ہمارا خاص وطن ہے"۔

۱۹۷۴ء میں آپ نے ایک کتابچہ "تحریکِ محرومان" "Movement of the Deprives" کے عنوان سے شائع کیا۔ جس میں آپ نے زور دیا کہ یہ تحریک "قومی خود مختاری، نا قابلِ تقسیم مادرِ وطن کے ساتھ اُس کے وجود کے تحفظ" کے لیے ہے۔

آپ لبنان کے میرونی عیسائیوں کے عدم تحفظ کے معترف ہونے کے ساتھ اس امر کے خواہش مند تھے، کہ لبنانی حکومت کا صدر مستقلاً عیسائی ہونا چاہئے، لیکن اُن کے بارے میں اُن کی یہ شکایت بجا تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں بالخصوص شیعوں کے بارے میں تعصب کا شکار ہیں اور اِس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے تھے، کہ لبنان میں عیسائی اکثریت کی حکومتوں نے جنوبی لبنان کی شیعہ آبادی کو ہمیشہ اپنا تختۂ مشق بنائے رکھا ہے۔ جہاں اُن کی پچاس فیصد سے بھی زائد آبادی ہے۔ جبکہ قرآنِ حکیم کے مطابق اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا یہ حکم ہے:

"وہ شخص جس کا پڑوسی حتیٰ کہ غیر مسلم بھوکا سوئے اُسے مؤمن نہیں کہا جا سکتا۔"

موسیٰ الصدر سخت کمیونسٹ دُشمن تھے، نہ صرف اصولی طور پر بلکہ اِس وجہ سے بھی کمیونسٹ تنظیموں کو اپنا حریف قرار دیتے تھے، کہ یہ تنظیمیں اپنی تنظیموں میں شیعہ لوگوں کو بھرتی کرتے تھے۔ آپ دائیں بازو اور بائیں بازو دونوں کے سخت مخالف تھے، اور اِس بات پر زور تھا:

"ہماری راہ نہ دائیں ہے نہ بائیں، بلکہ صراطِ مستقیم ہے"

لیکن جب لبنان میں دو بعث پارٹیوں میں سے ایک عراق کی حامی تھی اور دوسری شام کی؛ اور اپنی تنظیموں میں علیحدہ علیحدہ شیعوں کو بھرتی کر رہی تھی تو آپ نے "صرف عرب" کا نعرہ لگایا۔

۷۶-۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی کے ابتدائی ایام میں "لبنان نیشنل موومنٹ" کے دروز Druze قبیلہ کے لیڈر کمالی جمبلات Kemal Jumbalat سے مل کر شیعہ تنظیم "حرکت

Marfat.com

المحرومین“ کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ جمبلات ایک غیر ذمہ دار اور شیعوں کا استحصال کرنے والا شخص تھا اور اس امر کو آپ اِسے نہ سمجھ پائے، کہ جمبلات کی عیسائیوں کے خلاف جنگ محض شیعوں کے سر پر لڑی جا رہی ہے اور بالآخر خانہ جنگی کے خاتمہ پر جمبلات اور اس خانہ جنگی کے بارے میں یہ الفاظ کہے:

”اگر وہ جمبلات کا ساتھ نہ دیتے، تو اِس خانہ جنگی کا خاتمہ دو ماہ میں ہو جاتا، صرف اُن کا ساتھ دینے کی وجہ سے یہ خانہ جنگی دو سال جاری رہی۔ اب اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اِس کے بُرے اثرات کب تک جاری رہیں گے۔“

یہ خانہ جنگی بالآخر شام کے صدر حافظ الاسد کی مداخلت پر ختم ہوئی، جب مئی ۱۹۷۶ء میں الاسد لبنانی عیسائیوں کی مدد پر آ گئے اور موسیٰ الصدر نے جمبلات اور اُس کے فلسطینی حمایتیوں (پی ایل او) کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اگرچہ بذاتِ خود آپ حافظ الاسد کے دوست ہونے کے ساتھ اُس پر اعتبار کرتے تھے، لیکن لبنان کی سیاست میں الاسد کا حصہ لینا ناگوار تھا۔ کیونکہ آپ کی یہ شک سے بالاتر رائے تھی کہ الاسد لبنان کو شام کا حصہ بنانا چاہتا ہے، جو اُنہیں کسی طرح قبول نہیں تھی اور اپنی جدوجہد سے لبنان کو جہاں شام کے محاصرہ سے محفوظ رکھا۔ وہاں اسرائیل کے خلاف فلسطین کا ساتھ دینے میں اپنی دُور اندیشی سے شام کو بطور ایک کارڈ استعمال کیا۔

اگرچہ آپ نے اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کے مقابلہ کی ہر طرح مدد کی۔ لیکن یاسر عرفات کی پی ایل او کے ساتھ تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء میں پی ایل اور لبنان کی فوج کے درمیان جو جھڑپیں ہوئی، آپ نے سنی مسلمانوں کی مذمت کی، جو پی ایل او گوریلا کی حمایت میں تھے، ایک طرف آپ پی ایل او پر نکتہ چینی کر رہے تھے، جو اسرائیلی علاقہ پر بمباری کر رہے تھے، جس کی وجہ سے اسرائیل مشتعل ہو کر جنوبی لبنان پر حملے کر رہا تھا، جہاں شیعہ آبادی تھی، جبکہ دوسری طرف لبنانی حکومت جنوبی لبنان میں اسرائیل کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ جس وجہ سے شیعہ آبادی کی مشکلات اور تکالیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف جہاں موسیٰ الصدر کی نظروں میں اسرائیل ایک ”بدترین“ شر ہے دُوسری طرف وہ یہ بھی خوب سمجھتے تھے

Marfat.com

کہ اُس کی فوجی قوت بھی بہت زیادہ ہے۔ اِس لحاظ سے آپ کا مقصد اسرائیل کی بربادی نہ تھا۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ اسرائیل ۱۹۴۹ء میں کی گئی اُس حد بندی کا احترام کرے، جو دونوں ملکوں کے درمیان اُس سال طے پائی تھی۔

پی ایل او کا دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا، کہ ۱۹۷۰ء میں اُسے اُردن میں جو شکست ہوئی تھی، اُس کے نتیجہ میں پی ایل او کے جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد جنوبی لبنان میں آبسی، جس نے خود لبنان کی آئینی وقانونی حکومت کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی، جس کا مطلب ''ریاست کے اندر ریاست'' کا قیام تھا۔ چنانچہ موسیٰ الصدر نے پی ایل او کو وارننگ دی کہ یہ اُس کے لیے نہ مناسب ہے اور نہ اُس کے مفاد میں۔ لیکن پی ایل او نے اِس کا کوئی اثر نہ لیا، حالانکہ یہ وارننگ اِس لیے تھی کہ شیعہ سنی میں کوئی افتراق نہ ہو اور دونوں متحد ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی قوت متحد رکھیں۔ لیکن پی ایل او نے اِس وارننگ کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس وجہ سے جو شیعہ پی ایل او کے اتحادی بن گئے تھے وہ نہ صرف اس سے علیحدہ ہو گئے بلکہ جو پی ایل او کی صفوں میں تھے، انہوں نے بھی اندر سے اس کے خلاف محاذ کھول دیا۔ اور بعد ازاں جب موسیٰ الصدر لاپتہ ہو گئے۔ نہ صرف ان جانبازوں نے آپ کی یاد میں پی ایل او اور اس کے لبنانی اتحادیوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی، بلکہ ۱۹۸۲ء میں جب اسرائیل کے ہاتھوں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تو کھل کر اسرائیل کو داد دی، جس سے اسرائیل کو موقعہ مل گیا کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھائے۔ بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں پی ایل او کے کیمپوں کا محاصرہ کرلیا اور حلف اُٹھایا کہ وہ اسے ریاست کے اندر ریاست کا موقعہ نہ دیں گے، جس پر پی ایل او کے قائدین نے موسیٰ الصدر کو امریکی ایجنٹ قرار دیا، حالانکہ ایسا نہ تھا، بلکہ خود پی ایل او غلط عزائم کی قصوروار تھی۔

موسیٰ الصدر کی بدترین مضبوط مخالف جنوبی لبنان کی شیعہ شخصیت کامل الاسد تھی۔ جو اُس کی ذات کے لیے مضبوط مخالف تھی اور اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ شمار کرتی تھی۔ جبکہ موسیٰ الصدر کی نظروں مین کامل الاسد کی شخصیت آپ کے اُس ''زعیم'' نظام کے خلاف تھی، جو آپ لانا چاہتے تھے۔

Marfat.com

۱۹۶۷ء میں لبنانی پارلیمنٹ نے سپریم اسلامک شیعہ کونسل (ایس آئی ایس سی) کے نام سے سنی مسلمانوں سے ہٹ کر ایک منظوری دی، جو لبنان میں پہلی مرتبہ شیعی اندرونی آزادی تھی، اِس کا اصل قیام ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا۔ جس کے موسیٰ الصدر عرصہ چھ سال کے لئے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے، جو اِس امر کا اظہار بھی تھا کہ وہ لبنان میں ایک غیر متنازعہ فیہ شیعہ عالمِ دین ہیں۔ مزید برآں اِس کونسل کی وساطت سے انہوں نے جنوبی لبنان میں شیعی اقلیت کے لیے فوجی، سماجی، اقتصادی، سیاسی سہولتوں، جن میں جنوبی لبنان کا دفاع بھی شامل تھا، ترقیاتی فنڈز کی فراہمی، ہسپتالوں اور سکولوں کی تعمیرات میں مزید بہتری اور حکومتی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر شیعوں کی تقرریوں جیسے مطالبات تھے۔ حکومت نے اُن پر پوری توجہ دینے کا یقین دلایا جس کی وجہ سے کونسل کو شیعہ آبادی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، جس وجہ سے نہ صرف آبادی کی مڈل کلاس مضبوط ہوئی۔ بلکہ ایک دانشور طبقہ بھی اُبھرا۔ لیکن کونسل کی تشکیل کا ایک سال ہوا تھا، اور شیعی آبادی ہر شعبہ میں ترقی کر رہی تھی کہ اسرائیل نے بمباریوں اور فوجی حملوں کے ذریعہ مداخلت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس بِنا پر موسیٰ الصدر نے اسرائیل کی اِن کارروائیوں کو فوجی خطرہ قرار دیتے ہوئے حکومت پر اِس خطرہ سے نبٹنے کے لیے زور دیا۔ جس کے نتیجہ میں حکومت نے جنوبی لبنان میں کونسل سے مل کر "مجلس الجنوب" قائم کی اور اِس کے لیے تین کروڑ لبنانی پاؤنڈز کی رقم عطا کی۔ لیکن بد قسمتی سے یہ مجلس اپنے مقاصد اور منصوبہ جات کی تکمیل کی بجائے بدعنوانیوں میں ملوث ہوگئی۔ یوں تو اِس مجلس کا قیام اور حکومت کی مالی امداد موسیٰ الصدر کی فتح تھی، لیکن کامل الاسد کے شرارتی ذہن نے اِس کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور اپنے ذہن کے مطابق اِس کو استعمال کرنا شروع کر دیا، اور ۱۹۷۰ء کے عشرے میں بڑی تیزی سے شیعی آبادی کے سماجی اور اقتصادی معاملات زوال پذیر ہونا شروع ہو گئے۔ حالانکہ کونسل شیعوں کے مفادات کی بڑی اہم جماعت خیال کی جاتی تھی، جیسا کہ موسیٰ الصدر نے اِس کی بِنا ڈالی تھی۔ کونسل ملیشیا اور غیر قانونی جماعتوں کے حامی ہونے کی وجہ سے اُس کے مقاصد غیر موثر ہوتے چلے گئے۔ تاہم ۱۷/ مارچ ۱۹۷۴ء جو "عاشورہ" الحرام الحرام کے بعد چہلم (اربعین) کا روز تھا۔ آپ نے

Marfat.com

وادیٔ بقاع کے شہر بعلبک میں ۷۵ ہزار افراد کے اجتماع کو اُس دن کو ''یوم المحرومین'' قرار دیتے ہوئے ''حرکت المحرومین'' (Movement of the Deprived) کا آغاز کیا جس میں اہلِ تشیع کے مصائب و مشکلات...... کہ نہ اُن کو تعلیمی سہولتیں مہیا ہیں اور نہ ہی سرکاری ملازمتوں کا ذکر کیا، اور قسم کھا کر اعلان کیا، کہ جب تک حکومت اُن کے مصائب و مشکلات کا ازالہ نہیں کرے گی وہ اُس کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ آپ نے مجمع کو یاد دلایا، کہ کوفہ کے منصف نے حضرت امام حسینؓ پر الزام لگایا تھا، کہ اُنہوں نے اپنے نانا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حاکمِ وقت کی فرمانبرداری کے فرمان کی خلاف ورزی کی تھی کہ وہ صرف ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت گزاری کرتے رہیں۔ جس کا آپؓ نے انکار کیا اور آج کے دور میں اُس کا جواب یہ ہے۔

> ''دور حاضر کے حکمرانوں کا یہ مطالبہ ہے، کہ مذہبی لوگ محض عبادت گزاری کریں اور دوسرے معاملات سیاست وغیرہ میں مداخلت نہ کریں۔ وہ اِس بات پر زور دیتے ہیں، کہ ہم روزے رکھا کریں اور اُن کے لیے دُعائیں کرتے رہا کریں کہ اُن کا اقتدار قائم و دائم رہے۔ جبکہ وہ خود دین سے دُور ہو گئے ہیں، اور عوام کا استحصال کرتے ہوئے اقتدار چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اے میرے بھائیو! مت خیال کرو، کہ وہ لوگ جو اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھ کر کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں، وہ کمیونزم کے دُشمن ہیں، ہرگز نہیں! یہ لوگ کافروں سے بڑھ کر کافر ہیں اور ملحدوں سے بڑھ کر ملحد، یہ لوگ چاہتے ہیں، کہ ہم اُن کے فرماں بردار بن کر رہیں، جو ہمیں قبول نہیں۔''

اِس کے صرف ایک سال بعد لبنان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور جولائی ۱۹۷۵ء میں یہ بات عام ہو گئی، کہ ''حرکت المحرومین'' نام سے ایک ملیشیا کا وجود عمل میں آ گیا ہے۔ ایک اور ملیشیا تنظیم ''افواج المقاومۃ البنانیہ'' جس کا دوسرا نام AMAL (اُمید) تھا، اُس کی تربیت پی ایل او کی فوجی تنظیم ''الفتح'' نے کی۔ ۷۶-۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی میں اِس کا کردار

Marfat.com

موثر رہا۔ اِن دنوں موسیٰ الصدر کی تحریک کا اِن کے ساتھ اتحاد قائم تھا۔لیکن یہ اتحاد اُس وقت ٹوٹ گیا، جب جون ۱۹۷۶ء میں لبنان کی مارونی عیسائی حکومت کو شکست سے بچانے کے لیے شام کی حکومت نے مداخلت کی۔

شام کی مداخلت سے چار ماہ قبل لبنان کے عیسائی صدر سلیمان فریخیہ نے ایک ''آئینی دستاویز'' منظور کی، اور موسیٰ الصدر نے بھی اُسے ایک سیاسی مصلحت قرار دے کر منظور کیا اِس دستاویز کی مَد سے طے پایا، کہ لبنانی پارلیمنٹ میں پارٹی نشستیں مذاہب کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہوں گی، جبکہ مارونی عیسائی لبنان کی حکومت کے صدر کے اختیارات بھی محدود ہوں گے۔ جس کے نتیجہ میں یہ محسوس ہوتا تھا، کہ لبنان نے اعتدال کی راہ کو اختیار کر لیا ہے، اور شام کی مداخلت کے بعد پی ایل او کو بھی کنٹرول کیا جا سکے گا۔لیکن بدقسمتی سے قتل وغارت کا عمل بدستور جاری رہا۔ یوں تو ۱۹۷۶ء کے خاتمہ تک اِس عمل میں قدرے کمی واقع ہوئی، لیکن تشدد کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔تا آنکہ ۱۹۸۹ء میں کوئی پندرہ سالہ خانہ جنگی کے خاتمہ کے بعد ''الطائف سمجھوتہ'' عمل میں آیا۔جس کی بنیادی دفعات کم وبیش وہی تھیں، جو ۱۹۷۶ء کے سمجھوتہ کی تھیں۔یعنی حقوق کے لحاظ سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی تفریق نہ ہوگی اور لبنان کی سیاست میں ملکی سالمیت برقرار رہے گی۔

اگرچہ لبنان میں شیعی آبادی اعشاریہ میں تھی، لیکن خانہ جنگی سے قبل لبنان کی سیاست میں موسیٰ الصدر کا اثر بلا مبالغہ شیعوں کے لیے کافی اہمیت اختیار کر گیا، اور لبنان کے ایک دانشور فواد اجمی نے موسیٰ الصدر کو ''امامِ غائب'' کے طور پر شیعی ہیرو قرار دیا۔

اِس کے علاوہ بھی لبنان کی سیاست میں متعدد سیاسی پارٹیاں اُبھر آئیں اور ہر پارٹی نے اپنی اپنی فوجی ملیشیا قائم کر لی اور ہر ایک کا اپنا اپنا علیحدہ جھنڈا۔موسیٰ الصدر کے شیعوں نے AMAL نام کی پارٹی سے ہٹ کر اپنی علیحدہ ملیشیا قائم کر لی۔جبکہ خانہ جنگی میں اِن کے انسانی نقصانات زیادہ تھے، جتنا اُس نے دیگر فرقوں کے لوگوں کو پہنچائے۔البتہ موسیٰ الصدر کو غالباً اِس میں جو کامیابی حاصل ہوئی، وہ یہ ہے، کہ اُن روایتی قسم کے شیعہ مُلاّؤں کا اثر ورسوخ کافی کم ہو

Marfat.com

گیا، جو خانہ جنگی سے قبل تھا اور اِن کو لبنان کی سیاست میں کوئی خاص اثر و رسوخ نہیں تھا۔

موسیٰ الصدر کی شخصیت جو کچھ بھی ہو، اور اپنی تقاریر میں جتنا بھی زورِ بیانی سے کام لیا ہو، فی الحقیقت وہ جنگی قسم کے انسان نہ تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ AMAL کے خلاف جو کردار ادا کیا، وہ ڈائریکٹ نہ تھا۔ جیسا کہ اِس خونریزی کو روکنے کے لیے آپ نے اعلان کیا، کہ سب پارٹیوں کی طرف سے اگر خونریزی بند کرنے کا اعلان نہ کیا گیا، تو وہ بھوک ہڑتال کریں گے۔ لیکن حکومت کی نا اہلیت، عوام کا غیض و غضب اور نا اُمیدی اور طالع آزما جنگ نوازوں کا اِس نے کوئی اثر نہ لیا اور آپ کا یہ اعلان محض اعلان بن کر رہ گیا اور لبنان میں قیامِ امن گہنا گیا۔ جس سے آپ کی شخصیت بھی متاثر ہوئی۔

امام الغائب:

طرفہ تماشہ ہے، کہ ۱۹۷۸ء میں آپ اچانک بلا کسی معلومات غائب ہو گئے۔ جس نے آپ کے وعدہ کو ہوا دی۔ یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے، کہ آپ اپنے دو ہمراہیوں شیخ محمد شاہ حدیث یعقوب اور ایک صحافی عباس بدرالدین کے ہمراہ ماہِ اگست میں لیبیا کے دورے پر نکلے۔ اُس وقت سے اِس پارٹی کے بارے میں کوئی علم نہیں، کہ اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، البتہ یہ امر یقینی نظر آتا ہے، کہ آپ کو لیبیا کے سابق صدر معمر قذافی کے کسی کارندے نے قتل کر دیا، جبکہ دوسرے دو افراد کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ کرنل قذافی کے عزائم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، آیا کہ اُس نے آپ کو اپنے ہاں دعوت دی ہو، کہ آپ کے ذریعہ لبنان میں اپنی مرضی کا انقلاب لا سکے، لیکن بعد میں ارادہ بدل گیا ہو اور جو شرائط قذافی کی ہوں، اُن سے آپ کا اتفاق نہ ہو، اور اُس نے اِس کے نتیجہ میں انہیں قتل کرنا ضروری سمجھا ہو، تاہم لبنان میں آپ کے پیروکاروں نے آپ کے غائب ہونے کو ٹھنڈے دل سے تسلیم نہیں کیا اور وہ ہر سال ۳۱ راگست کو آپ کا ''یومِ غیب'' مناتے ہیں۔ اُن کے لیے آپ کی شخصیت ایک مستقل ہیرو کی ہو گئی ہے۔ وہ آپ کی تقاریر اور تحریر اور مصائب کو اپنے لیے ایک نمونۂ عمل قرار دیتے ہیں، اور آپ کو ''امامِ غائب'' کا درجہ دیتے ہیں جو عوام شیعہ کا

Marfat.com

عقیدہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ اب تو آپ کے مخالف شیعہ بھی آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔
وہ تحریک جس کی آپ نے بنیاد رکھی، آپ کے غائب ہونے کے بعد اب صرف AMAL نام سے ہے۔ جو اب لبنان کی سب سے مضبوط شیعہ تنظیم ہے اور اسکے ساتھ دوسری بڑی اہم شیعہ تنظیم ''حزب اللہ'' ہے اور یہ بھی ''امامِ غائب'' عقیدہ پر ایمان رکھتی ہے۔

اگرچہ آپ کی بخیر و عافیت واپسی کی تمام اُمیدیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن ۱۹۹۳ء کے اواخر تک آپ کی واپسی کی کافی اُمیدیں تھیں۔ جو آپ کا ۶۵ واں سالِ پیدائش تھا۔ جس سال بالآخر وائس پریذیڈنٹ محمد مہدی شمس الدین پارٹی کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ جبکہ آپ کے بہت سے کارکنوں کا خیال ہے کہ آپ لیبیا کی کسی جیل میں قید ہیں۔

جب یہ سطور تحریر میں لائی جارہی ہیں، آپ اور آپ کے بہت سے چوٹی کے ساتھی دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ انکے ایرانی ساتھی انجینئر مصطفیٰ کامران جو ایران کی سپریم ڈیفنس کونسل کے چیئرمین تھے، ۱۹۸۰ء میں انتقال کر گئے تھے۔ اُنہوں نے لبنان کی AMAL ملیشیا کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا تھا اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خلاف بھی فوجی کارروائیاں عمل میں لائی تھیں اور مصطفیٰ کامران کے انتقال کے بعد خلیل جردی اور محمد سعید ایسی دو بڑی نامور ہستیاں اُبھریں۔ جنہوں نے ۱۹۸۲ء کے بعد اسرائیل کا مقابلہ کیا۔ لیکن اِسے ایک عجیب المیہ کا نام دیا جانا چاہئے کہ دونوں موسیٰ الصدر کے آبائی گاؤں میں ۱۹۸۵ء میں ایک حملہ میں کام آئیں۔ پھر ایک اور شخصیت صادق غرب زادہ جو موسیٰ الصدر کے دوست اور آیت اللہ خمینی کے معتمد تھے۔ خود آیت اللہ خمینی نے اُن کو اپنے خلاف ایک سازش کا مجرم قرار دے کر تختہ دار پر چڑھا دیا۔ ایک اور نامور شخصیت داؤد سلیمان داؤد جن کو موسیٰ الصدر کا بڑا قُرب حاصل تھا، اور جنوبی لبنان میں AMAL کے بڑے ولولہ انگیز لیڈر تھے، اُن پر بھی جب آپ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کے روز اپنے ایک موٹر سوار دستہ کے ساتھ تھے۔ ایک نامعلوم اینٹی ٹینک دستہ نے ایک راکٹ کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ البتہ یہ یقینی امر ہے کہ حملہ آور شیعہ ہی تھے۔

اِس طرح AMAL تنظیم نے متعدد اہم اور موثر سیاسی شخصیتوں کو لبنان کی تاریخ

Marfat.com

میں میدانِ عمل میں دکھایا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱) نبیہ بیری Nabih Barri جو ۱۹۸۰ء کے بعد تنظیم کے سربراہ رہے۔

۲) حسین الحسینی جو ۱۹۸۴ء تا ۱۹۹۲ء لبنان کی پارلیمنٹ کے سپیکر رہے، اور خود ہی ۱۹۹۲ء میں اپنے حریف نبیہ بیری کے حق میں دست بردار ہو گئے۔

۳) حسن ہاشم جو جنوبی لبنان کے ضلع سیدون کے گاؤں زہرانی میں ایک معمولی سکول ماسٹر تھے، لیکن موسیٰ الصدر کے بڑے عقیدتمند، لیکن ۱۹۸۲ء میں اسرائیلی حملہ کے خلاف بڑی جُرأت و دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے سیاست میں نام پایا۔ لیکن AMAL تنظیم جس میں گروہ بندی ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی عام ہے۔ حسن ہاشم بھی الزام تراشیوں کا شکار ہو گئے، جس بنا پر وہ سیاست سے دست کش ہو گئے۔

لبنان کی شیعہ سیاست میں ہر شیعہ سیاستدان اپنے آپ کو موسیٰ الصدر کا جانشین قرار دینا لازمی قرار دیتا ہے، جو آپ کی مقبولیت کا اہم اعتراف ہے۔ ایک طرف حزب اللہ ہے۔ جس کے قائد محمد حسین فضل اللہ ہیں۔ جس نے لبنان پر اسرائیلی حملہ کا منہ توڑ جواب دے کر بین الاقوامی سیاست اپنا نام پیدا کیا، دوسری طرف AMAL ایک اصلاحی تحریک ہے، اور لبنان میں ہر قیمت پر امن قائم کرنے کا کام کر رہی ہے۔ دونوں گروپوں کو لبنانی پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل ہے۔ جن کے ذریعہ لبنان کی شیعہ آبادی کو ایک موثر آواز حاصل ہے۔

اِس لحاظ سے اسلامی اقدار کے حامل منظّم مسلمانوں کے ہاتھوں ۱۹۷۸ء میں شاہِ ایران کا اقتدار سے ہٹایا جانا تاریخ کی ایسی نادر مثال ہے، جس کا مطلب یہ ہے، کہ قوتِ ایمانی کے مقابلہ میں اسلحہ اور مادی قوت کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ حتیٰ کہ ایران کے وہ حلقے جو ایران میں آیت اللہ خمینی جیسے انقلاب کے حامی نہیں، وہ بھی لبنان میں اپنے ہم مسلک شیعوں کی کامیابیوں سے بڑا اثر لیتے ہیں۔ دراصل ایرانی انقلاب محرومیوں اور عوام کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دیا جانا عوام کو کسی قیمت پر قبول نہیں تھا۔ جبکہ یہ انقلاب موسیٰ الصدر اور اُس جیسے سیدھی سادی زندگی

Marfat.com

گزارنے والے قائدین تاریخ کا وہ کارنامہ ہے، جس کی نہ صرف دورِ حاضر میں مثال نہیں، بلکہ یہ مثال عالمِ اسلام میں ایک موثر قوت بنتی جارہی ہے۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں آمری جمہوریت یا جمہوری آمریت کے ذریعہ اقتدار اور دولت کے پرستاروں نے پاکستانی عوام کے ساتھ جو شرمناک کھیل کھیلا، بالآخر ۲۰۰۷ء میں عوام کا آزاد عدلیہ کا بحال کرانا تاریخِ عالم کا وہ سنہری واقعہ ہے، جو زود یا بدیر اقتدار اور دولت کی حریص آمری جمہوریت یا جمہوری آمریت کو زندہ درگور کردے گا، جبکہ اِن دونوں نے کبھی ایک نے کبھی دوسری نے ایک دوسری کو الزام تراشی کا نشانہ بنا کر عوام کو تختۂ مشق بنایا جبکہ اپنے مذموم مقاصد اور ذرائع استحصال ذرا آنچ نہ آنے دی۔

Marfat.com

۸

ڈاکٹر استاذ علی شریعتیؒ

ایک اُستاد، ایک مبلغ، ایک باغی

۱۹۳۳ء تا ۱۹۷۷ء

علی رہنما

یہ ایران کے ایک شیعہ مسلک کی تحریک احیائے اسلام کے رہنما علی شریعتی کی عنوان کے لحاظ سے انتہائی دلچسپ سرگزشت ہے، جسے جناب علی رہنما نے بڑے دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ شیعہ سنی کی تفریق کے خلاف ہو کر دُنیا میں صرف اور صرف اِسلام کی سربلندی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ ان کا اپنا تعلق اہلِ تشیع سے ہے۔

اِس مضمون کی تیاری میں جناب علی رہنما نے نہ صرف کمال محنت سے کام لیا ہے، بلکہ تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مضمون میں مختلف مطبوعات کے ۱۵۹ حوالہ جات ہیں، جبکہ آپ کی زندگی اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے ہاتھوں آپ پر ظلم وتشدد اور قید و بند کے بعد شہید کیے جانے کے واقعہ کے بارے میں جن مصنفین نے جو مطبوعات شائع کی ہیں، ان کی تعداد ۱۸ ہے، چند اہم مطبوعات کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱) آپ کی زندگی پر فارسی زبان میں ''دفتر تدوین و تنظیم مجموعہ اسرارِ معالم شہید ڈاکٹر علی شریعتی''۔ ۳۵ جلدیں ہیں۔ اِس سے اندازہ لگائیں، کہ آپ کی زندگی کتنی منفرد صلاحیتوں کی مالک ہوگی، جن کا مضمون نگار نے چند صفحات میں احاطہ کیا ہے۔

Marfat.com

۲) دفاعِ اسلام ورُوحانیات ایم اے انصاری

۳) سخنے چند بہ آقائی علی شریعتی: مطبع حیدری تہران، ق۔ اسلامی

۴) یادنامہ شہید جاوید علی شریعتی: نہضتہ آزادی ایران

۵) یادنامہ اُستاد محمد تقی شریعتی: ج، پاجوم، ثم (ایران)

۶) ڈاکٹر علی شریعتی: از دیدگاہِ شخصیات ہا: ج، سعیدی۔ تہران (ایران)

۷) آنکہ یک انقلابی باید بداند: صفاتی نزاہانی

۸) Radical Islam : by . Abrahamian, London.

۹) بزرگ زادہ ڈاکٹر شریعتی در بیروت۔

۱۰) The securer Miracle, Religion, Politics and Economics Policy in Iran, By Ali Rahnuma & F. Namaic

اِن چند مطبوعات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ بیرونی طاقتوں کی غلام شہنشاہیت نے نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے اہل وعیال تک کو مصائب ومظالم کا نشانہ بنایا، بلکہ بالآخر جس سازش سے کام لے کر آپ کو بیرون وطن شہید کردیا گیا۔ یہ ایسی دلدوز داستان ہے۔ جس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ آپ شہید ہوکر زندہ جاوید ہوگئے۔ دین وَدنیا میں اپنا مقام بنا گئے، لیکن وہ شخص جو اپنی بادشاہت کو اپنی خاندانی بادشاہت رکھ کر دُنیا سے رُخصت ہونا چاہتا تھا۔ آپ کی شہادت کے صرف سات ماہ بعد ایسی ذِلت کے ساتھ ایران کے تخت سے اُتار کر ایسے گمنام مقام بھیج دیا گیا، جہاں نہ اُس کا نہ اُس کی بیوی بچے کا کوئی پُرسانِ حال تھا اور نہ وہ بیرونی طاقتیں، جن کا گماشتہ بن کر وہ ایک خودمختار اِسلامی ملک کا حکمران تھا۔ جیسا کہ ایسے غلام صفت حکمرانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اب اِس کے بعد آپ کے حالاتِ زندگی مختصر طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

خاندانی پسِ منظر:

جناب علی شریعتی کی پیدائش ایران کے ایک ایسے مذہبی گھرانے میں ہوئی، جس کے

Marfat.com

آباؤ اجداد صدیوں سے روایتی طور پر مذہبی تھے۔ آپ کے پڑدادا اخوند مُلّا قربان علی المعروف اخوند حکیم کو اُس وقت کی ایرانی حکومت نے صوبہ ماضینان کے بلند مرتبہ مذہبی عہدیدار آباد ہونے کی دعوت دی۔ جو صوبہ خراسان کے صحرا کے عین کونے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ (یہ معلوم نہیں، کہ اخوند حکیم اُس وقت کہاں آباد تھے، لیکن حکومت کی طرف سے آپ کو ایران میں آباد ہونے کی دعوت سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کوئی معروف علمی و مذہبی شخصیت ہوں گے، اور بلاشبہ نیک اور پارسا ہوں گے)۔

علی شریعتی کے والد محمد تقی ماضی نانی (شریعتی) ۲۸۔۱۹۲۷ء کے درمیان ماضینان چھوڑ کر اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشہد چلے آئے، جہاں قُم سیمیناری سکول کے بعد دوسرا بڑا مذہبی سیمیناری سکول تھا، اور اُس میں داخلہ لے لیا اور ابتدائی (مقدمات) تعلیم مکمل کر کے وہیں سے اعلیٰ مذہبی ڈگری حاصل کر لی۔ لیکن کسی دینی ادارے سے منسلک ہونے کی بجائے قومی تعلیمی نظام میں ایک ٹیچر کی ملازمت اختیار کر لی۔ آپ کا یقین تھا، کہ مستقبل کی نوجوان نسل کو صرف ماضی کی روایتی مذہبی تعلیم کے خلا میں نہ چھوڑا جائے، بلکہ دورِ جدید کی معلومات اور علم سے بھی آراستہ کیا جائے۔ جس میں آپ نے دو خاندانی رسومات ترک کر دیں۔ اولاً تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے ماضی نان کو ''خدا حافظ'' کہہ دیا، جو کئی پشتوں سے آپ کا آبائی گاؤں تھا۔ ثانیاً یہ کہ جو مذہبی خاندانی لباس تھا، جس کا دستار اور مذہبی جُبّہ ضروری لوازمہ تھے اُس کی جگہ مغربی لباس کوٹ پتلون اختیار کیا اور سر کے لیے دستار کی بجائے فرانسیسی ٹوپی ''شوپے'' Chpea پہننا شروع کر دی۔ اس لحاظ سے آپ نے مستقبل کی نوجوان نسل کے لیے مذہبی اور ماڈرن تعلیم دونوں اپنی کلاسوں کے لیے جاری کر دیں۔ اِس کے لیے آپ نے اپنے لیے ضروری سمجھا، کہ عربی و فارسی زبانوں کے علاوہ انگریزی/ فرنچ زبانیں بھی سیکھی جائیں، ان زبانوں کا لٹریچر بھی مطالعہ کیا جائے اور وہی لباس استعمال کیا جائے۔ اِس بارے میں لبنان کے شیعی مذہبی عالم ''مغنیہ'' نے آپ کے بارے میں کہا کہ ''یہ لباس اختیار کر کے آپ نے روایتی مذہبی مُلّاؤں کے مقابلہ میں نوجوان نسل کی مذاق آرائی سے محفوظ کر لیا ہے۔''

Marfat.com

(واضح رہے ''شوپے'' ٹوپی کا استعمال پوپ انوسینٹ II نے ۱۲۵۰ء میں شروع کیا)

نامعلوم امریکہ نے ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ پہلوی کو تخت سے دست برداری پر مجبور کر دیا اور پھر دوبارہ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم کی مقبول عوامی حکومت کو ایک سازش کے تحت ختم کر کے رضا شاہ کی حکومت بحال کرائی۔ یہ بارہ سالہ دورِ ایران مختلف سیاسی پارٹیوں کی باہمی محاذ آرائی کا دور ہے، جبکہ ۱۹۵۳ء تا جنوری ۱۹۷۸ء رضا شاہ پہلوی کا ظالمانہ بادشاہ کا دور ہے کہ بالآخر یہ بادشاہ آیت اللہ خمینی کے انقلاب کا شکار ہو کر اقتدار سے رخصت ہوا اور ایران میں ایک ایسی شیعہ اسلامی جمہوریت قائم ہوئی، کہ ہر طرح کے دباؤ، ہر طرح کی دھمکیوں اور پابندیوں اور نام نہاد یو این او کی قراردادوں کے باوجود ایرانی عوام اور کسی حکومت کے دل میں امریکہ اور اُس کی سرپرستی میں قائم اسرائیلی ریاست کیلئے سوائے نفرت اور مقابلہ کے لیے تیار رہنے کی اور کوئی گنجائش نہیں۔ اولاً ایران میں ۱۹۴۱ء تا ۱۹۵۳ء کے بارہ سالہ دور کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

جب ۱۹۴۱ء میں علی شریعتی کی عمر صرف آٹھ سال تھی اور رضا شاہ کی تخت سے عارضی دستبرداری کے بعد ایران میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئی تھیں۔ ان سرگرمیوں میں ''تودہ'' Tudeh نام سے ایک سیاسی پارٹی اُبھری جو درپردہ کمیونسٹ پارٹی تھی، لیکن عوام کے مذہبی رجحانات اور شیعہ علماء کے مضبوط اثرات کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا کمیونسٹ ہونا ظاہر نہ کرتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں ایک شیعی عالم احمد قصروی نے اپنی پارٹی قائم کی، جس کا مزاج شیعہ ہوتے ہوئے روایتی شیعہ علماء کی تنقیص اور ان کو اصل اسلام کی تعلیمات سے قرار دینا تھا، ایسے میں ۱۹۴۱ء میں علی شریعتی کے والد جناب محمد تقی نے کوئی پارٹی قائم کیے بغیر فردِ واحد کے طور پر اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا، جو آپ اپنے عقیدے کے مطابق اسلام کی رُوح خیال کرتے تھے۔ بعد ازاں آپ نے ۱۹۴۴ء میں مشہد میں ''قانونِ نشرِ حقائقِ اسلامی'' کے نام سے ایک تبلیغی مرکز قائم کیا۔ جس کا مقصد ایران میں کمیونسٹ ذہن کے ملحدانہ اثرات کو زائل کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ایسے اعتدال پسند دانشوروں اور باشعور نوجوانوں کی نسل کو یک جا کرنا تھا، جو احمد قصروی کے اثر میں آگئے تھے کہ مذہبی انتہا پسندی ختم کرنے کے نام پر اسلام کی اصل رُوح سے ناواقف ہو چلے تھے۔ لیکن جناب محمد تقی کی سرپرستی

Marfat.com

میں اِس اعتدال پسند مرکز کا قیام کٹر مُلّاؤں اور کمیونسٹ قسم کے ملحدوں جہاں دونوں سے متصادم ہوگیا، وہاں یہ ایک تیسری طاقت بن گیا، جہاں یہ دونوں اُس کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوتے نظر آئے، اور جناب محمد تقی نے اِس مرکز کے قیام سے ایک تیسری راہ کھول دی۔

۱۹۵۳ء میں امریکی حکمتِ عملی کے خلاف ڈاکٹر مصدق کی مقبول عام حکومت کی برخاستگی اور رضا شاہ پہلوی کی بادشاہی حکومت کی بحالی نے عوام میں دوبارہ ایک ہل چل برپا کر دی کہ ڈاکٹر مصدق کی حکومت کو بحال کیا جائے۔ چنانچہ اِسی سال "نیشنل ریزسٹنٹ موومنٹ" NRM کے نام سے شروع ہوئی۔ بادشاہت کے خاتمہ کی اور مصدق کی مقبولیت کی تحریک برپا ہوگئی، جس میں محمد تقی کے مرکز کے اراکین بھی شامل ہوگئے۔ ۱۹۵۷ء کے موسمِ گرما تک یہ مرکز ڈاکٹر مصدق کے حامیوں کے مرکز کی شکل اختیار کر گیا۔ اُنہیں دنوں "نہضتہ خداپرستان" نام سے ایک اور تحریک سامنے آئی، جس کے لیڈر مشہد میں محمد نخشب تھے، اُنہوں نے بھی این آر ایم NRM میں شمولیت اختیار کرلی۔ یہ دو شخصیتوں کی مخلوط جماعت تھی، اُس وقت علی شریعتی کی عمر ۲۱ سال تھی۔

آپ کا بچپن اور نوجوانی:

علی شریعتی جناب محمد تقی (شریعتی) اور زہرا کی پہلی اولاد ہیں، جبکہ آپ کا یومِ پیدائش ۲۴ رنومبر ۱۹۳۳ء ہے۔ آپ کا پورا نام شرافت علی ہے، جبکہ اُن دِنوں آپ کے والد جناب محمد تقی ایک پرائمری سکول ٹیچر ہونے کے ساتھ ابتدائی مذہبی تعلیم بھی ختم کر رہے تھے۔ آپ ایک ایسے اوسط درجہ کے مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے، جو مذہبی رسوم و رواج کے ساتھ بڑی سخت مذہبی رسومات کا پابند تھا۔ لیکن گھر کے سربراہ جناب محمد تقی کی نظروں میں اِسلام کٹر مُلّائیت اور اولاد بہ اولاد جانشینی کے خلاف ہر طبقہ کے عوام کو اسلامی تعلیمات سے باشعور کرنا ہے۔

۱۹۴۱ء میں آپ نے مشہد کے ابنِ یامین پرائیویٹ سکول میں ابتدائی درجہ میں داخلہ لیا، جہاں آپ کے والد محمد تقی بطور سکول ٹیچر ملازم تھے۔ آپ شروع سے خاموش طبیعت اور سلیقہ شعاری سے عاری، لیکن علم کے بارے میں بے حد محنتی تھے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

Marfat.com

آپ ایسے تنہائی پسند تھے، جو ایسی دُنیا میں رہتے تھے، جس میں بیرونی دُنیا کا کوئی دخل نہ تھا، اور اِس کے عین اُلٹ۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ آپ "مجلسی" آدمی نہ تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ کے ایک ہم جماعت کا کہنا ہے کہ آپ نہ کبھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے اور نہ کوئی کھیل کھیلتے تھے۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے، کہ جب آپ کلاس میں ہوتے تھے، تو باہر کی دُنیا کو کھڑکی سے باہر ضرور دیکھتے نظر آتے تھے۔ چنانچہ آپ کے بارے میں آپ کے ہم عمر یہ یادیں بتاتے ہیں، کہ آپ کا مزاج فطرتاً اپنے ہم عمروں سے بالکل مختلف تھا۔ اگرچہ آپ کی رہائش تو اپنے والد کے ساتھ تھی اور راتوں بلکہ بعض اوقات صبح تک بھی پڑھتے تھے، لیکن نہ نصابی کتابوں سے دلچسپی تھی اور نہ "ہوم ورک" کرتے تھے۔ آپ ابھی سکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں تھے، کہ آپ ایسی کتابیں جو زندگیوں کی آسائشوں سے محروم انسانوں اور سینما کی دُنیا کی تاریخ سے متعلق تھیں آپ نے وکٹر ہیوگو کی معروف تصنیف Les Miserables (خوشیوں سے محروم انسان) کا فارسی ترجمہ مطالعہ کیا۔

آپ نے ہائی سکول کے ابتدائی سالوں سے فلسفہ اور تصوف کو اپنے مطالعہ میں شامل کیا۔ اِس عرصہ میں آپ نے سکول کی نصابی تعلیم کی بجائے اپنے والد کی دو ہزار سے زائد مطبوعات کی لائبریری کے مطالعہ کو ترجیح دی۔ اِس طرح آپ شروع ہی سے منفرد ذوق کے مالک تھے۔ کہا جاتا ہے، کہ جب آپ کے والد کا تبلیغی مرکز دیگر افراد کے علاوہ آپ کے ہم جماعتوں کی تربیت کا بھی مرکز تھا، آپ گھر پر ہی اتنے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے، کہ آپ شاذ ہی تبلیغی مرکز کا رُخ کرتے اور کسی بحث و تمحیص میں حصہ لیتے، کہا جاتا ہے کہ یہ بحثیں آپ کی علمی پیاس اور ذوقِ تحقیق پورا کرنے میں ناکام رہیں۔ البتہ اپنے والد کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتے ہیں، کہ اُنہوں نے آپ کو سکونِ قلب و روح حاصل کرنے کی راہ دکھائی، یہ آپ کے والد ہی تھے، جنہوں نے اُن کو غیرت، آزادی، عزتِ نفس اور قوتِ ایمانی کے ذائقوں سے آشنا کیا۔ لیکن اپنے مستقبل کے مصائب سے ناآشنا ہو کر آپ نے اپنے گھر پر تنہائی میں جو اپنی تربیت کی۔ وہ اِس قدر مثالی ہے، کہ آپ اِس کے بعد بڑے بڑے مجمعوں سے بڑے دلنشیں انداز میں

Marfat.com

خطاب کر کے اُن کے دِلوں کو موہ لیتے رہے جبکہ تنہائی میں آپ کا مطالعہ اتنا وسیع تھا، کہ عام طلبا سے یکصد سبق آگے اور اپنے اساتذہ سے ۹۹ سبق آگے۔ اِس ابتدائی دور کی زندگی کے بارے میں معاشرتی اور مذہبی علوم کی بجائے زیادہ سے زیادہ توجہ ادب، تاریخ، شعروشاعری اور انسانی اقدار پر دیتے تھے۔ گھر پر اگرچہ آپ اپنے والد سے عربی زبان سیکھنے پر زیادہ توجہ دیتے تھے، لیکن اس کے ساتھ اپنے طور سے فلسفہ اور دورِ حاضر کے ایرانی اور غیر ملکی شعرا کا کلام اور تصنیفات کا مطالعہ بھی آپ کی روز مرّہ زندگی میں شامل تھا۔ جن شعرا اور مصنّفین نے آپ کو زیادہ تر متاثر کیا ہے، اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) معروف ایرانی ناول نگار: صدقِ ہدایت۔

(۲) جدید ایرانی شاعری کے امام: اخوانِ ثالث۔

(۳) معروف ایرانی شاعر: نمایوشیج Nima Yousbeej۔

(۴) صوفیانہ کلام کے پنجم کے مصنف: موریس مائٹرلنک

Maurica Miterlinck

اِس کے بارے میں علی شریعتی نے ایک جگہ لکھا ہے، وہ ایک چنگاری تھی، جو اِس طرح بھڑک اُٹھی: ''جب ہم ایک موم بتی جگمگاتے ہیں، اُس کی روشنی کہاں کہاں جاتی ہے؟''

آپ اس قسم کے روایتی عالم یا تنہائی کی دُنیا میں رہنے والے نہ تھے، کہ اُن کے پاس مجمع کو دینے کے لیے کچھ نہ تھا، یا اُن سے کچھ علیحدہ تھا، لیکن جب آپ پر ایک جذباتی کیفیت طاری ہوتی، تو آپ بڑے شگفتہ مزاج نظر آتے۔ جب آپ پر یہ کیفیت طاری ہوتی، تو سنجیدگی کے ساتھ اُس میں طنز و مزاح اور طعنہ زنی بھی ہوتی۔ اپنے دوستوں میں آپ پُر مذاق، طنزیہ گفتگو، نقل اُتارنے میں ماہر تھے۔ جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے زیادہ وقت گھر پر گزارا، لیکن جب آپ کلاس میں ہوتے، تو شرارتی بچوں کے ساتھ آپ بھی دیگر بچوں کے ساتھ استادوں کا مذاق اُڑاتے، آپ کی بچپن کی یہ وہی خصوصیات تھیں، جو بعد ازاں اپنے مخالفین اور دشمنوں کے خلاف موثر ہتھیار کے

Marfat.com

طور پر استعمال ہوئیں۔

اپنی نوعمری کے زمانے کے بارے میں شریعتی کا کہنا ہے، کہ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء کا دور بڑی بحرانی کیفیت میں گزرا۔ مغرب میں اِس عمر کے بچوں کو کوئی بزرگ کسی کام سے روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ جبکہ ایران میں اِس عُمر کے بچوں کے لیے عشق و محبت کی کہانیاں، فضول دیاوہ گوئی کے قصے جن میں جھوٹ و مکروفریب کی ملاوٹ ہو، کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ متوسط طبقے کے بچوں کے مطالعہ کا زیادہ زور اُن کتابوں پر ہوتا ہے، جن میں اخلاقیات اور دینیات کا رنگ ہوتا ہے۔ جس سے اپنے ذوق کے مطابق جناب شریعتی قطعاً محروم ہے اور اِس کی بجائے موریس مائٹر بنک، آرتھر شونہار، فرائنز کا لکا اور صدقِ ہدایت جیسے مغربی سکالرز اور مغربی ذہن کے مالکان کی مطبوعات کا مطالعہ کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مذہبی اور معاشرتی عقائد جو ایرانی معاشرے کے نوعمروں کے لوازم تھے۔ آپ کی نظروں میں شک وشبہ کا شکار ہو گے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں رہا اور زندگی بے یقینی کے ایسے اندھیروں میں داخل ہوگئی "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کی کیفیت طاری ہوگئی اور زندگی اتنی بے وقعت نظر آنے لگی، کہ خودکشی تک کا سوچنے لگے، کہ سردیوں کی ایک انتہائی سرد رات اور اُن کی اپنی داستان کے مطابق میں اِس فیصلہ پر عمل کرنے کی فکر میں تھا، کہ رحمتِ خداوندی غالب آئی اور میں نے مثنوی مولانا رُوم پڑھنی شروع کر دی۔ جس میں ذہنی سکون، تصوف اور قربِ خداوندی شامل تھیں، کہ اِس میں تصوف کے ساتھ مساواتِ انسانی، انسان کی تین بڑی پناہ گاہیں اور انسانِ کامل کی بنیادی سمتیں Dimensions ہیں، یہ کیفیت آپ کی اُس وقت تھی، جب آپ کی عمر صرف سترہ سال تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کے مزاج میں شروع سے فکر کی سنجیدگی تھی۔

۱۹۵۰ء میں آپ سکول کی نویں جماعت میں تھے اور فردوسی ہائی سکول کے سٹوڈنٹ۔ اسی سال آپ نے مشہد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں بطور ایک "بورڈر" Boarder داخلہ لے لیا۔ جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے کہ اُس وقت زندگی کی گومگو کیفیت میں مبتلا تھے، لیکن مثنوی مولانا رُومؒ کے

Marfat.com

مطالعہ نے ایک با مقصد اور پُر معنی زندگی اور اُس کے حصول کی راہ کشادہ کر دی تھی۔ دو سال بعد ۱۹۵۲ء میں آپ نے ٹیچرز ٹریننگ کالج سے گریجوایشن کی ڈگری حاصل کر لی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ابتدائی زندگی کے کئی سالوں سے آپ جس گومگو اور ذہنی کوفت کی کیفیت سے دو چار تھے، اب وہ دُور ہو چکی ہے اور فلسفیانہ گومگو اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار اور نوجوانی میں سنجیدگی کی بجائے جو غیر یقینی کی صورتِ حال ہوتی ہے۔ قصہ ماضی بن کر رہ گئیں اور اُن کی جگہ قوتِ ایمانی نے لے لی، کہ اسلام اپنی رُوح میں زندگی میں ایسا انکشاف ہے جسے زندگی کے لیے معاشرے میں ایک آئیڈیل کے طور پر اختیار کیا جائے۔ اِس سلسلے میں آپ نے صحابی رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی کو اِسلامی معاشرے کے لیے نمونہ قرار دیا۔

اِس سوچ اور فکر نے آپ سے پہلا علمی کام ''تاریخِ تکملۂ فلسفہ'' جس کا دوسرا نام ''مکتب وصیتِ اسلام'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اِس کے ساتھ دوسرا علمی کام حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی پر ''ابوذر غفاریؓ'' کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ دونوں علمی کام آپ نے ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۶ء کے دوران شائع کیے، جب آپ کی عمر ۲۰ سال اور ۲۳ سال کے درمیان تھی۔ اِن دونوں علمی کاموں سے آپ کی کوشش اِسلام کا دیگر فلسفوں، سیاسی اور معاشرتی اقتصادی مکتبہ ہائے فکر کے مقابلہ میں برتری اور بہتری ثابت کرنا مقصود تھا، کہ موجودہ دور کے لیے اِسلام ہی مشکلات اور مصائب کا حل ہے، جس میں آپ نے روایتی ترجمانی کی جگہ دورِ حاضر کی ترجمانی سے موثر انداز اختیار کیا، اور ایک مسلمان کی با مقصد زندگی کے حوالہ سے اقتصادیات، سیاست اور دورِ جدید کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لیے روایتی انداز کی بجائے اپنا ایک انداز سامنے لایا۔ آپ کے اِن دو اہم کاموں نے اُن لوگوں کو سہارا دیا، جو نہضتہ خدا پرستانِ سوشلسٹ کے زیر اثر تھے۔

آپ کی کتاب ''ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ'' دراصل آپ کے مصری ہم عصر مصنف عبدالحمید جودت السحر کا عکس ہے، اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی کتاب مصری ہم عصر کی عربی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ جس کا آپ نے اعتراف کیا ہے، لیکن اِس کے ساتھ آپ نے اپنی کتاب میں اپنے

Marfat.com

تاثرات کا اضافہ بھی کیا ہے، اور اضافوں کے باوجود قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ دونوں کے خیالات یکساں ہیں۔ آپ نے ''ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ'' کی شخصیت کو ایک ایسے منفرد ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ جنہوں نے غریب، مظلوم اور ہوش مند عوام کو دولتمندوں، طاقتوروں، حتیٰ کہ اسلام کے ایسے نام لیواؤں کا مقابلہ کر کے اُن کو تحفظ دیا۔

آپ کی یہی وہ پہلی کتاب ہے، جس نے آپ کو ایک انقلابی شخصیت کے طور پر پیش کیا اور عوام آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔ آپ کی نظروں میں جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مظلوموں کے دِلوں کی ایسی آواز ہیں، جو مساوات، انصاف، اخوت و محبت اور ظلم کے خلاف آزادی کی اپنی مثال آپ ہیں۔ اِس کتاب کا مقصد جیسا کہ بعدازاں موقعہ بہ موقعہ آپ نے حوالے دیئے ہیں، ایک عظیم شخصیت کی یاد دہانی اور صاف گوئی ہے۔ اُس دور کے بارے میں جب یہ اقدار معاشرے میں مفقود ہیں۔ مزید برآں علی شریعتی کی دریافت کو ایسی دریافت قرار دیتے ہیں، جس نے آپ کی شخصیت میں معاشرتی انصاف، مساوات، آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کا ایمان پختہ کیا۔ چنانچہ فرانس کے انقلاب کے بارے میں آپ بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں، کہ اِس سے بڑھ کر انقلاب تو صدیوں قبل ایک درویش صفت مسلمان برپا کر چکے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بیس سال کی عمر سے آئندہ تادمِ حیات حضرت ابوذرؓ آپ کی زندگی کا محور رہے اور عمر بھر یہ کوشش رہی کہ اُن کی اپنی زندگی حضرت ابوذرؓ کی زندگی کا آئینہ ہو۔ جیسا کہ آپ نے اپنی کتاب میں بھی بیان کیا ہے، کہ ''حضرت ابوذر انتہائی راست باز اور نڈر اور ذمہ دار مسلمان تھے، جنہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کا ہر اُس قوت کے خلاف ڈٹ کر دفاع کیا، جس میں ذرا بھی کھوٹ ہو، اور بعدازاں کھل کر بھی اِس کا اِن الفاظ میں اعتراف کیا۔

> ''میرا اسلام، میری شیعیت، میرے آئیڈیل، میری ضروریات اور میرا غیض و غضب وہی ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا تھا۔''

علی شریعتی اپنے آپ کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اتنا قریب خیال کرتے تھے، گویا کہ اُن کی رُوح اُن کے اپنے اندر سمٹ آئی ہے۔ اِس سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے، کہ صدی

Marfat.com

کے چھٹے عشرے میں ایک مرتبہ آپ اپنے مخالف سرکاری ایرانی علما کے غلط اور سرکار پرست رویہ کے خلاف تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی شان بیان کر رہے تھے، جس پر سرکاری عالم حاجی اشرف جو تہران کے ایک معروف عالم و مبلغ تھا، نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر ان الفاظ میں کیچڑ اچھالا:

''ابوذر ایک معمولی چور تھے اور اُس وقت اِسلام قبول کیا، جب اسلام دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اُس وقت اپنا نشانۂ تنقید بنایا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مالِ غنیمت اپنے عزیز واقربا میں تقسیم کر رہے تھے، جس میں آپؓ کو اتنا حصہ نہ دیا گیا، جتنا وہ چاہتے تھے، جس پر ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔'' (نعوذ باللہ)

(نوٹ:...... واقعات جو کچھ بھی ہوں، اہلِ تشیع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ دونوں کے مخالف ہیں، جبکہ جناب علی شریعتی اپنے طور سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو عمدہ اخلاق، جُرأت و انصاف کا قابلِ تقلید نمونہ قرار دیتے تھے، جبکہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے پیروکار آپ کو اپنے وقت کا ابوذر قرار دیتے تھے، جبکہ خود علی شریعتی اپنی تقاریر میں اُن احادیث نبویؐ کا حوالہ دیتے تھے، جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اپنی زبانِ مبارک سے ادا کی تھیں۔

علی شریعتی کی سیاسی وراثت:

آپ کا کہنا ہے کہ ''یہ ۱۹۵۰۔۵۱ء کی بات ہے کہ فضا میں اچانک ایک امریکن طیارہ نمودار ہوا، جس نے عالمی امن میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ جبکہ ایران کے کونے کونے سے بھی (شاہ کے خلاف) جدوجہد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ جس کے نتیجہ میں مَیں بھی گوشہ تنہائی کو خیرباد کہہ کر اس جدوجہد میں شامل ہو گیا۔ جس ہری کین کا ذکر ہوا ہے وہ ڈاکٹر مصدق کی حامی ''نیشنلسٹ موومنٹ'' کا تھا۔ کہ ملک میں بادشاہ کے خلاف مصدق کے حامیوں نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جلسے جلوس، پارٹی کے اجلاس اور ہر جگہ بادشاہ کے خلاف چہ میگوئیاں

Marfat.com

عام ہوگئی تھیں۔ مشہد میں آپ کے والد محمد تقی نے ''تحریک خدا پرستان سوشلسٹ'' کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی۔ جس کے اوّلین سولہ ارکان تھے، جبکہ علی شریعتی سمیت آپ کے ساتھ کاظم سمیع، مہدی ممکن، کاظم احمد زادہ اور ابراہیم ہراتی تھے۔ ''تحریک خدا پرستان سوشلسٹ'' کے نام سے یہ جماعت اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ جوڑتی تھی، اور اِس کا دعویٰ تھا، کہ اِسلام کا سماجی اقتصادی نظام عقیدہ وحدانیت کے ساتھ سائنسی سوشلزم پر مبنی ہے۔ اُن کے اخبارات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کو سوشلزم اور جمہوریت کا علمبردار قرار دے کر سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کا جُوا اتار پھینکنے کی دعوت دیتے تھے۔ ''تحریک خدا پرستان سوشلسٹ'' ۲۱ر مئی ۱۹۵۱ء کے روز ڈاکٹر مصدق کی حامی جماعت ''حزبِ ایران'' میں مدغم ہوگئی۔ جو ''مصدقی نیشنل فرنٹ'' کی رُکن تھی اور ۱۹۵۲ء کے موسمِ گرما میں مشہد میں اِس جماعت کے مرکزی دفتر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اِس کے بعد ۱۶ر فروری ۱۹۵۳ء کے روز محمد تقی کی ''تحریک خدا پرستان سوشلسٹ'' ''حزبِ ایران'' سے علیحدہ ہوگئی اور ''جمعیۃ آزادیٔ مردمِ ایران'' کے نام سے ایک نئی جماعت کا قیام عمل میں لائی، جس کی رُکنیت علی شریعتی نے اختیار کرلی، اور آپ کی یہ رُکنیت خراسان کے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیئے جانے کے بعد ''جمعیۃ آزادیٔ مردمِ ایران'' نے اپنے منشور میں کسی تبدیلی کے بغیر اپنا نام ''حزبِ آزادیٔ ایران'' کے نام سے تبدیل کرلیا۔ یہ واضح نہیں ہے، آیا کہ آپ نے اِس جماعت کی رُکنیت اختیار کی یا نہیں۔ آپ کے ایک قریبی دوست کا کہنا ہے کہ آپ نے اِس نئی پارٹی کی رُکنیت اختیار نہیں کی، اور بڑی سختی سے اِس کا انکار کیا، جبکہ پارٹی کے بعض کلیدی ارکان کا کہنا ہے کہ آپ نئی پارٹی کی باقاعدہ رکنیت اختیار کرنے کے ساتھ ماہانہ چندہ ایک ''تومان'' (ایرانی سکہ) بھی ادا کرتے رہے۔

جیسے ہی اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ اُلٹا گیا، شاہ مخالفوں اور قوم پرستوں کی اُمیدوں پر اوس پڑگئی۔ جبکہ رضا شاہ کی نئی حکومت نے ہر طرح کی سختیوں کے ساتھ مخالفت کو بُری طرح دبا دیا۔ جس کے نتیجہ میں بادشاہ کے خلاف اپنی اُمنگوں اور عوامی سہولتوں کی

Marfat.com

جو عوامی تحریک اُٹھی تھی، وہ بُری طرح مایوسی اور نا اُمیدیوں کا شکار ہوگئی، اور شریعتی بھی کچھ بھی نہ سمجھ پائے، کہ بادشاہت نے جس بُری طرح عوام کو اقتدار کے نشہ میں عوام کو سہولتیں مہیا کرنے کی بجائے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا ہے اور ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے، اُس کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ یہ بحرانی کیفیت ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۸ء دو سال کے قریب طاری رہی۔ جس کا محور اپنی اور رُوحانیت کی تلاش میں تھا، کہ ''میں کون ہوں؟'' کا کیا جواب ہے۔ ایک طرف آپ ڈاکٹر مصدق اور اُس کی تحریک سے متاثر تھے، دوسری طرف تحریک کی ناکامی سے غم آلودہ۔ جس نے بعد ازاں آپ کی زندگی میں آزادی اور جمہوریت کے بارے میں ایک تضاد پیدا کر دیا۔ ایک طرف آزادی کے لیے محبت اور اُنسیت جس کا محور ڈاکٹر مصدق کی سحر انگیز شخصیت دوسری طرف پارلیمنٹری جمہوریت سے نفرت جو قوموں کی تعمیر میں ایک کمزور سیاسی نظام ہے، چنانچہ ڈاکٹر مصدق کے زوال کے بائیس سال بعد ۱۹۷۵ء میں آپ نے آزادی کے معنوں کے بارے میں شاعرانہ انداز اختیار کیا۔ جس میں آپ نے ڈاکٹر مصدق کو اپنا ''پیشوا'' ہونا بیان کیا۔ کہ وہ اپنی زندگی کے ستر سال مسلسل ''محرومی آزادی'' پر غمزدہ رہے۔

ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا اُلٹنے میں ایک ''اتحادِ ثلاثہ'' کا انکشاف ہوا، جس نے ایرانی نوجوانوں کو اُس کے برخلاف انگیختہ کر دیا، جو ''پاپولر فرنٹ'' میں شامل تھے، یہ ''اتحادِ ثلاثہ'' امریکہ، بادشاہت، ایرانی فوج پر مشتمل تھا۔ جسے آیت اللہ بہبہانی اور آیت اللہ کاشانی جیسے ابن الوقت مُلّاؤں نے مزید تقویت بخشی۔ لیکن اب برانگیختہ نوجوان اِس ''اتحادِ ثلاثہ'' اور ابن الوقت مُلّاؤں کے خلاف کمیونزم کی طرف راغب ہوگئے اور اسے تمام دُکھوں کا مداوا یقین کرنے لگے۔

جن قوتوں کے اتحاد کی وجہ سے ڈاکٹر مصدق کی مقبول حکومت کا تختہ اُلٹا گیا، اُن کے خلاف علی شریعتی نے فارسی میں ''زر اور زور و تزویر'' کے عنوان سے بڑی مقبول عوام اصطلاح استعمال کی، کہ یہ اتحاد سونا، چاندی، جبر و فریب کا مجموعہ ہے۔ یہ آپ کے بہت سے سادہ مقبولِ عوام مقولوں میں سے ایک مقبول مقولہ تھا۔ جو عوام کے دِلوں کی آواز تھا۔ آپ کے نزدیک سرمایہ دار و دولت مندوں کا طبقہ، ظالم حکمرانوں اور اُن کے پروردہ مذہبی مُلّا و رہنما، تاریخ میں ہمیشہ بدی

Marfat.com

کا سرچشمہ رہے ہیں اور ہمیشہ اِن کی اصلاح آپ کی کوشش رہی ہے۔

۱۹۵۳ء کے اِس المناک واقعہ کے بعد مصدق کے حامیوں نے ''تحریک قومی جدوجہد'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی، جس کے رجحانات بڑے مذہبی تھے۔ اِس دور کے بارے میں آپ کا کہنا ہے، کہ آپ اِس دور میں اجتماعات منعقد کرانے اور جلسے جلوس کرانے اور ہڑتالیں کرانے میں پوری منصوبہ بندی سے کام لیتے تھے اور اِس کے ساتھ کتابچے اور پمفلٹ شائع کر کے اُن کو عوام میں پھیلاتے تھے۔

۲۸ رفروری ۱۹۵۴ء کے روز آپ اور آپ کے ایک دوست مسٹر فلسفی، ڈاکٹر مصدق کے ۱۹۵۴ء میں اقتدار میں آنے کے حق میں ایک مظاہرہ کر رہے تھے، کہ حکومت نے دونوں کو گرفتار کر کے سترہ روز کی سزائے قید دے دی۔ اُن دنوں آپ مشہد کے قریب ایک نواحی پرائمری سکول کتاب پور میں ایک ٹیچر کے طور پر ملازمت کر رہے تھے، اور اِس کے ساتھ کالج کی بارھویں جماعت کے امتحان کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ جبکہ سیاسی اور دیگر سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ جون ۱۹۵۴ء میں ادب کے مضمون میں بڑے اعزاز کے ساتھ امتحان پاس کر لیا، لیکن ''تحریک قومی جدوجہد'' کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ اخبار ''خراسان'' کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بھی ملازمت اختیار کر لی۔ ''خراسان'' کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہونے کے بعد آپ نے اپنی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو ترقی دی۔ جن میں تمثیلیں اور کہاوتیں تھیں اور آپ نے اپنی یہ صلاحیتیں اپنی تقریروں اور تحریروں میں بھی بڑے موثر انداز میں استعمال کیں۔

یونیورسٹی کا زمانہ:

۱۹۵۵ء میں آپ نے مشہد کی نئی یونیورسٹی فیکلٹی آف لٹریچر میں داخلہ لیا۔ جبکہ بطور ٹیچر سکول میں ملازمت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیکن یہ آپ کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں، کہ آپ اپنی کلاس میں امتحان میں چوٹی کی پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ جس نے آپ کو اپنے ہم جماعتوں میں اُن کے ساتھ بے تکلفی، علمی صلاحیتوں اور دیگر خوبیوں کے ساتھ ہر دلعزیز بنا دیا۔ یونیورسٹی کے علاوہ مشہد کے سیاسی حلقوں میں بھی آپ کی شہرت پھیل گئی۔ مزید برآں یہ صلاحیتیں

Marfat.com

اسلامی رنگ زیادہ لیے ہوئے تھیں۔

۱۹۵۷ء میں ایران بھر میں "تحریک قومی جدوجہد" کی تمام شاخیں بادشاہی حکومت کی زد میں آ گئیں، مشہد میں تحریک کے چودہ ممبروں کو گرفتار کرلیا گیا، جن میں آپ اور آپ کے والد محمد تقی بھی شامل تھے اور ان سب کو بذریعہ ہوائی جہاز مشہد سے منتقل کر کے تہران کی جیل "قزل قلعہ" میں قید کر دیا گیا، اُن پر الزام یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر مصدق کے نظریہ کے پیروکار ہیں، جو غیر قانونی ہے، لیکن علی شریعتی کو ایک ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔ یونیورسٹی میں آپ کی ملاقات پُوران شریعت رضوی سے ہوئی، وہ بھی یونیورسٹی میں شعبہ ادب کی طالبہ تھیں۔ آپ کا اصل نام بی بی فاطمہ تھا، لیکن "پُوران" نام سے معروف تھیں۔ ان کے والد کا نام حاجی علی اکبر اور والدہ کا نام "پری" تھا۔ آپ کے ایک بھائی "علی اصغر طوفان" رُوس کے آذربائیجان پر حملہ میں مقابلہ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جبکہ دُوسرے بھائی بھی ۱۹۵۳ء میں بادشاہت کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے چار ماہ سے کم عرصہ بعد ۷/دسمبر ۱۹۵۳ء کے روز تہران یونیورسٹی کے امریکی نائب صدر رچرڈ نکسن کے دورہ کے دوران یونیورسٹی کے طلباء کے مظاہرہ کے خلاف اپنے دیگر دو طلباء ناصر قادنسی اور مصطفیٰ بزرگ نیا سمیت ایرانی فوجی یونٹ کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے، یہ تینوں تہران یونیورسٹی کے شعبہ انجینئرنگ "دانشکدہ فنی" کے طلباء تھے جبکہ یہ تینوں طلبا بحالی بادشاہت کے بعد بادشاہت کے خلاف تین شہدا تھے، اور ان کو ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔

۱۵/جولائی ۱۹۵۸ء کو مشہد میں آپ کی پُوران سے باقاعدہ شادی ہو گئی، شادی کے پانچ ماہ بعد آپ نے فارسی لٹریچر میں بی اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ آپ نے یہ ڈگری بڑے شاندار نمبروں کے ساتھ حاصل کی، جس پر یونیورسٹی انتظامیہ نے بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے کا سکالرشپ عطا کیا۔ اولاً اپریل ۱۹۵۹ء میں اکیلے پیرس گئے، جبکہ اہلیہ پُوران اور نوزائیدہ بیٹا احسان بعدازاں کوئی ایک سال بعد۔

ایامِ پیرس:

پیرس میں آپ کا قیام اپریل ۱۹۵۹ء تا ستمبر ۱۹۶۴ء کوئی ساڑھے پانچ سال رہا اور قیام

Marfat.com

کے آخری دِنوں میں ایران واپس ہوئے، اور تیرہویں صدی عیسوی کے ایک فارسی عالم صفی الدین بلخی کی ایک تصنیف کے تیسرے باب کا فرانسیسی زبان میں The Merits of Balrb "Les Merites of Balkh" ۱۵۵ صفحات میں ترجمہ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے یہ فرانسیسی ترجمہ ساربورن Sarbouran کی پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر گلبرٹ لیزارڈ کی ہدایت پر لکھا، کہ موضوع اتنا اہم نہیں تھا۔ ماسوائے اِس کے کہ فارسی زبان کی ماضی کی صدیوں پرانی شخصیت کو فرانس کے فرانسیسی زبان میں متعارف کرانا مقصود ہو۔ چنانچہ جس قدر غیر اہم موضوع تھا، ویسے درجہ کی آپ کو ڈگری دی گئی اور آپ نے فرانسیسی زبان میں ایک مضمون میں تھرڈ ڈگری کی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی، اور ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ ستمبر ۱۹۶۴ء میں ایران واپس آ گئے۔

پیرس میں جہاں آپ کا قیام تعلیمی لحاظ سے روشن تھا، وہاں مغربی تہذیب کے اندھیروں کی وجہ سے تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ اِس شہر کے بارے میں آپ کے سامنے شر اور خیر دونوں پہلو تھے۔ بعض پہلو آپ کے لیے قابلِ نفرت تھے اور بعض کی آپ تعریف کرتے تھے۔ ایک طرف آپ اِس شہر کی زندگی کی مذمت کرتے تھے، کہ یہ شہر معاشرتی بُرائیوں کا ایسا گڑھ ہے جس کے شہری ہر طرح کی معاشرتی بُرائیوں میں مبتلا ہیں، جس کی عورتیں گلیوں میں اپنی عزتیں آزادی سے بیچتی پھرتی ہیں، جہاں بے شمار نائٹ کلبس ہیں، جن میں جُوا بازی عام ہے۔ اِس کی آپ نے اِس انداز میں مذمت کی کہ یورپ ایسا ظالم و بے رحم آہنی دیو ہے جو اپنے سے مختلف معاشروں کو ہڑپ کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہ ایسا دیو ہے، کہ اُس نے دوسروں کی اخلاقی اقدار اور رُوحانیت کو ختم کر کے ملحدانہ مادہ پرستی، بے حیائی اور بے غیرتی کے سمندر میں ڈبو دینے میں کوئی کمی روا نہیں رکھی ہے اور انسانیت کو خرید و فروخت کی منڈی بنا ڈالا ہے۔ جبکہ یہ آپ کی اپنی آبائی شریفانہ زندگی تھی کہ آپ نے ایک نوجوان سٹوڈنٹ ہوتے ہوئے پیرس جیسے اخلاق باختہ بدنام زمانہ شہر میں اپنی پاکبازی کو قائم رکھا، دوسری طرف آپ نے پیرس کے علمی اداروں کو دیکھا، کہ اُن میں معاشرتی بیداری اور ذہنی تر و تازگی ہے، جس وجہ سے آپ نے پیرس کو ایک قابلِ قدر شہر

Marfat.com

پایا۔ اُنہوں نے یہ بھی دیکھا کہ اِس ملک اور اِس شہر کے اساتذہ کتنے نیک نفس، اپنے شاگردوں کے لیے بڑے خلوص ومحبت کے ساتھ اُن میں علمی روشنی پھیلانے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ اپنے اساتذہ کے بارے میں علی شریعتی کا کہنا تھا، کہ اگر اُن کی سرپرستی نہ ہوتی، تو وہ رُوحانیت سے خالی، ایک مردہ، دل ایک نام نہاد ذہن کے مالک ہونے کے ساتھ بے مقصد زندگی کے مالک ہوتے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا، کہ تیسری دُنیا کے جو طلبا پیرس کی یونیورسٹیوں کی ہائی ڈگریاں حاصل کرنے کی خاطر پیرس آئے، اُن کو مغربی ماڈرن ازم، اُس کی مادی کامیابیاں، بے باک آزادیاں اور پارلیمانی جمہوری نظام اُن کو اتنا اندھا کرنے والی ہوتیں، کہ جب وہ واپس وطن لوٹتے، تو حاصل کردہ علم پھیلانے اور دینی رشتہ کی بجائے اپنے ملک میں اِن خرابیوں کو پھیلانے کا زیادہ پرچار کرتے۔ جناب شریعتی کی نظروں میں یہ تعلیم ''ٹرانے کا گھوڑا'' کے مترادف ہے۔ جو تیسری دُنیا کے ممالک پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ذرائع اور اپنی علمی وفنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے مسلسل امریکہ اور یورپی نوآبادیاتی طاقتوں کی غلامی برقرار رکھنا ہے۔

ایک طرف مغربی ممالک کی یہ اخلاقی بے راہ روی، جس میں تیسری دُنیا کے مسلم ممالک کے طلبا یہاں اعلیٰ فنی اور علمی تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مسلم ممالک کی علمی اور فنی پس ماندگی جب وہ طلباء تعلیم حاصل کرکے واپس وطن لوٹتے ہیں، اب ضرورت اِس امر کی یہ ہے، کہ یہ طلباء علمی اور فنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب وطن واپس لوٹیں، تو اُس تعلیم سے اپنے ملک کے علمی اور فنی علوم سے بہرہ ور کریں، نہ کہ آزادی اور جمہوریت وغیرہ فضول تلمیحات کا سبق دینے کا نام لے کر اُسی اخلاقی بے راہ روی کو عام کریں، جس سے مغربی ممالک کے عوام وخواص دوچار ہو کر ہر طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ جناب علی شریعتی نے ایک نام نہاد ایرانی دانشور سید حسن تقی زادہ جس نے علی الاعلان کہا تھا کہ ''ہمیں چاہیے کہ ہم سرتاپاؤں اپنے آپ کو مغرب کے سامنے سرنگوں کردیں'' کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا، کہ ''ہمیں ہر طرح

Marfat.com

اپنی اسلامی ایرانی روایات کو برقرار رکھنا ہوگا۔"

دُوسری بات جو ہمارے علمی اصحاب کو اپنانے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے، کہ ہم اُن پاکیزہ افراد، انبیائے کرامؑ کی پیروی کریں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنی ہدایات سے سرفراز فرمایا تھا، اُن کے اعمال کی پیروی کریں۔ آپ کے مطابق اصل صاحبِ علم اور انسانیت دوست افراد کی یہ اوّلین ذمہ داری ہے، اور مشن ہے، کہ وہ عوام کے مصائب اور مشکلات کو عوام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اِس انداز میں آگاہ کریں کہ اُن میں ایسی سُوجھ بُوجھ اور ہوش مندی پیدا ہو، جو اچھائی کا انقلاب برپا کرنے کا باعث ہو۔ یہ صالح اور صاحبِ علم افراد جو عوام کو مخاطب کریں، اُن کے لیے ضروری ہے وہ ایسی سادہ زبان اور سادہ اَلفاظ جو اُن کے دلوں میں اُترنے والے ہوں، استعمال کریں اور اُن پر اثر انداز ہوں، جو مثالی مقصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ عوامی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا، کہ عوام کے عقائد کو بھی سامنے رکھا جائے، جس کے علی شریعتی ایک اچھے مسلمان کے طور پر ایک نمونہ تھے۔

بدقسمتی سے ایران کے شیعہ علماء نے "تقیہ" کا سہارا لے کر اِسلام کو توہمات، رہبانیت، جمود، مایوسی اور ایسے نظریات کا لبادہ اوڑھا دیا تھا، جس میں جابر و ظالم حکمران کے سامنے ایسی سجدہ ریزی تھی، جس میں تعمیر و ترقی کا فقدان تھا۔ جس کے مقابلہ میں علی شریعتی کو اس عمل کا مظاہرہ کرنا تھا، کہ اِسلام اپنے عمل کے ذریعے تعمیر اور ترقی کا داعی ہے۔ آپ نے اِسلام کے صحیح پیغام سے آشنا کیا، جس میں آزادی، مساواتِ انسانی، خوداعتمادی، رُوحانی اقدار متعلق تھیں اور اُس اِسلام کی نفی تھیں، جو سیاسی جبر و ظلم اور اقتصادی استحصال کو جائز قرار دیتی تھیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ گزشتہ صدی کے چھٹے عشرے میں تیسری دُنیا کا صاحبِ علم طبقہ سامراج دُشمن اور مغرب کے خلاف تھا، جبکہ علی شریعتی روایتی مسلم گھرانے کے فرد، لیکن اپنے اہلِ علم ہونے کے بارے میں اعتراف کیا، کہ اِس بارے میں آپ کے محسن مغربی یونیورسٹیوں کے اساتذہ ہیں۔ اِن اساتذہ سے جہاں آپ نے خود اُن کے معاشرے کی بُرائیوں پر تنقید کا سبق سیکھا، وہاں جو اُن کا طرزِ تعلیم ہے اور جو اُن کا فلسفیانہ طرزِ فکر ہے، اُس کا دفاع کرنا بھی مناسب

Marfat.com

خیال کیا۔ آپ کے نزدیک مغربی تعلیم نے شیعیت کے بارے میں غیر شیعہ اہلِ علم افراد کی آراء نے اُن کی آنکھیں کھول دیں۔ نتیجتاً آپ کی شیعیت اُس شیعیت سے بالکل مختلف ہو گئی، جس کے ایران کے سرکاری علما علمبردار ہونے کے دعویدار ہیں۔ چنانچہ آپ اِسلام کے تقاضوں، اُس کے معاشرتی اور سیاسی پیغام پر عملدرآمد کرنے کے بارے میں زیادہ فکر مند تھے نہ کہ روایتی شیعی علماء کی روایتی تحریریں۔

بطور ایک مصلح آپ اُن اِسلامی تعلیمات کو ترجیح دیتے تھے، جن میں اِسلام رُوحانیت، تصوف، اُخوتِ انسانی کا علمبردار نظر آتا ہے۔ آپ کے ایسے وزن دار افکار جو شیعہ علما اور فقہا کے ہاں مستعمل نہ تھے، اُنہوں نے آپ کو سنی اور وہابی کہنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ ایسے میں آپ نے انتہائی پژمردہ ہو کر ایسے شیعہ علماء اور فقہا کے بارے میں دُعا کی کہ ایک روز شاید ایسا آئے، کہ یہ سرکاری منافع خور علما حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اِس انداز میں بیان کریں، جیسا کہ ایک عرب عیسائی عالم سلیمان قطانی نے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اِس انداز میں جیسا کہ مغربی عیسائی سکالر جارج جاروک نے، "اہلِ بیت" اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بالواسطہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مغربی سکالر "میسی نان" Massignan نے اپنی تحقیقی کتاب میں، ترجمہ قرآنِ کریم از عیسائی بشپ رجبس بلاشیر Rejis Blashere حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ یہودی اِسلام دُشمن میکسم رابنسن کی نظروں میں۔ دراصل آپ کی رائے میں اسلامی موضوعات پر غیر شیعہ اور بالخصوص غیر مسلم سکالرز کے غیر متعصبانہ تحقیقی کاموں نے متعصب قسم کے ایرانی شیعہ علماء کو علی شریعتی کے خلاف اِس وجہ سے مشتعل کر دیا، جس سلسلے میں آپ نے ایرانی شیعہ علماء کو مشورہ دیا تھا، کہ وہ نہ صرف غیر شیعی علما بلکہ غیر مسلم غیر متعصب تحقیقی کاموں کا بھی مطالعہ کریں۔

پیرس کی زندگی میں آپ کو بڑے بڑے مغربی سکالرز سے ذاتی ملاقاتوں اور اُن سے اِسلامی دُنیا، مسلم عالموں، تیسری دُنیا کے مسائل سننے اور سمجھنے کے مواقع ملے۔ جن سے متاثر ہو کر آپ نے لاشعور طور پر ایک مضمون "میرے بُت" "My Idols" لکھ مارا۔ اُن کو اندازہ نہ تھا، کہ اِس عنوان سے اُن کے خلاف کتنا طوفان اُٹھے گا، اِس مضمون کے ذریعہ آپ عالمِ اسلام اور تیسری

Marfat.com

دُنیا کے مغرب آنے والے حصولِ علم کے متلاشی طلباءکو یہ سمجھانا چاہتے تھے، کہ مغربی دُنیا میں کتنی اہلِ علم عظیم شخصیتیں ہیں، جن میں سے بعض نہ صرف ماضی بلکہ بعض مسلمان صوفی شاعروں اور بزرگوں سے متاثر ہیں، بلکہ اِن کے علمی کاموں نے مغربی دانشوروں اور سکالرز کو متعارف کراتے ہیں، بعض ایسے ہیں، جو مغرب کے ظالموں اور جابروں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی اور عوام کے دلوں کی آواز پہنچانے میں مصروف ہیں۔ لیکن آپ کے ایران کے مذہب کے نام پر تنگ نظر شیعہ علماء جن کو بادشاہت کی سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی، نے آپ کو شیعیت دشمن اور دین دُشمن قرار دینے اور عوام وخواص کی نظروں سے گرا دینے کا موقع فراہم کر دیا۔

المختصر! مغرب کے جن اہلِ علم سے آپ ملے اور اُن سے علمی استفادہ کیا۔ جناب علی رہنما نے اُن کے بارے میں اپنی تصنیف میں اِس طرح بیان کیا ہے۔

ا) پہلی علمی شخصیت معروف فرانسیسی کیتھولک ''لوئی میسی نون'' Loui Massignan ہیں، جو اپنے انداز میں اِسلامیات کے محقق ہیں۔ علی شریعتی کے مطابق ''لوئی میسی نون'' ایک بڑے ذہین، انسانِ کامل، بڑی خوبصورت رُوحانی شخصیت اور بڑے نیک شخص تھے، جن کے ساتھ آپ نے ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۳ء بطور معاون کام کیا۔ جناب علی شریعتی کی خودنوشت سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ''میسی نون'' کی صحبت اور اثر نے اُن کے اندر قلبی رُوحانیت پیدا کی۔ آپ کا کہنا ہے کہ جب آپ پیرس آئے تو آپ نے ''میسی نون'' سے مثنوی مولانا رومؒ کے حوالہ سے مغرب کی مادہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے ''سکونِ قلب'' حاصل کرنے کا دریافت کیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ''میسی نون'' کی شکل مین مغرب میں مولانا رومؒ کا متبادل دریافت کیا۔ اُن کا کہنا ہے، جیسا مولانا رُومؒ نے عین عالمِ جوانی میں اپنا مطلوب حاصل کر لیا تھا، اِسی طرح ''میسی نون'' نے بھی۔ علی شریعتی کا کہنا ہے کہ ''میسی نون'' کی شکل

Marfat.com

میں اپنے آپ کو پالیا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے سلمان فارسیؓ پر ''میسی نون'' کی فرانسیسی تصنیف کا فارسی میں ترجمہ شروع کیا۔

۲) ''میسی نون'' کے بعد جو دوسری شخصیت جس سے آپ متاثر ہیں، وہ معروف رُوسی سکالر ''جارج گُوروِچ'' George Gurvich کی ہے، جس کے لیکچر آپ پیرس میں اپنے پانچ سالہ دورِ قیام میں بڑی توجہ اور باقاعدگی سے سنتے رہے۔ ''گُوروچ'' روس سے ایک سیاسی پناہ گزین تھا، جو سٹالن کی ظالم حکومت سے فرار ہو کر فرانس آبسا تھا۔ جو اولاً ایک یہودی کمیونسٹ بھی تھا، لیکن بعدازاں فاشزم اور کمیونزم دونوں کا مخالف ہو گیا تھا۔ ''گُوروِچ'' نہ صرف آپ کا استاد اور ''گورو'' بن گیا، بلکہ عالمی سطح پر ناانصافی کے خلاف جو جنگ تھی، اُس میں آپ اُس کے ساتھی بھی بن گئے۔ اپنے طور سے علی شریعتی نے ''گُوروِچ'' کو اپنے دور کے ابوذر غفاریؓ کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ جیسا کہ اُوپر تحریر کیا گیا ہے کہ آپ پیرس میں ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۴ء پانچ سال رہے۔ بعدازاں ایران پہنچ کر اپنے مزاج کے مطابق سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں، جو ایرانی بادشاہت اور دولت کی حریص مُلّائیت کے خلاف تھیں اور اُنہوں نے بھی اپنی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر آپ کی آواز دبانا تھا۔ جس سے آپ نے سخت پریشان ہو کر ۱۹۷۲ء میں اپنے والد کو شیعیت کے بارے میں ایک خط لکھا، کہ ''اصل شیعیت'' اور موجودہ مُلّاؤں کی شیعیت میں ذرا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِس خط میں آپ نے ''گُوروِچ'' کے حوالہ سے ایران کی مُلّائیت کے بارے میں ایک اشتعال انگیز رویہ اپنایا، کہ ''گُوروِچ'' وہ شخصیت ہے، جو ساری عمر فاشزم سٹالن کی ڈکٹیٹر شپ اور الجزائر میں فرانس کے تسلط کے خلاف نبرد آزما رہے اور اُن کی یہ جدوجہد ایرانی حکومت کے فیض یافتہ

Marfat.com

آیت اللہ میلانی کی جعلی شیعیت کے مقابلہ میں اصل شیعیت کے زیادہ قریب تھی۔

۳) پیرس کے قیام کے دوران علی شریعتی کے اپنے قول کے مطابق علمی روشنی اور نظریات کے زیادہ باب منکشف ہوئے، جن سے آپ کی فکر اور آپ کی زندگی متاثر ہوئی۔ وقتاً فوقتاً آپ مغربی سکالرز کے لیکچر، شاعروں کی نظمیں، جرنیلوں کی تقریریں وغیرہ سنتے اور اُن کی تحریریں مطالعہ کرتے اور پھر اُن سے اپنے اور اُن کے ساتھ تبادلہ خیالات بھی کرتے۔ اپنے خیال کے مطابق آپ ہر کسی سے کچھ نہ کچھ سیکھتے اور فیض یاب ہوتے۔ فرانز فینان Frans Fanan سے آپ نے تیسری دُنیا کے بارے میں جہاں اُس کا استحکام، بین الاقوامی معلومات اور مغربی زندگی سے نفرت کے بارے میں سیکھا، وہاں اُن کی یہ ضرورت بھی معلوم ہوئی، کہ وہ اُسے ''نیا انسان''، ''نئے نظریات'' اور ''نئی تاریخ'' دینا چاہتے ہیں۔ علی شریعتی نے فینان کی کتاب ''مرنے والا نو آبادیاتی نظام'' A Dyeing Colonialism کا فارسی ترجمہ کیا، اور اُس سے اُس کا پیش لفظ لکھنے کی بھی فرمائش کی، جس کی اُس نے معذرت کر دی۔ البتہ مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد کے بارے میں باہمی تبادلہ مُراسلت ہوا، جس میں فینان نے مغربی طاقتوں کے مسلمان ممالک سے رُخصت ہو جانے، اُن کا اپنا تشخص نمایاں کرنے کی حمایت کی۔ اِس باہمی مُراسلت کے بارے میں تین خطوط کا ذکر کیا ہے، جس میں فینان نے تسلیم کیا، کہ اِس باہمی مُراسلت نے اُن کی اُن غلط فہمیوں کو دُور کیا ہے، جو وہ اِسلام کے خلاف نو آبادیاتی طاقتوں کے تسلط کے بارے میں رکھتے تھے۔ اپنی مابعد تحریروں اور تقریروں میں فینان کی تصنیف ''سطح زمین کے

Marfat.com

مظلوم انسان“ کے اکثر و بیشتر حوالے دیئے ہیں، جبکہ قیامِ پیرس کے دوران اِس کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

اِن کے علاوہ بھی آپ نے بعض مغربی سکالرز کی کلاسز میں حاضری دے کر اُن کے نظریات توجہ سے سنے اور بعض کی تصانیف توجہ سے مطالعہ کیں۔ ساترے بھی جو ایک فرانسیسی سکالر تھا، اُس کے علمی کاموں سے آپ نے اصولِ آزادی، بعدازاں انسانی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ہر طرح کے جبر و ظلم کا مقابلہ کرنا سیکھا۔ ایک خاتون ”جین کاکٹیو“ Jaan Coctea کی تحریروں سے کہ انسان کس حد تک ترقی کے ساتھ پھل پھول سکتا ہے۔ الیکسس کیرل Alexis Carrel's کے کاموں سے عقیدہ کے ساتھ سائنسی صلاحیتوں سے کام لینا سیکھا۔ کیرل نے یہ سبق دیا تھا، کہ انسان غائبانہ روحانی طاقت جسے بیان نہیں کیا جا سکتا، کے ساتھ بذریعہ علمِ ادویات انسانیت کی خدمت کر سکتا ہے اور اِس فلسفہ میں اُس نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ کیرل کے سیاسی پسِ منظر اور عقیدہ نے ایک طرف مذہبی پختگی عقیدہ سے سرفراز کیا، اور توہمات اور اُن کے خلاف فکر ردِّ عمل۔ کیرل کے اِس علمی کام نے دُوسروں کو یہ قائل کرنے کی صلاحیت عطا کر دی، کہ مثالی شخص وہ ہے، جو اِس مادی دُنیا کی سہولتوں اور خوبصورتی سمجھنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کمال بھی سمجھ سکے۔ ۱۹۵۹ء میں پیرس آنے کے فوراً بعد کہیں سے اُس کی کتاب ”دُعائیں“ "Prayers" حاصل کی اور اُس کا فارسی ترجمہ کیا۔ بعدازاں شریعتی، کیرل اور میکس پلینک Max Plank کی مثالیں اکثر استعمال کرتے تھے، جن میں اللہ تعالیٰ پر گہرے ایمان اور رُوحانی تلاش کے ساتھ سائنسدانوں کی بھی روحانی تلاش کا ذکر کرتے تھے۔

پیرس کے دورانِ قیام علی شریعتی کی مصروفیات صرف تعلیمی مطالعہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ جو طلبا ڈاکٹر مصدق کے حامی تھے اور جو طلباء الجزائر میں فرانس کے تسلط کے خلاف وہاں کی سیاسی جماعت نیشنل لبریشن فرنٹ (ایف۔ ایل۔ این) کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے، علی شریعتی ایسے ایرانی اور الجزائری طلباء کی بحث و مباحثوں کی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ آپ ایرانی بادشاہت کے خلاف جماعت کنفیڈریشن آف ایرانی سٹوڈنٹس اور معروف سیاسی لیڈر مہدی

Marfat.com

بازرگان کی سیاسی جماعت ''حزب تحریکِ آزادیٔ ایران'' Iran Freedom Movement کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھا۔ مہدی بازرگان جو اِن دنوں میں خود بھی پیرس میں تھے، کہ علی شریعتی آئی ایف ایم کے قریب تھے اور اُن کے بعض قریبی دوست بھی تحریک کے ساتھ تھے۔ لیکن خود تحریک کی رُکنیت اختیار نہیں کی۔ ویسے بیک وقت دونوں ہم مسلک جماعتوں کی رُکنیت عام بات تھی۔ لیکن آپ کا خیال تھا، کہ کسی ایک کی رُکنیت اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔

آپ مصدق کے حمایتی اشاعتی اداروں کے لیے باقاعدگی سے کالم نگاری کرتے رہے۔ آپ کے کالم نظم ونثر اور ایران کے بارے میں مغربی کالم نویسوں کے تراجم تھے۔ ایران کے بارے میں ایک میگزین ''جرنل آف دی آرگنائزیشن آف ایرانی سٹوڈنٹس آف فرانس'' JOISFANF میں آپ اپنے مختلف قلمی ناموں سے کالم لکھتے تھے۔ آپ کا ایک قلمی نام ''شام'' Sham تھا، جس کا فارسی ترجمہ ''شمع'' ہے۔ اِس نام سے آپ اکثر کالم نویسی کرتے تھے۔ یہ آپ کے پورے اصل نام ''شریعتی علی مازینانی'' کے پہلے حروف تہجی کا تلخص ہے۔ آپ نے اپنے اِس قلمی نام کی بنیاد پر اپنی ایک افسانوی شخصیت اختیار کی۔ جو فرانسیسی لفظ Chandel اور انگریزی میں Candle کے ہم معنی ہے۔ پروفیسر شینڈل Professor Chandel فرانس کے ایک مفکر بھی ہیں، جو علی شریعتی کی نظروں میں ایک مفکر اور مجتہد بھی ہیں۔ جن کو علی شریعتی ایک دانا بھی قرار دیتے ہیں، اُن کا علمی کام کئی جلدوں پر محیط ہے، جن سے آپ نے بہت استفادہ حاصل کیا ہے۔

۱۹۶۲ء میں یورپ میں ایرانیوں کی جرمنی کے شہر ''وزبیڈن'' Wiesbaden میں نیشنل فرنٹ کے فرسٹ کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا اور اُس نے ۱۵ر نومبر ۱۹۶۲ء کو ''ایرانِ آزاد'' کے نام سے اپنا پہلا شمارہ شائع کیا۔ اپنے کالموں کے علاوہ ''روداد ہائے بے نشا'' کے عنوان سے آپ اس کے اداریے بھی لکھتے تھے۔ آپ مغرب سے شائع ہونے والے کئی دیگر ایرانی جرائد میں کالم نویسی کرتے تھے۔ ایک سہ ماہی میگزین ''نامہ پارسی'' جو ایرانی کنفیڈریشن کی طرف اور امریکہ سے شائع ہونے ایک اور ماہنامہ ''اندیشہ جبہ'' نیشنل فرنٹ کے ''خیالاتِ فرنٹ'' میں

Marfat.com

لکھتے تھے۔ ''نامہ پارسی'' میں اپنے اصل نام سے اور مؤخر الذکر میں ''نام'' تخلص سے۔

۱۹۶۲-۶۳ء کا آپ کا عرصہ بادشاہت کے خلاف سیاسی اور صحافی سرگرمیوں میں گزرا۔ اِس دوران الجزائر کے ایف ایل این کے فرانس کے خلاف اُس کے ملٹری ونگ ''دی نیشنل لابریشن فرنٹ'' کا اثر لیتے ہوئے آپ نے محسوس کیا کہ بادشاہت کا خاتمہ کرنے کے لیے ایران میں بھی چھوٹے پیمانے پر ایک ایسی کارروائی کی بنیاد ڈالی جائے، جس کے افراد تربیت یافتہ، جان پر کھیلنے والے، مضبوط اعصاب کے انقلابی جذبہ کے مالک ہوں۔ امریکہ میں ''حزب تحریکِ آزادیٔ ایران'' I.F.M کے معروف رُکن ابراہیم یزدی کے نام اپنے ایک خط میں ابراہیم کو مشورہ دیا، کہ بادشاہت کا تختہ اُلٹنے کے لیے ایک مخصوص ''عسکری دستہ'' تیار کیا جائے۔ یہ عسکری دستہ ایران سے باہر عسکری ذہن کے ذہین افراد کو تربیت دے۔ اِس منصوبہ کا خیال آپ کے ذہن میں اِس وجہ سے آیا، کہ ۱۹۵۴ء میں جب الجزائر کی ایف ایل این فرانس کے تسلط کے خلاف برسرِ پیکار تھی، کہ پیرس، برلن، لنڈن اور قاہرہ میں جو الجزائری طلبا تعلیم پا رہے ہیں، وہ فوراً تعلیم چھوڑ کر الجزائر کے پہاڑوں میں پہنچ جائیں اور فرانس کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیں۔ شریعتی نے اپنے دوستوں کو لکھا، کہ جو طلبا اِس ''عسکری دستہ'' کے طور پر تربیت حاصل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ایسی تاریخ Date سے مطلع کریں کہ وہ اپنی تعلیم چھوڑ کر ٹریننگ کیمپ میں آنے کے لیے تیار ہیں، تا کہ باقاعدہ اس کا انتظام کیا جائے۔

''ٹریننگ کیمپ'' کے لیے اُس کے بنیادی انقلابی کام کا آغاز کرنے کے لیے ایک ٹیم تیار کی گئی تھی، جو ایسے جانباز ورکر، دہقانوں، طلبا اور دیگر افراد کا انتظام کرے۔ لیکن اِس منصوبہ کی کامیابی کی شکل میں سوال یہ تھا، کہ حکمرانی کن افراد کو دی جائے گی، جس کا کوئی جواب نہ تھا، لہٰذا منصوبہ ختم ہو گیا۔

جون ۱۹۶۳ء میں ایران میں بادشاہت کے خلاف بلوے شروع ہو گئے جس کے نتیجہ میں امام خمینی کی شخصیت ایرانی سیاست میں بادشاہ کے خلاف ایک مقبول شخصیت کے طور پر اُبھری۔ اِن دنوں علی شریعتی ابھی پیرس میں ہی تھے۔ چونکہ امام خمینی نے بادشاہت کے اِن

Marfat.com

بلوؤں میں اسلامی تحریک کا اعلان کیا، جس کا ایرانی عوام نے بھرپور حمایت میں ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ علی شریعتی نے پیرس میں ہوتے ہوئے اِس تحریک کو اسلامی تحریک سمجھ کر حمایت کی اور لوزان (سوئزرلینڈ) سے ایرانی نیشنل فرنٹ کے شائع ہونے والے میگزین ''ایرانِ آزاد'' کے لیے ایک اداریہ ''مصدق'' برائے اشاعت میگزین کو ارسال کیا، جس میں ڈاکٹر مصدق کو ایک قومی لیڈر اور امام خمینی کو ایک مذہبی رہنما قرار دیا گیا۔ لیکن میگزین کی انتظامیہ نے یہ اداریہ شائع نہ کیا، کہ اُس کے نزدیک ڈاکٹر مصدق کی شخصیت واحد ایرانی رہنما ہونے کی شخصیت تھی۔ بعدازاں امام خمینی سمیت بلاعنوان اِس میگزین کے لیے ایک اور اداریہ تحریر کیا، جو تہران میں انقلاب برپا ہونے کے بارے میں نیشنل فرنٹ کے عزائم کا مظہر تھا۔

آپ ایران سے سرکاری منظوری کے ساتھ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے پیرس آئے تھے، جس میں تمام سرکاری لوازم شامل تھے۔ اگر اِس بارے میں کوئی تبصرہ کیا جائے، تو اِس بارے میں آپ کی پیرس آمد ناکام نظر آتی ہے۔ تاہم فرانس کی سوبورن Sobourn یونیورسٹی کے پروفیسر گلبرٹ لیزارڈ Gilbert Lazard کی فرمائش پر آپ نے تیرھویں صدی کے ایک فارسی عالم سیف الدین بلخی کی ایک ضخیم کتاب کے تیسرے باب کا ۱۵۵ صفحات پر مشتمل فرانسیسی زبان میں Las Merites de Dalrh (The Marits of Balkh) کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے ترجمہ کیا۔ جس کو ڈاکٹریٹ کے سب سے کم نمبروں میں کامیاب قرار دیا گیا۔ جس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ علمی لحاظ سے آپ فرانسیسی زبان میں وہ استعداد حاصل نہ کر سکے، جو ضروری ہے۔

پیرس میں آپ کی علمی صلاحیتوں کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ آپ نے سوشیالوجی اور تاریخِ مذاہب دونوں علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی جو غلط ہے۔ بعض کے نزدیک آپ نے ''لسانیات کا تقابلی جائزہ'' کے مضمون میں ڈگری حاصل کی۔ سرکاری ڈپلوما اِس بات کا شاہد ہے، کہ آپ نے ''ماضی اوسط کی اِسلامی تاریخ'' Historia del Medicial کے مضمون میں ڈگری حاصل کی۔ جبکہ پیرس میں ایرانی سفارت خانہ نے آپ کا

Marfat.com

''ڈاکٹر آف لٹریچر'' ہونا تسلیم کیا ہے۔ البتہ ایک بات مسلمہ ہے کہ آپ نے ایک بات مطالعہ کی اور اُس کا ترجمہ کیا۔ جس کا آپ کا مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں اور وہ یہ ہے کہ آپ نے سوشیالوجی، تاریخ، فلسفہ، تقابل مذاہب اور اِسلامیات کے موضوعات پر پیرس میں جتنے لیکچر وقتاً فوقتاً ہوئے، آپ اُن سے مستفید ہوتے تھے۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ایک خاص موضوع کی بجائے اتنے موضوعات میں دلچسپی لینا شعبہ تعلیم سے منسلک نہ ہونا تھا۔ گو چارو ناچار سوبورن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔

وطن واپسی:

ستمبر ۱۹۶۴ء میں بمعہ اہل وعیال بذریعہ سڑک جناب علی شریعتی نے واپس وطن ایران کا سفر شروع کیا، لیکن تُرکیہ ایران سرحد پر انہیں آذربائیجان میں گرفتار کر لیا گیا، اولاً آپ کو ''خوئی'' جیل میں قید کر دیا گیا۔ بعد ازاں ''قزل قلعہ'' میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن کوئی ڈیڑھ ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔ یہ جیل تہران کے قریب ہے۔ رہا ہونے کے بعد آپ مشہد آ گئے، اِس اُمید پر کہ آپ کو یونیورسٹی میں ملازمت مل جائے گی۔ اِس سے آپ کا مقصد یہ تھا، کہ آپ ایران کے نوجوان طلبا میں اِسلامی تعلیم، سیاسی شعور، غلامانہ ذہنیت کے خلاف خود اعتمادی کی تعلیم کی تبلیغ ایران کو دُنیا میں عزت اور احترام کا مقام دے گا، لیکن وطن واپسی کے بعد تیرہ سال مختلف مصائب و مشکلات گزارنے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا، کہ بادشاہت کے خاتمہ تک آپ انگلینڈ چلے جائیں، چنانچہ آپ ۱۶ رمئی ۱۹۷۷ء کے روز آپ براستہ بلجیم اکیلے خاموشی سے بلا اطلاع حکومت کی اجازت کے بغیر انگلینڈ جانے کے لیے ایران چھوڑ گئے، اور جون ۱۹۷۷ء کی تاریخ میں نگلینڈ پہنچ گئے، جہاں آپ ۱۹ رجون ۱۹۷۷ء کو بڑے پُر اسرار انداز میں ہوٹل میں مُردہ پائے گئے، اِس طرح ۱۹۶۴ء میں پیرس سے واپس وطن ایران پہنچنے کے بعد تیرہ سال ظالم بادشاہت کا جس مجاہدانہ غیرت وحمیت کے ساتھ تادمِ حیات مقابلہ کیا، وہ دورِ حاضر کی تاریخ میں ایک مثالی واقعہ ہے، جس کی تفصیل صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

Marfat.com

غیر واضح فکر اور مایوسی (پہلا دور ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۷ء):

۱۹۶۴ء میں ایران واپس ہونے کے بعد نومبر ۱۹۶۴ء تا ستمبر ۱۹۶۷ء قریباً تین سال کا عرصہ غیر یقینی فکر اور مایوسی کا دور ہے۔ اپنے سوشل اور سیاسی مقاصد کو معنی خیز بنانے کے لیے ضرورت تھی کہ ایسے افراد کے ساتھ تعلق ہو، جو اِن شعبوں کا پورا اِدراک رکھتے ہوں۔ جبکہ اُن کا پیغام اُن نوجوانوں کے لیے تھا، جو ضروریات زندگی سے محروم، ماضی کی اقدار کے مالک کے ساتھ موثر انقلابی ذہن کے مالک ہوں۔ آپ کی تمثیلات، کہاوتیں اور اشعار وغیرہ کا استعمال اِس بات کا مطالبہ کرتا تھا، کہ علمی پس منظر کے ساتھ مغربی فلسفہ، سوشیالوجی، نفسیاتی اور تاریخ سے عبرت حاصل کرنے والا بھی ہو۔ شروع شروع میں آپ کی تحریروں اور تقریروں میں عدم یکسانیت کے ساتھ محاربہ آرائی بھی تھی، اور مخاطب یونیورسٹیوں کے سیمینار کی بجائے وہ عوام تھے جن کے لیے یہ چیزیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر آپ نے چاہا کہ مشہد یا تہران کی یونیورسٹی سے پیرس یونیورسٹی کے مساوی کسی شعبہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لیں۔ لیکن اِس سلسلے میں مشرق کی روایات کے مطابق نوکر شاہی آڑے آئی جس وجہ سے صبر کی قناتیں ہلنے لگیں اور دیکھا، کہ یونیورسٹی سطح پر ملازمت حاصل کرنا نوکر شاہی کے ذریعہ دُور از کار ہے۔ جو اِس امر سے ظاہر ہے کہ ایک طرف آپ کے پاس پیرس یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تھی، اِس کے برخلاف ایران کی وزارت تعلیم نے آپ کی مشہد کے گردونواح میں بیک وقت تین مختلف ہائی سکولوں میں فارسی گرامر کے ٹیچر کی تعیناتی کر دی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ تقرری آپ کے علمی مقام کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کمتر تھی، لیکن آپ کو ہر جگہ اور ہر سطح کے مطابق اللہ تعالیٰ نے لیکچر دینے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، جبکہ تین چھوٹے ہائی سکولوں میں ایک معمولی ٹیچر کے طور پر ملازم ہونا طلباء میں اسلامی فکر کی مہم چلانا بھی دُور از کار تھا، کہ اِسی دوران وزارتِ تعلیم نے آپ کو تہران یونیورسٹی میں ریسرچ سنٹر میں ٹرانسفر کر دیا۔ جہاں آپ نے ''گائیڈ ٹو خراسان'' کے عنوان سے اپنا سفرنامہ لکھا۔

Marfat.com

پیرس جانے سے قبل بھی آپ نے ایرانی قوم میں قومی اور بین الاقوامی سیاست میں شعور کا فقدان پایا تھا اور یہ فقدان بدستور موجود تھا۔ جس سے آپ بہت فکر مند تھے۔ جس کا آپ نے ایک دوست سے اپنا غم اِن الفاظ میں ذِکر کیا کہ ''ایک طرف الجزائر کے عوام کی تحریکِ آزادی نے فرانس کے تسلط کو ہلا کر رکھ دیا، جبکہ ہمارے ایرانی عوام ہیں، جن کو اپنی ذاتی خودداری کا ذرا خیال نہیں۔'' تاہم آپ یہ محسوس کر رہے تھے کہ قوم میں ابتدائی طور پر آزادی کے جراثیم نشوونما پا رہے ہیں۔ اِس حیثیت میں آپ سیاسی شعور کے ساتھ ایسے بحث مباحثوں سے دُور تھے۔ تاہم اِس مختصر عرصہ میں آپ نے فرانسیسی سکالر ''میسی نون'' Massiynan کی معروف صحابیٔ رسولؐ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حیات پر فرانسیسی کتاب کا فارسی زبان میں ترجمہ کر لیا، یہ کتاب جس کا فرانسیسی نام Kavir (صحرا) ہے، بڑی اَہم ادبی خودنوشت کہی جا سکتی ہے۔ اِس فارسی ترجمہ سے جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کی حیات کے بارے میں پوری معلومات علم میں آتی ہیں، وہاں خود علی شریعتی کی تعلق باللہ کی جدوجہد کی معلومات ملتی ہیں۔ تعلق باللہ کی فکر کے بارے میں علی شریعتی کا کہنا ہے، کہ ۱۹۵۷ء میں جب آپ کی نوجوانی کی ۲۴ سال عمر تھی، تب بھی ذہن اِس کا قدرے شعور تھا، لیکن ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۹ء جب آپ نے فرانسیسی سکالر کی کتاب کے ترجمہ کا کام سنبھالا تو اِس کے لیے شاعرانہ انداز کے ساتھ بڑا عمدہ ادبی لہجہ بھی اختیار کیا۔ یہ کتاب وادیٔ تصوف میں آپ کا ایسا ادبی مثالی کام ہے، جس میں علی شریعتی ایک صوفی کے طور پر ''علمِ معرفت'' کی تلاش کا سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک صوفی کی رُوح منزل بہ منزل سفر کرتی ہوئی بالآخر ابدی طور پر ذاتِ الٰہی میں غرق ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب ''سلوک کی مشق'' سے بڑھ کر علی شریعتی کی ایسی دستاویز ہے، جس میں وہ خود بیسویں صدی کے مسیح نظر آتے ہیں۔

(نــوٹ:...... یہ کتاب جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کی پاکیزہ زندگی پر ایک اہم علمی معلوماتی کتاب کہی جا سکتی ہے، وہاں اہلِ مغرب کی ''تلاشِ روحانیت'' کی پیاس تو بجھا سکتی ہے، لیکن کسی طور بھی اِسلامی فکر نہیں کہا جا سکتا)۔

دراصل عالمِ اسلام پر نوآبادیاتی اور یورپی سامراجی طاقتوں کے تسلط سے رہائی پانے

Marfat.com

کے لیے مختلف راہیں تلاش کرتے رہے کہ وہ اپنے ملک کے عوام کو اُن طاقتوں سے آزاد کرا کر اُن کو سیاسی اور اقتصادی شعبوں کی برکات سے نواز سکیں۔ آپ پر ایک ایسی جذباتی کیفیت طاری ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ عوام کی کمزوری کو قوت میں، مایوسی کو خوش آئندگی میں' بے مقصدیت کو بامقصدیت میں تبدیل کر دیں۔ جس میں آپ کی ''صوفیت'' کی کیفیت میں کسی غیر یا ماضی کے کسی صوفی کا دخل نہ تھا۔ جہاں اِس کتاب Kavir کا ایک حصہ پژمردگی، تنہائی، پُراز مصائب، فکری پریشانی حتیٰ کہ بے حالی کی عکاس ہے، آخر میں روشنی کی سُرنگ کا مظہر ہے۔ ایک سے زیادہ مواقع پر عام آتشیں پٹاخوں کو کراماتی طور پر چمکدار ستاروں میں، اندھیرے آسمان کو روشن آسمان کی شکل میں بدل کر صحراء سے طویل جمود کی کیفیت کو دُور کر دیں گے۔ آپ کو روحانی اور صوفیانہ طاقت پر بڑا بھروسہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر جہاں آپ کی کوشش کہ انقلاب کے لیے جدوجہد جاری رہنی چاہیے، وہاں آپ اُس کی کامیابی کا یقین بھی رکھتے تھے۔ آپ نے ایران میں ایک اسلامی انقلاب لانے کے لیے بے شمار تصنیفات تحریر کیں۔ آپ سے بعض مرتبہ سوال کیا گیا، کہ آپ کو اپنی تصانیف میں کونسی تصانیف سب سے زیادہ پسند ہیں، اِس سوال کے جواب میں آپ نے اپنی اِن دو تصانیف Kavir اور ''اسلام شناسی'' کو زیادہ پسندیدہ قرار دیا۔ Kavir جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ صحابی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے، یہ کتاب ''میں اپنے لیے خاص طور پر پسند کرتا ہوں'' جبکہ ''اسلام شناسی'' عوام کے لیے۔

دوسرا دور، ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۱ء ایک نئی اِسلامی راہِ عمل:

آپ کا یہ دور مشہد یونیورسٹی میں بطور ایک پروفیسر ہے۔ جس میں آپ براہِ راست یونیورسٹی کے طلباء سے روابط قائم کرتے نظر آتے ہیں اور آپ ایک ہر دلعزیز شخصیت کے طور پر اُبھرتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے اوائل میں آپ کو وزارتِ تعلیم کی طرف سے مشہد یونیورسٹی کے کالج آف لٹریچر میں ''تاریخ اسلام'' کا مضمون پڑھانے کے لیے پیش کش کی گئی، جو آپ نے بخوشی منظور کر لی، کہ یہ مضمون تو خاص اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق تھا۔ آپ کی تعیناتی سے قبل طلباء

Marfat.com

میں یہ ایک خشک طرح کا مضمون خیال کیا جاتا تھا۔لیکن جیسے ہی آپ نے یہ ذمہ داری سنبھالی، طلباء میں یہ مضمون ایک غیر معمولی مقبولیت اختیار کر گیا اور بطور ایک اسلامی دانشور نصف درجن سے زائد سوشل علوم میں باہمی تعلق و روابط کے واسطہ سے اس قدر مہارت کا مظاہرہ کیا' کہ جن کو ثابت کرنے میں قوی دلائل تھے۔آپ اپنے سبق طلباء میں اس انداز سے پیش کرتے تھے، جن میں مختلف مکتبہ فکر اپنے اپنے طور پر اپنے افکار ایک ڈسپلن کے اندر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ایک دور میں اسلامی حکومتوں کی یونیورسٹیوں سے سند حاصل کرنا اپنے لیے ایک اعزاز خیال کرتے تھے۔ لیکن انہی سندوں کی بنیاد پر مسلم علماء کو پیچھے چھوڑ دیا اور اپنے ''دار العلوم'' کو ''یونیورسٹی'' قرار دلا دیا، مسلمان طلباء کسی ''دار العلوم'' سے سند حاصل کرنا معیوب خیال کرنے لگے اور یونیورسٹی سے سندِ علم حاصل کرنا اعزاز سمجھنے لگے، حالانکہ ''دار العلوم'' اور ''یونیورسٹی'' دونوں ہم معنی ہیں۔

مغربی یونیورسٹیوں کے علم اور اُن کے سکالرز سے سلیقۂ تعلیم و تدریس حاصل کرنے میں وہ ایسے ''اُستادِ کامل'' Super Teacher کے طور پر مشہد یونیورسٹی میں نمایاں ہوئے، جو سب کچھ جانتے اور سمجھتے تھے اور دلچسپ امر یہ کہ ملک جن سیاسی اور معاشرتی اور اقتصادی مسائل سے دوچار ہے، اسلام اُن کے حل کے لیے کچھ دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ آپ اپنی تازہ علمی مہارت اور انداز سے طلبا کو اپنے طرزِ درس و تدریس سے مستفید کرنا مناسب خیال کرتے تھے، وہ پرانے روایتی عالم کہلانے والے اُستادوں پر گراں گزرا۔جبکہ آپ کی حوصلہ دلانے والی مسحور کن فکر انگیز تقریروں سے سامعین کے اندر جذبۂ عمل کی کیفیت پیدا ہونے لگی اور وہ طلباء جو خالی الذہن، بے مقصد، باتونی، سگریٹ نوشی کے عادی نوجوان تھے، اچھے اور باعمل نوجوان نظر آنے لگے۔

انہوں نے اس عرصہ کو اپنے سفر کی ایسی پہلی منزل قرار دیا، کہ طلبا اور نوجوانوں کو صحیح باعمل اسلامی فکر کی طرف مائل کر سکیں۔جس میں باشعور افراد اور دانشور طبقہ کو یہ عملی توجہ دلانا مطلوب تھا کہ عوام اور اُن کے درمیان جو خلیج حائل ہے، اُس میں وہ ایک پُل کا کام کریں اور بلاتفریق مسلک و فرقہ ایران کے عوام و خواص جو لوگ لڑ کر ملک میں انقلاب لانا چاہتے ہیں' ضرورت ہے کہ وہ اپنے ماضی کے ورثہ پر نظر دوڑائیں اور وہی زبان استعمال کریں۔بصورت

Marfat.com

دیگر اگر وہ ماضی کی تاریخ سمجھنے، ایران کی تہذیب وتمدن اور عوامی زبان میں عوام کے ساتھ میل جول میں ناکام ہو گئے، تو بحیثیت سیاسی کارکن اور ذمہ دار آپ معاشرہ کے مسائل کے حل میں بھی ناکام ہوں گے۔ آپ کا اِس امر پر زور تھا، کہ ایران کا ماضی، اُس کی تاریخ، اُس کی تہذیب اور اُس کا تمدن صرف اِسلام ہے۔ اُن کو کہنا تھا کہ قبل از اسلام ایران کا جو شاندار ماضی تھا۔ وہ مُردہ ہوکر کب کا دفن ہو چکا ہے اور عوام اُسے بھلا چکے ہیں۔ اب جو ایران کا تشخص ہے اور اُسے اُجاگر کرنا ہے وہ اسلام اور شیعیت ہے، اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد لازمی ہے، کہ وہ وہ زبان، وہ تمثیلیں استعمال کریں، وہ قوانین اپنائیں، اِسلام کے اُن شجاع اور بہادروں کی یادیں دلائیں، جو اسلام اور اِسلامی تاریخ سے شناسا کرانے کے بعد اُن کے اندر وہ جذبہ پیدا کرنے کا باعث ہوں، جو اِسلام کی خصوصیت ہیں، تاہم اُسے بعض ایسی خرابیوں سے پاکیزہ کیا جائے، جس میں یومِ آخرت اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کے ساتھ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا منصوبہ کارفرما تھا اور ترکِ دنیا اور خاموشی کے ساتھ کونہ میں بیٹھ کر ''اللہ اللہ'' کرنے کی بجائے مسلح جدوجہد شامل تھی۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں آپ نے ''اِسلام شناسی'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی، یہ کتاب آپ کے مشہد یونیورسٹی میں ''اِسلام کی تاریخ'' کے عنوان پر لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ اِس کتاب کو آپ کے اپنے نظریہ کے جراثیم قرار دیا جاسکتا ہے، جن کا مظہر آپ کی مابعد زندگی نظر آتی ہے۔ اِس کتاب میں آپ نے مغرب زدہ دانشوروں اور دماغوں کو بُری طرح للکارا ہے، کہ اُن کی سوچ وفکر میں انصاف اور صحیح شعور کی بجائے مغربی سکالرز کے اِسلام کے بارے میں غلط تراجم ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو اِس امر کا مجرم گردانا، کہ یہ لوگ خود اپنی آزاد رائے کی بجائے اغیار کی حاشیہ آرائی کے علمبردار ہیں۔ آپ سمجھتے تھے، کہ ایرانی معاشرہ مذہبی معاشرہ ہے، چنانچہ اپنے سامعین سے نیشنلزم سے گریز کرتے تھے اور اِس امر پر زور دیتے تھے کہ ''ایران کی تاریخ'' سمجھنے کے لیے اولاً اِسلام کا سمجھنا ضروری ہے۔

مغرب زدہ ذہنوں سے بھگتنے کے بعد آپ نے ایرانی علماء کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جس میں آپ نے کہا، کہ آپ کی کتاب ''اسلام شناسی'' سائنسی اور صحیح طور پر اِسلام سمجھنے کے لیے

Marfat.com

''فارسی'' زبان میں پہلا اقدام ہے۔ کتاب ''اِسلام شناسی'' میں آپ نے اِسلام کی چودہ خصوصیات گنوائی ہیں، جو ایران میں جاری اقدار سے الگ ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ سمجھنا ضروری ہے، کہ آپ کے اپنے نقطۂ نظر ''ابتدائی اسلام'' کی آزادانہ تفسیر ابتدائی اِسلامی ذرائع سے ہے۔ جس وجہ سے آپ ایرانی شیعہ علماء کی تنقید کا نشانہ بنے، کہ آپ نے ''غیر شیعی'' ذرائع بھی کام میں لائے ہیں، جن میں قرآنِ کریم، احادیث و سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے چار خلفائے راشدینؓ کے حالات کے ساتھ تمام شیعی امام شامل ہیں۔ اِس لحاظ سے ''اِسلام شناسی'' اگر واحد نہیں، البتہ اُن چند ایسی کتابوں میں ایک ایسی ادبی تصنیف ہے، جسے ایک ادبی شاہ کار کہا جا سکتا ہے اور آپ کی ادبی تحقیق کا عکاس ہوتے ہوئے اِسی پر آپ کا زیادہ زور ہے۔ چنانچہ اِس کتاب کی اشاعت نے نوجوانوں کو اتنا متاثر کیا، کہ وہ اپنے ''عظیم استاد'' سے آپ کی تقاریر میں مزید ایسے ادبی کاموں کا مطالبہ کرتے نظر آئے۔ جس کے نتیجہ مین آپ بھی نوجوانوں سے اتنے متاثر ہوئے، کہ آپ نے تقاریر کا سلسلہ چھوڑ کر اپنے پیغام کی تبلیغ اور اُن میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی راہ اختیار کی۔ جس کے نتائج بڑے موثر اور بجلی جیسی لہر دوڑانے کا باعث ہوئے۔ بلکہ ایک موقع پر تو آپ نے اُن کا اپنی تحریروں اور تقریروں میں مذاق تک اڑایا، جو آپ کو یہ مشورہ دے رہے تھے، کہ آپ تحقیق کی بنیاد پر سائنسی فکر سے کام لیں۔ اپنے دفاع میں آپ نے کہا، کہ درپیش مسائل کے حل کے سلسلہ میں اگر میں عملی جدوجہد کی بجائے تحقیقی کام میں مصروف رہوں، تو یہ ''وقت کا ضیاع'' ہوگا۔ چنانچہ ''اِسلام شناسی'' کی اشاعت کے سات سال بعد ۱۹۷۶ء میں آپ کی جدوجہد میں وہی حوالہ جات اور استعارے نظر آتے ہیں، جو اِس کتاب میں ہیں، اور دریں اثنا اپنی عملی جدوجہد اور اپنا پیغام پھیلانے میں اتنے مصروف ہیں، جس میں تحقیق کا کام بڑا کام موجود ہے۔

''اِسلام شناسی'' کی اشاعت سے تین نتائج برآمد ہوئے۔

۱) دورِ اول کے اسلام کی بنیاد پر جو انسانیت کے لیے استثنائی نمونہ ہے، موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق جدید اور جمہوری نظامِ اسلامی

Marfat.com

متعارف کرایا جائے۔

۲) اِس مقصد کے حصول کے لیے درمیان میں جو رُکاوٹیں ہیں، اُن کی نشاندہی کر کے اُن رکاوٹوں کو دُور کیا جائے تاکہ اِسلام کی برکات سے عوام کو مستفید کرنے سے دُنیا آگاہ ہو۔

۳) مسلمان کہلانے کے دعویداروں پر یہ لازم ہے، کہ وہ اِسلام کے بنیادی تقاضوں بالخصوص ''توحید'' پر ایمان رکھتے ہوئے تمام برائیوں کو چیلنج کر کے رکاوٹیں دُور کرنے میں عہدہ برآ ہوں۔

''اِسلام شناسی'' میں آپ کا پہلا مقصد یہ تھا، کہ اِسلام پر جو قدامت پسندی اور ماڈرن ازم کے خلاف جو الزامات ہیں۔ ہم یہ ثابت کریں، کہ اسلام نہ صرف ماڈرن ازم کے نام پر خرابیوں پر قابو پانے پر قادر ہے، بلکہ ماڈرن ازم نے ہی تمام خرابیوں کو پیدا کیا ہے، اور بلا وجہ اور بغیر کسی دلیل اسلام پر الزامات لگائے ہیں، جن کے مقابلہ میں خود حضورِ اکرم ﷺ کا یہ فرمانا ہے، کہ اسلام ''دلیل اور مذہب'' کا مرکب ہے۔ ''جمہوریت'' کے دعویداروں کے جواب میں سیاسی سطح پر اِسلام میں ''شوریٰ'' اور ''اجماع'' کے اصول ایسے اصول ہیں، جو آج سے چودہ صدیاں قبل اِسلام نے عطا کیے تھے، جن میں آزادئ فکر جمہوریت کی رُوح ہے اور اِن کے ساتھ ''اجتہاد'' کا مسلک ہے، جس کے مطابق اسلام ہر دور کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرنے پر قادر ہے۔ جبکہ اقتصادی نظام کے بارے میں اسلام میں ہر طرح کا استحصال ممنوع اور ناجائز ہونے کی وجہ سے ایک ایسا طبقہ اُبھرنے کے امکانات ممکن نہیں جو مساواتِ انسانی کا دُشمن ہے اور ایسا اقتصادی نظام قائم کرنے میں بڑی رکاوٹ ہے، جس کی بنیاد مکمل مساویت پر مبنی ہو۔ جہاں تک نسلِ انسانی کا تعلق ہے، قرآنِ کریم اِسے ایک ہی Man's Common Lineage یعنی ایک ہی مرد کی نسل قرار دیتا ہے۔ جس وجہ سے سب برابر ہیں۔ لہٰذا شخصی آزادی اور خود مختاری کا نظریہ اِس سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ''مرد و عورت'' کا موضوع ہے، ایک بار آپ نے کہا تھا، کہ ''اُن کا آغاز اور قسم یکساں ہے۔'' لیکن بعد ازاں قرآنِ کریم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، کہ

Marfat.com

''اِسلام دونوں میں ''مساوات'' کی بجائے فطری طور پر اپنے اپنے دائرے میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔'' اِس کے بعد انسانیت اور اُس کی تاریخ کے بارے میں آپ کے ڈارون، ہیگل اور مارکس وغیرہ کے نظریات کا ذکر عجیب قسم کا گورکھ دھندا ہیں، لیکن ''اِسلام شناسی'' کا دوسرا مقصد علامہ اقبالؒ کے اِن دو اشعار کی تفسیر نظر آتا ہے۔

زباں سے کہہ بھی دیا لا اِلٰہ تو کیا حاصل
دِل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

چنانچہ اِس بارے میں آپ اُن سکالرز اور ماہرینِ علوم کا پردہ کھولنا چاہتے ہیں، جو ''عوامی حقوقِ حکمرانی'' کے نام پر ''احکامِ حکومتِ الٰہیہ'' کی تابعداری کے منکر ہیں۔ اِس سلسلہ میں آپ کے دو اہداف ہیں۔

۱) شہنشاہیت

۲) روایتی مُلّائیت

اِس بارے میں آپ کا دعویٰ ہے، کہ صنم پرستی یا بُت پرستی صرف اللہ تعالیٰ کے انکار کا نام نہیں، بلکہ وہ افراد جو اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ کرنے اور بجائے اپنے خود ساختہ احکامات جاری کرتے ہیں، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا متبادل قرار دینے کے سزاوار ہیں۔ اندھا دُھند شخصیت پرستی بہ الفاظ دیگر بُت پرستی ہی ہے۔ اِس بارے میں آپ نے مزید لکھا کہ:

''وہ شخص جو اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی ٹھوپتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کہنے کا دعویدار ہے اور جو لوگ خواستہ اور بادلِ ناخواستہ اِس زبردستی کے قائل اور عامل ہیں، وہ اُسے ''شریکِ خدا'' جان کر بُت پرست ہو جاتے ہیں، جبکہ مکمل حاکمیت، مشیت، قوت و طاقت، برتری اور ملکیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔''

Marfat.com

اِس سلسلہ میں آپ نے بادشاہت کا نام لے کر اُس پر حملہ نہیں کیا۔ لیکن آپ کا مقصد اور نشانہ واضح تھا۔ مُلّائیت کی تقلید کے بارے میں آپ کی فکر مزید واضح تھی۔ اِس بارے میں آپ کا کہنا تھا کہ:

''جو شخص کسی مذہبی عالم کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور بلا سوچے سمجھے اُس کی ہر بات پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اور اُس کے ہر غلط اور صحیح فیصلہ کو ایمان کا درجہ دے کر اُس پر عمل کرتا ہے، ایسا انسان میری نظروں میں بُت پرست ہے اور ایسے ''مسلمان'' کو میں ''مذہبی بُت پرست'' کہوں گا۔

علی شریعتی کا مزید کہنا تھا کہ:

''اسلام کسی ایسی مذہبی تنظیم کی اجازت نہیں دیتا، جس میں وہ ایک مرکز بن کر ''اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان تعلق میں حائل ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان تعلق بلا واسطہ ہے۔''

جبکہ اِس کے نتیجہ میں مذہب ایسی شکل اختیار کرے گا۔ جس کا ردِ عمل یہ ہوگا، کہ ایسے اداروں کو ''مذہب اور مُلّائیت'' کے ٹھیکیدار سمجھا جائے گا۔

''اسلام شناسی'' میں آپ کا تیسرا مقصد سچے مسلمانوں کے لیے ایسی ''بُت پرستی'' کا ردّ تھا۔ جس میں یہ مذہبی ٹھیکیدار اپنے آپ کو خدا کا درجہ دینا اپنی شان سمجھتے ہیں۔

جب آپ نے یہ محسوس کیا کہ عوام ایک اچھی تبدیلی چاہتے ہیں لیکن اُن پر ظالم اور جابر اور ناانصاف حکومت کا خوف طاری ہے، تو عوام کو اِس خوف سے نکالنے کی راہ اختیار کی۔ جس میں آپ نے ''جہالت، خوف اور استحصالیت'' کی تثلیث کو تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا، جن میں تمام جرائم، بدکاریاں اور گناہ، تمام بُرائیاں اور بداخلاقیاں اور بدکرداریاں شامل ہیں۔ جن کو دُور کرنے کے لیے ''مسلمان'' کا ''موحد'' ہونا ضروری ہے، جو اِس تثلیث کو دُور کرنے کے لیے میدانِ عمل میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر نکل آئے، ایسے میں وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگا۔ آپ اِس یقینِ کامل کے حامل تھے، کہ انسان صرف اِس امر کا پابند ہے، کہ اُس کے دل اور ضمیر میں

Marfat.com

سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی دیگر کا ذرا خوف نہ ہو، کہ اُسی کی ذات قادرِ مطلق ہے اور صرف اُس کی ذات ہی کے سامنے سجدہ ریزی اس کے احکام پر عمل اپنا ایمان قرار دے، جس کے سامنے باقی سب بے بس ہیں، جبکہ اِن خصوصیات کا حامل مسلمان ''موحد'' ہی ایک ''مثالی اِسلامی انقلابی'' کہا جا سکتا ہے۔ ایسے ''موحد'' مسلمان کی دیگر خصوصیات نڈر، بے خوف، بے غرض، قابلِ اعتماد اور احتیاج سے عاری ہونا ہیں۔ جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے آگے جھکنے کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہ جھکے۔ اِس لحاظ سے آپ کی یہ عوامی پکار ایسی سیاسی دعوت ہے، جس کے مطابق خوفِ خدا کی بجائے کسی دیگر طاقت کا خوف اپنے اُوپر طاری کرنا اور اُس کی متابعت کرنا ''شرک'' ہے، جس کا انکار اور مقابلہ کرنا جس میں آمریت، سرمایہ دارانہ نظام اور نفع خور سرکاری علما شامل ہیں۔ آپ اِس عقیدے کے مالک تھے، کہ ایسے لوگ ''مُشرک'' کی صف میں آتے ہیں، جن کے ساتھ ''موحد'' مفاہمت کی بات نہیں کر سکتے اور کسی مفاہمت کی بجائے بطور سماجی اور معاشرتی کارکن معاشرے میں ایک اِسلامی تاریخی انقلاب لانے کے لیے اُٹھیں، اُن کا کہنا تھا کہ مشرکانہ عالمی نظریات کئی تضادات کا شکار ہیں۔ جبکہ ''توحید'' تضادات کو مٹانے کا عالمی نظریہ ہے اور تمام ''جھوٹے خداؤں'' کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی داعی۔

۱۹۶۹ء میں ''اِسلام شناسی'' کی اشاعت کے بعد بعض مذہبی حلقوں نے (جن کو محدود سوچ کے مالک مطلب پرست کہا جا سکتا ہے) اپنا نشانہ بنالیا۔ جس کے جواب میں آپ نے اُن کے بارے میں سخت ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا، کہ یہ لوگ اصل اسلام کی غلط ترجمانی سے کام لینے والے ہیں۔ جبکہ آپ کا عوام کی مذہبی رسومات اور عقائد سے کوئی تعلق نہیں، وہ جو چاہیں اور جس طرح کریں۔ اس میں وہ آزاد ہیں، اُن کا مقصد تو سماجی مشکلات اور مصائب پر قابو پانا ہے۔ ''رُوحانیت'' کے نام پر عوام کو عملی جدوجہد سے دُور کرنے والے مذہبی علماء کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے آپ نے کہا، کہ اِن لوگوں کا سماجی اور سیاسی کردار دراصل ظالم حکمرانوں اور اقتصادی استحصالی طاقتوں کو اپنے ظلم اور استحصال کو عوام پر جاری رکھنے کے مترادف ہے۔ آپ

Marfat.com

نے اِس امر پر زور دیتے ہوئے کہا، کہ حکمران طبقہ تین واضح اور آپس میں باہمی گٹھ جوڑ پر مبنی ہے۔
(ا) سیاسی (۲) اقتصادی (۳) مذہبی۔

اور اسلام کی تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ ایک اسلام اُس ''حکمران طبقہ'' کا اِسلام ہے، جس نے اِسلام کو ''ایک ادارہ کی شکل'' دے کر ہر معاملہ میں اپنی بالا دستی قائم رکھنا ہے، اور دوسرا اُس طبقہ کے لوگوں کا اسلام ہے جو ہر قیمت پر نا انصافی اور ظلم کے خلاف جنگ آزما ہیں۔ مؤخرالذکر اِسلام کو آپ نے ''دھماکہ خیز'' Dynamic Islam قرار دیا اور کہا، کہ مذہبی ادارے عوام کو جہالت اور علم سے خالی رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور اِن ''شیعی فقہا'' کے بارے میں کہا، کہ اِن کے اسلام کی بنیاد ''مبہم ایمان'' کی بنیاد پر ہے، جس کا مطلب ''مومنوں کی کمائی'' میں اِن کا حصہ ہے۔ جس سے اِن کا انحصار بطور اُن کی جائیدادوں اور ملکیتوں کے محافظ کے طور پر ہوگئی۔

علی شریعتی کے اِن خیالات اور بڑے پُر زور طریقہ پر عوام میں اُن کے اظہار کے نتیجہ میں یہ امر حیران کن نہیں تھا، کہ بزعمِ خود مخالف علمی طبقہ نہ بھڑک اُٹھے، چنانچہ اُس نے بھی جواب میں آپ کو غیر شیعہ، غلطیوں کا پُتلا، یاوہ گو اور دیگر ایسے ہی الفاظ استعمال کیے، اُسے قابلِ مذمت قرار دینے کے ساتھ اُس کے علمی کاموں کے خلاف دُشنام طرازی سے کام لیا۔ اِس سے بڑھ کر مذہبی طور سے آپ کو بدنام کرنے کے لیے جو بھی حربے کام میں لائے جاسکتے تھے، اُن میں کوئی بخل نہ برتا۔ اِس حلقہ کے بڑے پیمانے پر شائع ہونے والے میگزین ''درس ہائے مکتبہ اسلامی'' نے آپ کی کتاب ''اسلام شناسی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب اور اِس کے دلائل بے بنیاد، غلط اور اِسلامی ماہرین کے نزدیک کسی بحث کی بجائے غیر اسلامی ہیں۔ آپ کے ایک سب سے مخالف مذہبی عالم شیخ محمد علی انصاری نے آپ کے بارے میں لکھا:

> ''ہم حکومت شہنشاہیت ایران کو بڑے پُر زور انداز میں یہ توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ گزشتہ ایک ہزار سالہ ایران اور اُس کی شیعی تاریخ میں ایرانی عوام اور ایرانی علماء کو علی شریعتی سے بڑھ کر خطرناک اور سخت ترین دشمن سے سابقہ پیش

Marfat.com

نہیں آیا ہے۔"

تیسرا دور، اصولِ محاذ آرائی:

ایران میں آپ کے قیام کا تیسرا دور وہ ہے، جس میں آپ عوام کو صرف غور وفکر کی بجائے سیاسی عمل اور بغاوت کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ جس میں آپ اواخر ماہِ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے آپ پبلک اجتماعات کو خطاب کرنے کے ساتھ اپنی تحریروں سے آغاز کرتے ہیں، جو ۱۹/ نومبر ۱۹۷۲ء "حسینیہ ارشاد" کے بند ہونے تک جاری رہتا ہے۔ جبکہ آپ کو جون ۱۹۷۱ء میں مشہد یونیورسٹی سے تبدیل کر کے تہران بھیج دیا گیا، "حسینیہ ارشاد" کے بند ہونے تک کے عرصہ میں جس کو آپ "اِسلامی یونیورسٹی" کی شکل دینا چاہتے تھے، آپ نے اِس دوران اپنا تمام وقت اور صلاحیتیں "حسینیہ ارشاد" کو ایک ماڈرن اور ریڈیکل ادارہ بنانے میں صرف کیں۔ ۱۹۷۱ء میں ایران میں سیاسی سرگرمیوں نے "حسینیہ ارشاد" کو ایک اہم کردار ادا کرنے کا موقعہ دیا۔ جس نے نوجوان نسل میں مقبولیت حاصل کرنے کے ساتھ مسلح محاذ آرائی کی طرف مائل کر دیا۔

ہم عصر ایران کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۷۱ء کا سال بڑا تاریخ ساز سال ہے، کہ اِس سال شاہ نے اندرونِ ملک اور بیرونی طاقتوں کے سامنے ہر طرح کے "مختارِ مطلق" ہونے کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ جس میں اُس نے ایران کی ڈھائی ہزار سالہ بادشاہی شاندار تاریخ کی شاہانہ تقریبات کا جشن منایا، جس میں دُنیا بھر کے سربراہوں اور حکمرانوں نے شرکت کی۔ یہ تقریبات ایران کے قدیم شہر "پیرس پولیس" Persipolis میں منعقد ہوئیں۔ جس میں شاہ کا واضح پیغام تھا کہ آج اگر ایران دورِ حاضر میں ماڈرن ازم اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے، جس میں اُس نے اپنے آپ کو پہلوی خاندان کا وارث شاہی خاندان قرار دیا۔ جبکہ اُس کے خلاف مسلح محاذ آرائی اُس کی غیر مقبولیت اور اُس کے زوال کی نشاندہی کر رہی تھی۔

اس سے قبل ۸/ فروری ۱۹۷۰ء کو صوبہ گیلان کے جنگلاتی اور پہاڑی علاقہ کے ایران کی کمیونسٹ پارٹی کے غیر معمولی مسلح نوافراد نے ایک گاؤں "سیاہ کل" پر قبضہ کر لیا تھا۔ جس کے ۱۹

روز بعد ایک سرکاری فوجی دستہ نے گاؤں کا محاصرہ کر کے باغیوں کے سرغنہ "علی اکبر صفائی فراحانی" اُس کے ساتھی جلیل انفرادی اور ہوشنگ نازری کو اہلِ گاؤں کی مدد سے قیدی بنالیا تھا اور باقی دورانِ مقابلہ ہلاک ہو گئے۔ "سیاہ کل" چوکی پر حملہ اور قبضہ سے قبل تہران اور گیلان سے فوجی دستوں نے "فدایان" کمیونسٹ تنظیم کے چند مزید افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ ۱۹ر مارچ ۱۹۷۱ء کے روز حکومت نے تیرہ افراد کی فہرست جاری کی، جن کو حکومت نے بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے گولیوں کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ اگرچہ حکومت نے ابتدائی طور پر بغاوت پر قابو پالیا۔ لیکن اِس واقعہ نے ایرانی دیہاتی آبادی اور عوام میں پہلوی شاہی خاندان کی حکومت کے خلاف ایک تحریک کا آغاز کر دیا۔ جبکہ اُن کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ ایران میں مسلح بغاوت کے ذریعہ کوئی انقلاب لانا ممکن نہیں، جیسا کہ کیوبا اور چین میں انقلاب آتے ہیں۔ تاہم "سیاہ کل" کے واقعہ کے بعد ایک مسلح تنظیم "اِسلامی عوامی مجاہدین" نے اپنی مسلح سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ جن کا نشانہ آبی ڈیم اور بجلی گھروں کو تباہ کرنا تھا۔ اِن کارروائیوں سے نپٹنے کے لیے شاہ کی خفیہ پولیس ساواک SAVAK نے کوئی یک صد پانچ افراد کو مسلح سرگرمیوں میں شامل مشتبہ خیال کر کے ۱۹۷۰ء کے موسمِ گرما کے اواخر اور موسمِ خزاں کے شروع میں گرفتار کر لیا تھا۔ اِن کو "اِسلامی عوامی مجاہدین" کے ممبر قرار دیا گیا تھا۔ جن یک صد پانچ افراد کو گرفتار کیا گیا، اُن میں سے ۶۹ افراد پر ۱۹۷۲ء کے موسم بہار میں مقدمہ چلایا گیا۔ جن میں محمد حنیف نژاد، سعید محسن، علی اصغر، بدیع زدگان کو تنظیم کے بانی اور دیگر چھ افراد کو مجرم قرار دیکر اپریل، مئی ۱۹۷۲ء میں سزائے موت دےدی گئی۔

گوریلا سرگرمیوں اور اِن میں ملوث افراد کو سزائے موت دیئے جانے کے عمل نے علی شریعتی کی سرگرمیوں کو متاثر کیا۔ آپ اِن گوریلا سرگرمیوں کے حق میں نہیں تھے۔ جبکہ یہ مسلح سرگرمیاں عوامی مقبولیت پا گئی تھیں جن میں کئی دیگر تنظیمیں ملوث تھیں۔ لیکن پہلوی بادشاہت کے خلاف جو مسلح جدوجہد شروع ہو گئی تھی ایسی جدوجہد کے مخالف ہونے اور بادشاہت کے مخالف ہونے سے خود کو غیر متعلق بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ شہری جھڑپیں اور

Marfat.com

ذرائع ابلاغ میں اِن کی تشہیر عوام میں سیاسی اور سوشل بیداری پیدا کرتی جا رہی تھیں۔ مزید برآں وہ لوگ جو قید کر دیئے گئے، سزائے موت دیئے گئے یا مسلح مقابلہ میں ہلاک ہوئے، اُن میں سے بعض آپ کے شناسا اور دوست تھے۔ اِن میں سے مسعود احمد زادہ اور امیر پرویز پویاں جو دونوں ''اسلامی عوامی مجاہدین'' کے بانی تھے، وہ دونوں مشہد سے تعلق رکھتے تھے، جن میں سے اول الذکر کو مقدمہ بغاوت کے جُرم میں گولیوں سے قتل کر دیا گیا جبکہ مؤخرالذکر نے جو اپنے گھر میں محصور ہو کر حکومت کا مقابلہ کر رہے تھے، ۱۹۷۱ء میں موسمِ گرما میں خودکشی کر لی۔ دونوں کی علی شریعتی سے مُراسلت اور بات چیت ہوتی تھی، لیکن دونوں علی شریعتی سے قومی اور معاشرتی معاملات کے حل میں آپ کے طریقۂ عمل سے اختلاف رکھتے تھے، جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے، کہا جاتا ہے کہ جناب علی شریعتی نے اِن دونوں سے اور اِس تنظیم کے دیگر دو رہنماؤں حامد توکل اور سعید آریان سے وقتاً فوقتاً ملاقات کی اور اپنا مؤقف تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ جب آپ مشہد یونیورسٹی میں تھے۔ جبکہ یہ دونوں بھی ۷۲-۱۹۷۱ء کے موسمِ سرما میں حکومت کی سکیوریٹی فورسز کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ آپ کا مؤقف یہ تھا، جسے آپ نے اِن سے منوانے کی کوشش کی، کہ گوریلا جنگ کی بجائے ملک میں اسلامی نظریاتی انقلاب لانے کی ضرورت ہے، جو عوامی مسائل کو حل کرنے والا ہو۔ لیکن ملک میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف لہر اُٹھی، جن کی باگ ڈور خود آپ کے دوستوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ کے لہجہ میں، آپ کی تقریروں میں بھی شدت آگئی بلکہ اشتعال انگیز آتش بیانی اور محاربہ آرائی اختیار کر گئیں۔

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں شاندار شاہی حکومت کی ڈھائی ہزار سالہ تقریبات منائی گئیں اور اُس دور کے شہنشاہ خسرو اعظم کے پرسی پولس میں اُس کے مزار پر اِس بات کا ڈھول بجایا، کہ وہ اِس قدیم عظیم تہذیب کی طرف لے جا رہا ہے، جس کے جواب میں علی شریعتی نے کہا کہ ایران گزشتہ پانچ ہزار سال سے ظلم و ناانصافی، محرومی اور طبقاتی حکمرانی کا شکار رہے۔ اپنی عوامی تقاریر میں بادشاہت کا نام لیے بغیر اشارہ کرتے

Marfat.com

ہوئے کہا، کہ جولوگ بڑھ چڑھ کر ''قدیم عظیم تہذیب'' کے احیاء کی باتیں کررہے ہیں، ان کا عوام پر سوائے ظلم کے کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے، لیکن اِس کے باوجود یہ لوگ اپنے الفاظ سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں، کہ عوام اُن کے ساتھ ہیں اور یہ خود بڑے منصف اور اُن کے محسن ہیں۔ اِسی تقریر میں آپ نے کہا، کہ عوام کو حضرت علیؓ جیسے مسیحا کی ضرورت ہے، جو عوام کو اپنی تلوار کی طاقت سے آزادی دلائے، اور ایسے نظام کی بنیاد رکھے، جس میں انصاف ہو، اتحاد ہو اور صحیح اسلامی فکر ہو۔

۱۳ر نومبر ۱۹۷۱ء کی اپنی معرکۃ آرا تقریر میں آپ نے ''انقلابی اہلِ تشیع'' جن کو حضرت امام علیؓ کے ناطے ''سچے شیعی'' قرار دیتے ہوئے ''علوی شیعہ'' کا نام دیا، اُن کو یہ ذمہ داریاں ادا کرنے کا مستوجب ٹھہرایا۔

۱) ناانصافی کا مقابلہ کریں، حتیٰ کہ جان کی قربانی بھی دینی پڑے۔

۲) حکمران کو مجبور کریں کہ ''وہ دیانتدار اور منصف ہو''۔

۳) ظلم، استحصال، آمریت، طبقاتی حاکمیت اور ناانصافی کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور بلاخوف ہر طرح کی جہالت دُور کرنے کی خاطر میدان میں اُتریں۔

بہ الفاظ دیگر آپ اُس اقتصادی اور سیاسی نظام کا تختہ اُلٹنے کا مطالبہ کررہے تھے، جو شاہ کی سربراہی میں قائم اور جاری تھا۔

اِسی تقریر میں آپ نے اپنے سامعین کو حضرت امام حسینؓ اور اپنے رفقا کی جانی قربانیوں کی یاددہانی کرائی، جبکہ مقابلہ بدترین طاقت ایک اور یکصد سے زائد کے خلاف تھا، جس میں یزید کی حکمرانی شر اور ناانصافی کی حکمرانی تھی۔ یہاں آپ نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے بڑا مشہور نعرہ لگا کر اُن کو ہیبت زدہ کردیا۔

۱) سال کا ہر ماہ محرم ہے۔

۲) ہر ماہ عاشورہ ہے۔

Marfat.com

۳) ہر قطعۂ زمین کربلا ہے۔

اِس لحاظ سے آپ کی تقریر اُن لوگوں کے لیے جو شیعیت سے ذرا بھی تعلق رکھتے ہوں، پیغام بڑا واضح تھا۔

ایران میں روزمرہ کی زندگی اور ہر جگہ کے عوام کے لیے ''محرم''، ''عاشورہ'' اور ''کربلا'' کا استعمال مسلح جدوجہد کی دعوت تھی۔ جس میں آپ نے ایران کی سرزمین کو ''انصاف اور ناانصافی''، ''مقدس اور خبیث'' اور ''خیروشر'' کے درمیان جنگ کا اکھاڑہ قرار دیا۔ نہ صرف اِس پر اکتفا کی، بلکہ یہاں تک کہا، کہ ''وقت آگیا ہے، کہ ہر شخص شاہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو، جس نے ایران کا سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام درہم برہم کر دیا ہے۔''

اِس تقریر کے نتائج بتدریج آٹھ سال بعد انقلاب کی صورت میں رُونما ہوئے، جب لاکھوں کی تعداد میں ایرانی قوم نے بادشاہ کو اپنا بوریا بستر باندھ کر گوشہ گمنامی میں بھیج دیا۔ لیکن اِس تقریر کے بعد آٹھ سال کا عرصہ آپ پر بادشاہت اور سرکاری مُلّائیت کی طرف سے مصائب و مظالم کا ہر سطح پر گزرا۔ جو اِس اَمر پر شاہد ہیں کہ آمریت اور پیشہ ور مُلّائیت یا علما کا ہمیشہ اتحاد رہا ہے، جس وجہ سے صدیوں سے اُمتِ مسلمہ مجموعی طور پر مظلومیت و غُربت میں مبتلا چلی آ رہی ہے۔

آپ کی ۱۳ر نومبر ۱۹۷۳ء کی معرکۃ الاراء تقریر سے حکومت اور پیشہ ور سرکاری مُلّائیت دونوں ہل کر رہ گئیں اور صرف ہفتہ کے بعد ۱۹ر نومبر ۱۹۷۲ء کو ''حسینیہ ارشاد'' بند کر دیا گیا، کہ آپ نے واضح طور پر ظلم و جبر کی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کو مناسب ''شیعی اِسلام'' قرار دیا تھا۔ حسینیہ ارشاد کے بند ہو جانے کے بعد مذہب کی اجارہ دار مُلّائیت کے لیے وہ خطرہ ٹل گیا، جو علی شریعتی کی کھلم کھلا تقریروں کی وجہ سے رُونما ہو گیا تھا اور اِس اجارہ دار طبقہ نے آپ کے ''حسینیہ ارشاد'' کے خلاف دس کے قریب کتابیں شائع کیں۔ جن میں آپ کو ''گمراہ''، ''مکّار'' شخص قرار دیا گیا، جو نوجوان نسل کو گمراہ کر رہا ہے۔ اِن میں آیت اللہ خُوئی، میلانی، رُوحانی اور طباطبائی جو ''مرجع تقلید'' بن گئے تھے،

Marfat.com

اِن سب نے مل کر آپ کی تمام کتب خریدنے، فروخت کرنے اور پڑھنے کے خلاف ''فتویٰ'' جاری کر کے ممنوع قرار دیدیا۔ مزید برآں اِن لوگوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت نامہ جاری کیا کہ وہ آپ کی تقاریر سننے سے ہر طرح سے گریز کریں۔ تاہم کہا جاتا ہے، کہ ''حسینیہ ارشاد'' شاہ کے شیراز کے شاہی دورے سے قبل اکتوبر ۱۹۷۲ء میں بند کر دیا گیا تھا۔ جبکہ بعض شاہ پرست مُلّاؤں نے علی شریعتی کو ''علوی شیعہ'' اور ''صفوی شیعہ'' قرار دے کر شاہ سے آپ کو خاموش کرنے کی استدعا کی۔

چوتھا مرحلہ: خاموشی اور قید و بند:

پیرس سے آپ کی واپسی کے بعد آپ کی زندگی کا چوتھا مرحلہ ''حسینیہ ارشاد'' کے بند کیے جانے کے بعد شروع ہوتا ہے، کہ آپ کی عوام میں بڑھتی مقبولیت سے خائف ہونے کی وجہ سے آپ کا سیاسی اور سماجی عوام سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ نہ صرف اِس پر اکتفا کیا گیا بلکہ متعدد افراد جو ''حسینیہ ارشاد'' میں آپ کی تقاریر سننے کے لیے آتے تھے، کو بلا کسی عدالتی شنوائی سیکوریٹی فورسز نے گرفتار یا قتل کر دیا اور حکومت اِس غلط فہمی کا شکار ہوگئی، کہ آپ کمیونسٹ ''عوامی مجاہدین'' کے حامی اور ساتھی ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اگر ''حسینیہ ارشاد'' کو بند نہ کیا جاتا تو عوام میں جو مارکسسٹ خیالات کے حامی تھے، ''حسینیہ ارشاد'' کے بند ہونے کے نتیجہ میں اُس کے اثرات بڑھ گئے۔ جس پر بعد ازاں حکومت کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا، کہ شریعتی کی فکر کی بنیاد اِسلام ہے، نہ کہ سیکولر سوشلزم، مگر وقت حکومت کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اُسے حالات کو بہتر کرنے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکاری مُلّاؤں نے مطالبہ کیا کہ علی شریعتی سے کسی مفاہمت اور مصالحت کی بجائے ان کے لیکچروں کو ''باغیانہ'' لٹریچر قرار دے کر ان کو قید کر دیا جائے اور مطالبہ کیا گیا کہ آپ معافی مانگیں۔

اِس صورتِ حال کو دیکھ کر آپ روپوش ہو گئے اور اپنا گھر چھوڑ کر اپنے کسی عزیز یا کسی دوست کے ہاں پناہ اختیار کی۔ جو حکومت کو راس نہ آئی اور سیکوریٹی فورسز نے آپ کے والد محمد تقی

Marfat.com

شریعتی اور آپ کے بہنوئی رضی شریعت رضوی کو اگست ۱۹۷۳ء میں گرفتار کر لیا۔ جبکہ آپ کے دیگر دو دوستوں کو اس شرط پر یرغمال بنا لیا کہ علی شریعتی اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کر دیں۔ تو ان یرغمالیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔

چنانچہ حکومت کے ساتھ آپ کے رشتہ داروں اور دوستوں کے قریباً ایک ماہ کے طویل مذاکرات کے بعد آپ نے اپنے آپ کو ستمبر ۱۹۷۳ء میں حکومت کے حوالہ کر دیا۔ جس کے بعد حکومت نے مختلف تفتیشی مراحل سے گزارنے کے بعد جن میں کمیونسٹ ''عوامی مجاہدین'' کے ساتھ تعلقات اور اپنے اصل مقاصد کا بھی ذکر تھا، آپ کو اٹھارہ ماہ کے لیے اذیت ناک جیل ''کومیتہ'' Komiteh کی قید تنہائی میں قید کر دیا۔

اِس بدنام جیل میں اُن سیاسی قیدیوں کو قید کیا جاتا تھا، جو عموماً نئے سیاستدان ہوتے تھے۔ جن کو عارضی طور پر اِس مقصد کے لیے قید کیا جاتا تھا کہ اُن کو کسی عدالت میں پیش کیے جانے سے قبل ایسے سخت تفتیشی مراحل سے گزارا جائے کہ حکومت اپنی مرضی کے مطابق ''اعترافِ جُرم'' کرا سکے۔ حکومت یہ خوب جانتی تھی کہ آپ کوئی معمولی قیدی نہ تھے۔ بلکہ نوجوانوں میں ایک مقبولِ عوام شخصیت تھی۔ تاہم جیل میں جیل کے دیگر قیدیوں کے مقابلہ میں آپ کو بعض سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ آپ کو کتب بینی اور تحریر و رقم کے علاوہ علیحدہ برتن اور سگریٹ مطابق ضرورت مہیا تھے۔ اِس سلسلہ میں ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے، کہ یہ بدنام جیل آپ کے لیے مستقل قید میں رکھنے کے لیے تھی، لیکن اِس جیل میں آپ کو تمام سہولتیں حاصل تھیں، جو عام قید خانوں میں قیدیوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ دراصل اُن دنوں میں ایران کے سیاسی اور دانشور قسم کے قیدیوں کے لیے حکومت کا یہ دستور تھا، کہ وہ عوام کے سامنے ایک انٹرویو کے ذریعہ اپنے جُرم کا اعتراف کریں، جس کے نتیجہ میں حکومت اُن کو رہا کر دے۔ لیکن اِس طویل اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں حکومت کے ہر طرح کے دباؤ اور تشدد کے باوجود آپ کے انکار نے حکومت کو بُری طرح مایوس کر دیا۔

Marfat.com

پانچواں مرحلہ: آپ کی تنہائی اور حکومت کا رویہ:

پیرس سے واپسی کے بعد یہ آپ کی زندگی کا ایران میں پانچویں اور آخری دور ہے، جس کا آغاز آپ کی جیل سے رہائی ہے، کہ آپ پر کوئی مقدمہ چلائے بغیر مارچ ۱۹۷۵ء میں رہا کر دیا گیا۔ جس کا پس منظر یہ ہے، کہ ۱۹۷۵ء میں الجزائر کے دارالحکومت میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کی تنظیم ''اوپیک'' OPEC کا اجلاس منعقد ہوا۔ اُس وقت الجزائر کے وزیر خارجہ عبدالعزیز بُوطفلیکہ تھے، جن سے آپ کے اُس وقت سے روابط تھے، جب بوطفلیکہ بھی پیرس میں زیرِ تعلیم ہونے کے ساتھ الجزائری سیاسی تنظیم ایف ایل این FLN کے اہم رہنما تھے۔ چنانچہ آپ کی یہ رہائی جناب بوطفلیکہ کی گزارش کی مرہون تھی۔ اِس گزارش پر آپ کو رہا تو کر دیا گیا لیکن کڑی نگرانی کے ساتھ۔

اِس دوران جہاں آپ کی تمام تصانیف کی اشاعت ممنوع تھی، وہاں کسی کے پاس آپ کی کسی تصنیف ہونا اور اُس کا مطالعہ کرنا بھی قابلِ سزا جرم تھا۔ جبکہ یہ پابندی نہ صرف بے سُود ثابت ہوئی، بلکہ عوامی ردِعمل نے اِس کے مطالعہ کنندگان میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا اور اِس سے بڑھ کر آپ کی شہرت میں اِس قدر اضافہ کر دیا، کہ آپ کے حامی حکومت کے خلاف ہر طرح کے اقدامات کرنے پر تُل گئے، حتیٰ کہ وہ لوگ جو آپ کو رومانوی قسم کا مصلح خیال کرتے تھے، اُن کا بھی ہر طرح کی پیش کش قبول کرنے سے انکار نے حکومت کو ایک سخت دھچکا لگایا، کہ کوئی نہ کوئی پیش کش حکومت کا وقار و بھرم قائم رکھنے میں مددگار ہو۔ تاہم اپنا بھرم قائم رکھنے میں ایک عذر تراشا، کہ رہائی سے قبل آپ نے یقین دلایا تھا، کہ آپ مارکسزم، سوشلزم اور مسلح انقلاب کے خلاف ہیں۔ یہاں ایک اور قابلِ ذکر امر ہے کہ آپ نے ۱۹۶۷ء ''اِحسان، اسلام وکلیۂ مغرب زمین'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ تقاریر کیا تھا، جو بڑا اہم لیکن کہیں پردوں میں پڑا تھا۔ جبکہ ایران کے مشہور روزنامہ ''کیہان'' Kehan نے سلسلہ وار اِسے شائع کرنا شروع کر دیا اور قارئین یہ خیال کرتے نظر آئے، کہ آپ کے یہ مضامین جیل

Marfat.com

میں تحریر کیے گئے ہیں، حالانکہ "کیہان" میں جب پہلا شمارہ شائع ہوا، تو یہ آپ کے بغیر علم اور منظوری شائع ہوا۔ جبکہ قارئین کو اِس بات، کا علم نہ تھا، کہ کب یہ مضامین لکھے گئے ہیں اور آیا کہ اشاعت میں آپ کو اِس کا علم یا منظوری بھی حاصل ہے جبکہ اتنی حقیقت ضروری ہے، کہ عرصہ جیل میں آپ کو اسے پاس کتابیں رکھنے اور لکھنے کی آزادی تھی جس سے یہ خیال کیا گیا، کہ یہ مضامین جیل میں تحریر میں لائے گئے ہیں۔

عالمِ مغرب کی "بے راہ روی" اور کمیونزم پر ضرب لگاتے ہوئے آپ نے اِن کو اِس امر کا مجرم قرار دیا، کہ یہ دونوں فطرتِ انسانی کا شعور نہ رکھنے کی وجہ سے حالات درست کرنے کے نااہل ہیں۔ البتہ عالمِ مغرب کی "لبرل ازم" کی کھُلی نفی کرتے ہوئے "اِسلام" اور "کمیونزم" کو ایک دوسرے کی مخالف انتہائیں قرار دیا، اور یہ قرار دیا کہ دونوں کامل نظریات ہیں، اِس حقیقت کے ساتھ کہ اگر اسلام کمیونزم کے نظریہ کو اپنائے تو اُس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر کمیونزم اسلام کا نظریہ اپنائے، تو اُس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ یہ مضمون "کیہان" میں شائع ہوا، یہ مضمون "کیہان" میں علی شریعتی کے علم اور رضامندی کے بغیر شائع ہوا، جبکہ "کیہان" ایک نیم سرکاری اخبار ہے۔ اِس لحاظ سے اِس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ مضمون حکومت کی منظوری سے اِس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے شائع ہوا کہ حکومت یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی، کہ جہاں علی شریعتی "اِسلام اور سوشلزم کے درمیان کسی مصالحت کے قائل نہیں، وہاں پرائیویٹ زندگی میں معمول کی روایات جائز قرار دیتے ہیں۔"

اِس مضمون کو سیکوریٹی فورسز نے "اِسلام خلاف مارکسزم" کا عنوان دیا۔ اِس مضمون کی اشاعت نے حکومت کو اپنے حق میں اچھا خاصہ موقع فراہم کر دیا۔ جس سے آپ انکار نہ کر سکے، کہ یہ آپ کی تحریر نہیں ہے۔ البتہ آپ اِس امر پر ڈٹے رہے کہ ۱۹۶۷ء میں آپ کے جو خیالات تھے، کہ اسلام کو نافذ کرنے کے لیے جو طریقہ کار مطلوب ہے وہ سوشلزم طریقہ کے ذریعہ لایا جا سکتا ہے۔ تاہم آپ اِس امر پر ڈٹ گئے کہ حکومت

Marfat.com

نے جہاں آپ کو تنہا کر دیا ہے اور اِس کے ساتھ مذہب دشمنی کی بے بنیاد مہم چلائی ہے وہ اِن کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ آپ نے تحریری کام کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دوست حلقوں، پرانے طلبا اور عزیزوں میں ایک بار پھر حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ ہمہ وقت حکومت کی نگرانی میں ہونے کے نتیجہ میں پریشان ہو کر آپ دِن کا بیشتر وقت سونے میں گزارتے۔ بعدازاں زیادہ تر رات کے حصہ میں ملاقاتیں اور علی الصبح تہران کی گلیوں عوام سے ملتے۔

مارچ ۱۹۷۵ء میں جب آپ کو رہا کیا گیا اور مئی ۱۹۷۷ء میں جب آپ نے ایران کو خاموشی سے الوداع کہا۔ رہائی کے بعد کا عرصہ "کیا کھویا کیا پایا" کا جائزہ لینے پر مشتمل ہے۔ ایران کو الوداع کہنے سے قبل آپ نے ۱۰ر جنوری ۱۹۷۷ء کے روز ایران کی ممتاز سیاسی اور مذہبی شخصیتوں آیت اللہ خامنہ ای، آیت اللہ مطہری اور فخر الدین حجازی سے اُن کے نظریات کے مطابق ایران کے مستقبل کے بارے میں دلچسپ گفتگو کی۔ جن میں بعض باشعور طلبا بھی شامل تھے، اِن ملاقاتوں میں آپ نے اپنی رائے سے بھی اِن اصحاب کو آگاہ کیا۔ آپ کا کہنا تھا، کہ ہمارا مقابلہ دو اسلام دُشمن نظریات کی حامل قوتوں سے ہے۔ اولاً امپیریلزم اور سرمایہ پرستی ہے اور سرمایہ کے زور پر اُسے دُنیا پر آمرانہ حیثیت حاصل ہے، لہٰذا ان سے اسلام کی کسی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِس کے مقابلے میں جبکہ مارکسزم دُشمن کی بجائے حریف ہے۔ جبکہ اِن کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام کی بنیاد پر "اِسلامی منشور" کی ضرورت ہے، جو موجود ہے۔ جسے "عالمی تناظر میں آج کے حالات کے مطابق" تیار کر کے عمل میں لایا جائے اور یہ ایسا اہم فریضہ ہے، جسے عمل میں لانے کے لیے اپنی بقیہ زندگی اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عمر بھر عمل پیرا رہیں گے۔

اِس دو سالہ مختصر عرصہ میں آپ کی تحریریں اپنے دامن میں تین انتہائی مقاصد لیے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اگر تمام تاریخِ انسانی کی تحریکوں، نظریات، فلسفوں، مذاہب اور تمام انقلابوں کا جائزہ لیا جائے، تو وہ یہ ہیں:

۱) انسان: محبت اور تصوف

Marfat.com

۲) آزادی

۳) معاشرتی انصاف کی خواہشیں

آپ نے اِس تثلیث کو (۱) تصوف (۲) آزادی (۳) مساوات کے عنوان سے بھی پیش کیا۔

تصوف کے بارے میں آپ کا کہنا تھا، کہ یہ انسانیت کا ''فطری جوہر'' ہے۔ جبکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جس کے تحت خالقِ کائنات فرد کو ''کمال روحانیت'' سے نوازتا ہے۔

قید کیے جانے کے بعد آپ نے ''نعمتِ آزادی'' کی شاعرانہ انداز میں تعریف و تحسین کی اور معروف آتش بیانی سے کام لیتے ہوئے تحریر کیا:

''آزادی! آزادی سب سے بڑی نعمت ہے۔''

پھر اپنے روایتی انداز میں جو قوتیں انسانی آزادی آغازِ انسانیت سے سلب کرنے کی مجرم چلی آ رہی ہیں، نام لیے بغیر اِن الفاظ میں للکارا:

''آہ! آزادی
میں حکومتوں پر لعنت بھیجتا ہوں!
میں غلامی پر لعنت بھیجتا ہوں!
میں زنجیروں میں جکڑنے پر لعنت بھیجتا ہوں!
میں قید خانوں پر لعنت بھیجتا ہوں!
میں مختارِ مطلق ہونے والے پر لعنت بھیجتا ہوں!
المختصر! میں ہر اُس پر جو تمہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا ہے، لعنت بھیجتا ہوں!''

سیاسی آزادی کی تعریف کے باوجود شخصی آزادی کے بارے میں آپ کا رویہ اور نظریہ انتہائی شدید اور غیر معتدل رہا۔ آپ امپریلزم، آمریت اور استحصال کے مقابلہ میں بڑی ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹے رہے، اور اُس نام نہاد آزادی کو بڑی سختی سے رد کیا، جس میں ''خوشامد اور لالچ'' کا دخل ہو۔ پھر آپ کی ایسی قید جس میں آپ کی Directed Democracy کا دخل

Marfat.com

تھا۔ آپ آزادی حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی لازمی سمجھتے تھے۔ اِس بارے میں اِس کے کچھ قبل ازیں ضروری تقاضے ہیں۔ جس میں سیاسی پختگی کا شعور ہونا ضروری ہے۔ جس میں لینن جیسی لیڈرشپ ہونی چاہیے۔ معاشرہ کو ''جہالت اور ناانصافی'' سے آزاد کرانے کے لیے آپ کو ایسی لیڈرشپ اُبھرنے کی اُمید تھی، جو انقلاب لانے کے لیے معاشرہ اور ماحول کو صاف ستھرا کردے۔ عام اِسلامی روایات کے مطابق آپ بھی جزوی آزادی کے قائل تھے۔ جبکہ اِسلام کا ''فلاح'' یا ہر طرح کی غیر اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہونا ہے۔

آپ کی مابعد تحریریں تمام تر سرمایہ پرستی Capitalism اور ''بورژوا'' Bouryesis کی نفی میں ہیں یا اُن کا ساتھ دیتی ہیں۔ کیپٹلزم کی مذمت آپ اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''کیپٹلزم نہ صرف نامنصفانہ، غیر مساوانہ اور استحصالی ہے بلکہ اخلاق سے عاری اتنا ظالمانہ ہے، جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کی تمام اقدار کو تباہ کرتا ہے۔''

آپ کی رائے میں کیپٹلزم ایک ایسا شیطانی نظام ہے، جو انسان کی راہ میں خدا ترسی کی اقدار میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جبکہ جو نظام انسان کو انصاف اور مساوات مہیا کرسکتا ہے، وہ سوشلزم ہے۔ اُن کے نزدیک ''سوشلزم'' ایسا مساویانہ نظام ہے کہ اگر اِس نظام کے حامی ربِ کریم کی وحدانیت اور خالقِ کائنات ہونا تسلیم کرلیں، تو یہ اسلام کے قریب عالمی نظام ہے کہ اِس میں استحصال، بلاقید ذاتی جائداد اور سرمایہ کی ملکیت اور جراثیمی ''بورژوا'' کے اجزا شامل نہیں۔ آپ کا کہنا تھا کہ ''اخلاقی زوال اور بدعنوانیوں'' کے اِس سرمایہ دارانہ دور میں جس میں عُریانیت کے میگزین، بے حیائی کی فلمیں، نائٹ کلبس، فحاشی اور بدکاری کے اڈے، غیر اخلاقی ٹی وی پروگرام اپنا اپنا شیطانی کردار ادا کررہے ہیں۔ اِس میں وہ اُس ذاتی ملکیت کی حمایت کریں گے، جس میں اِن خرابیوں کا خاتمہ اور معتدل معاشرہ ہو۔ علی شریعتی جو سوشلسٹ اقتصادی نظام لانا چاہتے تھے اور جس کو وہ کو مثالی معاشرہ قرار دیتے تھے، وہ ایسا رُوحانی اقدار کے ساتھ دین کی ماتحتی میں

Marfat.com

نظامِ حکومت تھا، جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات پر قوی ایمان ہو۔

ہجرت اور وفات

۱۶ر مئی ۱۹۷۷ء کو آپ انتہائی خاموشی سے ایران سے غائب چلے گئے۔ جس کا حکومت کو علم نہ ہو سکا۔ جبکہ حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ ملک سے باہر جائیں، کچھ دن بعد جب ''خفیہ پولیس'' نے نوٹس لیا اور محسوس کیا، کہ آپ لاپتہ ہیں۔ تو ''خفیہ پولیس'' SAVAK نے ۶ر جون ۱۹۷۷ء کو سرکاری طور پر وزارتِ خارجہ سے گزارش کی کہ ایک شخص ''محمد علی مازنیانی'' ''یہ آپ کا اصل نام تھا'' جو ۱۶ر مئی ۱۹۷۷ء کے بعد سے غائب ہے۔ اُسے ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن اِس کے ساتھ یہ خیال کر رہی تھی، کہ آپ ملک سے باہر جا چکے ہیں۔ لہٰذا ۸ر جون ۱۹۷۷ء اپنی غیر ملکی ایجنسیوں کو یہ ہدایت نامہ جاری کیا کہ آپ غیر قانونی طور پر ایران سے فرار ہو چکے ہیں۔ لہٰذا وہ جہاں کہیں بھی ہوں، اُن پر کڑی نظر رکھ کر حکومت کو آگاہ کریں۔

اِس دوران آپ کی اہلیہ ''پوران'' نے آپ کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دی۔ جبکہ اِس دوران حکومت کے اہل کاروں نے مشہد ایرپورٹ کی انتظامیہ کو تحریر کیا، کہ وہ تحقیق کر کے حکومت کو مطلع کرے کہ آپ ایران کی ایئرپورٹ سے کسی اور نام سے فرار تو نہیں ہو گئے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر شریعتی ایران سے غائب ہونے کے بعد براستہ برسلز لنڈن پہنچ گئے تھے، جس کا آپ کی اہلیہ پُوران کو علم تھا اور اُس نے اپنی تین بیٹیوں سُوسن، سارہ اور مونا کے ساتھ ۱۸ر جون کو آپ سے لنڈن جا ملنا تھا، لیکن اِن حالات میں حکومت کہاں آپ کو باہر جانے کی اجازت دے سکتی تھی، البتہ سُوسن اور سارہ کو اجازت دے دی، لیکن پُوران اور چھ سالہ مونا کو باہر جانے سے روک دیا۔ پُوران نے فوری طور پر آپ سے رابطہ کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اِس کے بعد آپ پر جو کچھ گزری، اُس کے بارے میں قیاس آرائیوں سے کام لیا جا

Marfat.com

سکتا ہے۔ یقیناً وہ تمام تلخ یادیں آپ کو یاد ہوں گی، جو پیرس سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں ایران واپس ہونے کے بعد گزریں۔ آپ کو خوب یاد ہوگا کہ اپنے آپ کو حکومتی خفیہ پولیس کے حوالہ کرنے کے لیے حکومت نے آپ کے والد محترم اور بہنوئی کو گرفتار اور دو دوستوں کو یرغمال بنایا تھا اور اُن پر کیا کچھ سختیاں گزاریں، جس کے نتیجہ میں حکومتی منصوبہ کامیاب ہوگیا۔

اب ڈاکٹر شریعتی کے لیے یہ بات شک وشبہ سے بالاتر تھی کہ حکومت آپ کی ایران واپسی کے لیے ہر حربہ استعمال کرے گی۔ جس میں آپ کی اہلیہ کے خلاف اقدامات تک شامل تھے، جنہیں ایران سے باہر جانے کی اجازت نہ دیا جانا سب سے بڑا حربہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ اِس حربہ سے آپ ایران واپس ہوسکیں۔ پُوران کو نہ صرف ایران سے باہر جانے کی اجازت نہ دی گئی، بلکہ اُن پر ایسا ناقابلِ بیان اذیت ناک دباؤ بڑھا دیا گیا، کہ وہ آپ کو ایران واپس آنے پر مجبور کریں، جس کے بعد آپ ایران اُسی بدنامِ زمانہ ''کومیتہ'' Komiteh جیل میں بھیج کر بادشاہ کو ذہنی سکون حاصل ہوگا۔ جبکہ خود آپ اپنی تمام ذہنی اور جسمانی توانائیاں کھو بیٹھیں گے۔

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر شریعتی کی دو بیٹیوں سُوسن اور سارہ کو ۱۸؍جون ۱۹۷۷ء کو ملک سے باہر روانہ ہونے کی اجازت دے دی گئی، جبکہ آپ لنڈن کی مشہور ہیتھرو Heithrow ایرپورٹ پر اُن کو اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے پہلے سے ایرپورٹ پہنچ چکے تھے، چنانچہ بیٹیوں کے ایرپورٹ پہنچنے پر آپ نے اُن دونوں کو اپنے ساتھ لیا، اور ساؤتھیمپٹن Southampton شہر اپنی قیام گاہ پر ساتھ لے گئے، جہاں آپ مقیم کیے گئے، لیکن اگلے ہی روز ۱۹؍جون ۱۹۷۷ء آپ اپنے کمرہ میں انتہائی پُر اِسرار انداز میں مردہ پائے گئے جب آپ کی عمر صرف ۴۴ سال تھی اور خیال یہی کیا جاتا ہے کہ آپ کی اِس ناگہانی شہادت کے پس پردہ ایران کی خفیہ پولیس کا ہاتھ ہے۔

اِس ناگہانی موت سے آپ کے ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجانے کے نتیجہ میں بادشاہ نے بڑی خوشی منائی۔ جبکہ ایران کی نوجوان نسل اور اِسلامی تحریک کے لیے بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اِس ناگہانی موت سے دو سوال اُبھرتے ہیں۔ اگر موت سے ایک روز قبل ۱۸؍جون ۱۹۷۷ء کو

Marfat.com

حکومت کا آپ کی اہلیہ پُوران سے ناروا سلوک سامنے رکھا جائے تو ایران کی حکومت اِس سانحہ کی مجرم خیال کی جا سکتی ہے۔ لیکن اِس کے مقابل ۲۱ / جون ۱۹۷۷ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے جو رپورٹ شائع کی گئی، اُس میں آپ کی موت آپ کی حرکتِ قلب بند ہونے کا نتیجہ قرار دی گئی ہے۔

(نوٹ: ...... یہ امر ثابت ہے کہ اگر اِس سانحی موت میں ایرانی حکومت ملوث نہیں تھی، تو حکومت کے ناقابلِ برداشت اذیت ناک رویہ نے آپ کو اتنا ذہنی طور پر ناقابلِ برداشت بنا چھوڑا کہ آپ اِس کی تاب نہ لا سکے اور بڑے باعزت طور پر اللہ کو پیارے ہو کر شہادت کی حیاتِ جاودانی سے سرفراز ہو گئے، جیسا کہ آپ کی تمام داستان ظاہر کرتی ہے کہ آپ نے شیعہ سنی کی تفریق کے بغیر صحیح معنوں میں ہر طرح کے خطرات مول لیتے ہوئے یومِ آخرت کی عملاً جوابدہی کی منکر، بدزبان مسلمان آمریت، بادشاہت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے عالمی تحریکِ احیائے اسلام میں بطور ایک مفکر اور لیڈر عالمی سطح پر ایک عظیم مثال قائم کی۔

ڈاکٹر علی شریعتی کی تدفین اور آئندہ مسلمانوں کے لیے ایک سبق

۲۶ / جون ۱۹۷۷ء کے روز آپ کی میت بذریعہ ہوائی جہاز دمشق لائی گئی، جہاں آپ کو سید الشہدا امام حسینؑ کی صاحبزادی حضرت زینبؑ کی قبر کے قریب دفن کیے جانے کی سعادت حاصل ہوئی، جو آپ کی تحریکِ احیائے اسلام کے حوالہ سے عظیم صحیح مقام ہے۔ جب بادشاہت کے خلاف آپ کی محاذ آرائی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا، کہ خیر کے ہر انقلاب کے دو پہلو ہوتے ہیں:

۱) جان کی قربانی

۲) خیر کا پیغام

ان دونوں پہلوؤں میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی شخصیت انسانی تاریخ کا

Marfat.com

بہترین نمونہ ہے۔ کہ ایک طرف آپ کی شہادت جانی قربانی کی سب سے بڑی مثال ہے اور شہادت آپ کا انقلابی پیغام ہے، جو آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ پر چھوڑ دیا۔ لیکن آپ چونکہ مبلّغہ نہ تھیں۔ چنانچہ تاریخ آپ کا پیغام بھلا بیٹھی۔ جبکہ علی شریعتی نے اپنی جانی قربانی اور بطور ایک اُستاد اور مبلغ دونوں یادیں تازہ کردیں۔

آپ کی تعزیتی تقریبات بیروت شہر کے ہائی سکول عملیات ہائی سکول میں ہوئیں۔ یہ تقریب جسے آزادی کی عالمی تحریکوں کی سرکردہ شخصیات کی شرکت کہا جاسکتا ہے، پی ایل او فلسطین کے سربراہ یاسر عرفات نے کہا:

> ''علی شریعتی: صرف ایران کی تحریک آزادی کے رہنما نہ تھے اور نہ ہی آپ کی شخصیت کو ایک خاص علاقہ تک محدود کیا جاسکتا ہے، آپ ایک فلسطینی، ایک لبنانی، ایک عرب اور اِس سے بڑھ کر ایک بین الاقوامی شخصیت تھے۔''

جن مشہور عالمی شخصیتوں نے اِس تعزیتی تقریب میں شرکت کی۔ سب نے یاسر عرفات کے تعزیتی الفاظ کی تائید کی۔

جن عالمی اِسلامی تحریکوں کے نمائندوں نے اِس میں شرکت کی، بعض کے نام یہ ہیں:

۱) حرکت المحرومین، لبنان

۲) نشاۃ ثانیہ AMAL لبنان۔

۳) عوامی تحریکِ آزادی، اریٹریا (افریقہ)

۴) تحریک آزادی، ایران

۵) مذہبی صف آرا علماء ایران

۶) تنظیم ایرانی مسلم طلبائے، یورپ، امریکہ اور کینیڈا

۷) نیشنل لبریشن موومنٹ، زنجبار (افریقہ)

۸) نیشنل لبریشن موومنٹ، زمبابوے (افریقہ)

۹) نیشنل فریڈم موومنٹ، جنوبی فلپائن

Marfat.com

آپ کی حادثاتی ناگہانی موت جو ایران سے باہر اچانک واقع ہوئی۔ جیسا کہ مختصراً تعزیتی تقریب میں مندرجہ بالا مختلف ممالک کی آزادی کی تحریکوں کے علاوہ خود ''دمشق'' کے ہزار ہا افراد کی شرکت ظاہر کرتی ہے، بادشاہت کی بنیادیں اتنی بُری طرح سے ہلا دیں، کہ ۳۷ سال قبل اُس نے اپنے آپ کو ڈھائی ہزار سال قبل کی ایرانی بادشاہت کا وارث قرار دیا تھا۔ آپ کی سانحی وفات کے بعد سات ماہ کا عرصہ اپنی بادشاہت قائم نہ رکھ سکا اور ۱۶ ر جنوری ۱۹۷۸ء کو انتہائی ذِلت کے ساتھ اپنا بوریا بستر باندھ کر جلاوطن ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ اُس کے سرپرست امریکہ کو اُس سے زیادہ ذِلت اور رُسوائی کا سامنا کرنا پڑا، کہ اُس کی رخصتی کے بعد امریکہ کا اُس کو پناہ دینے کی وجہ سے آیت اللہ خمینی کی حکومت نے ایران میں امریکی سفارت خانہ کے ۶۶ اہلکاروں کو یرغمال بنالیا اِن میں سے ۱۴ افراد کو چند دن بعد رہا کر دیا گیا۔ باقی ۵۲ افراد کو ایک سال سے زائد عرصہ (۴۴۴ روز) یرغمال بنائے رکھا۔

ایران کو بادشاہت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ۱۹۶۴ء میں پیرس سے واپسی کے بعد نوجوان نسل میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی جدوجہد کرنے کی وجہ سے سرکاری علماء کی حمایت کے ساتھ بادشاہ کے احکامات کی تعمیل، ایران کی خفیہ پولیس کا مسلسل تیرہ سال قید و بند کی سلاسل میں جکڑے رکھنا، ہر طرح کا ظلم و تشدد روا رکھنا، حتیٰ کہ آپ کے والدِ محترم اور دیگر اقربا کو مصائب کا نشانہ بنائے رکھنے کے لیے نتیجہ میں لازم امر ہے، کہ آپ انتہائی دل برداشتہ ہو کر اپنے اہل و عیال کو پیچھے چھوڑ کر ایران سے باہر ہجرت کر جائیں۔ لیکن مغرور و متکبر حکمرانوں کو یہ کہاں لحاظ ہوتا ہے، کہ کہیں تو ذرا نرمی برتیں۔ حالانکہ جب آپ ملک سے ہجرت کر چکے تھے، بادشاہت کے لیے کیا خطرہ بن سکتے تھے۔ البتہ عوام میں جو سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ اُس کے لیے لازم تھا، کہ وہ گھر کی خبر لے، نہ کہ ایک مردِ درویش کی اہلیہ کو اپنے شوہر کے پاس نہ جانے دے، جس کے نتیجہ یہ سانحہ پیش آیا۔ وفات کے بعد مزید جو سرگرمیاں ظہور میں آئیں۔ آپ کی وفات نے سیاسی سرگرمیوں میں ہل چل مچادی۔ جن میں ''اِسلامک ایسوسی ایشن آف سٹوڈنٹس'' اور بیرون ملک ''یونین آف اِسلامک ایسوسی آف

سٹوڈنٹس''، ''یو۔ آئی۔ اے۔ ایس'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ یہ چہلم کی تعزیتی تقریب جس کا انتظام جناب علی شریعتی کے خاندان اور احباب نے کیا تھا۔ اِن دونوں تنظیموں کے بھرپور تعاون نے اِس تقریب کو شاہ مخالف بڑے واقعہ کی شکل دے دی۔ جس میں دُنیا بھر کے لوگوں نے شرکت کی اور بڑے بڑے جلوس نکالے گئے جن میں بڑی تعداد میں جناب علی شریعتی، امام خمینی، ڈاکٹر مصدق، طالیقانی اور علامہ منتظری کی بڑی بڑی تصاویر لہرا رہی تھیں۔ جبکہ یہ تقریبات تحریک احیائے اسلام کی معروف شیعی شخصیت جناب موسیٰ الصدر شہید جن پر ایک باب اِس تصنیف کا حصہ ہے کہ رہائش گاہ پر منعقد ہوئیں۔ جن میں صادق طباطبائی، قطب زادہ، کامران، قراضی، دُعائی اور علامہ محمد منتظری نے شرکت کی اور اِن اصحاب نے فیصلہ جاری کیا، کہ جناب علی شریعتی نے شہنشاہت کے خلاف جس عملی جدوجہد کا آغاز کیا تھا، اُسے جاری رکھا جائے گا۔ جس کا اوّلین سلسلہ پیرس میں ایرانی طلبا کا بھوک ہڑتال کا فیصلہ تھا، کہ ایران میں جو سیاسی قیدی ہیں، اُن سب کو فوراً رہا کیا جائے۔ ہڑتال کے اِس فیصلہ نے نہ صرف فرانس کے پریس میں جگہ پائی، بلکہ ایران کے اخبارات نے بھی فرانس کے اخبارات کے حوالہ سے اِسے خوب پھیلایا۔ جبکہ تہران کے نزدیک ''رے'' RAY کے مشہور قدیم شہر کی مسجد ''حرارتِ عبدالعزیز'' میں یکصد بیس افراد کے ایک گروہ نے بادشاہ کے خلاف مظاہرہ کیا۔

۱۰ ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کے روز تہران کے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ Goethe Institute میں ایران بھر کے دانشوروں، علمی شخصیتوں، شعرا، ادیبوں نے دس روزہ شب و روز محفلوں کا آغاز کیا۔ جن کا اصل نشانہ اپنے اپنے انداز میں حکومت کی ''سنسر شپ، آزادیٔ تحریر و تقریر پر پابندیاں اور مظالم'' تھیں۔ جو بادشاہت کے خلاف پہلا کامیاب حملہ تھا۔ اِس محفل کی پانچویں شب جناب باقر موسیٰ نے نام لے لے کر اُن ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں کو حکومت کے مظالم کا نشانہ بن کر اموات کا ذکر کیا، جو گزشتہ نصف صدی کے دوران اپنی پچاس سال سے زائد عمر نہ پا سکے تھے۔ جبکہ

Marfat.com

اُن کا مقصد ایران میں آزادیٔ تحریر و تقریر کا مطالبہ تھا۔ اِس عظیم اجتماع سے آپ نے جناب علی شریعتی، نمایُوشیج Nimayousheey، صدیقِ ہدایت، صمد بہرانجی اور جلال احمد جیسے معروف شعرا، ادیبوں اور اہلِ قلم کی یاد میں ایک منٹ خاموشی کی گزارش کی۔ اگر یہ کہا جائے، کہ دراصل یہ خصوصی محفل جناب علی شریعتی کی یاد میں تھی، جس نے آزادی کے دیگر متوالوں کی یادیں بھی تازہ کر دیں تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا، اور اِس محفل کے محض تین ماہ بعد ایران میں بادشاہت کا اِس انداز سے جنازہ اُٹھ گیا، کہ اُس پر کسی کا آنسو بہانا تو کجا، عالمی امپریلزم سمیت اُس کو پناہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ جبکہ اِس کی قریباً پچاس سالہ شہنشاہیت بلکہ ہمیشہ کے لیے ایران میں خاندانی بادشاہت ختم کر کے باشعور عوامی جمہوری انقلاب لانے کا سہرا جس عظیم شخصیت کے سر باندھے جانے کا اعزاز بخشا جا سکتا ہے وہ بلاشک وشبہ جناب علی شریعَتی کی ہے، اور آپ کے مقبولِ عوام نعرے ہیں، جنہوں نے سینکڑوں، ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ایران بھر میں اور ایران سے باہر آپ کے پیغام جس میں آزادی، انقلاب کی پکار، خوداعتمادی، ایمان کی رُوح اور امن تھا، پھیلا دیا۔ آپ نے کبھی اپنا شیعہ ہونے سے انکار نہیں کیا۔ لیکن جس شیعیت کے آپ مبلّغ اور پیروکار تھے، وہ عوام میں بالخصوص نوجوانوں میں انقلابی رُوح پیدا کرنا تھا۔ بالخصوص اِسلام سے دُور اُن نوجوانوں کے دِلوں میں اِسلام اور اِسلامی نظریہ بیدار کرنا تھا، جو پیشہ ور علما جن کی ظاہری زندگی میں اِسلام اور عملی زندگی میں بادشاہوں کی خوشامد اور خوشہ چینی کا مشاہدہ تھا، اُن کی وجہ سے اِسلام سے دُور تھے۔ یہ آپ کی پیرس سے واپسی کے بعد تیرہ سالہ بحیثیت ایک ٹیچر، ایک مفکر، ایک سیاستدان، ایک ماہر اقتصادیات، شیعہ سنی اختلافات سے دُور بادشاہت کے خلاف نمونہ کی عملی زندگی تھی، جس نے اپنی وفات سے صرف سات ماہ قبل ایران میں انقلاب کی راہ ہموار کر دی تھی، اگر آپ ایران سے باہر نہ بھی جاتے، تب بھی اُس تاریخ کو انقلاب مقدر ہو چکا تھا۔ لیکن مشیتِ الٰہی کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جُرأت نہیں، کہ انقلاب کا سہرا علی شریعتی کی بجائے امام خمینی کے سر بندھا، کہ بادشاہ کا ۱۶ر

Marfat.com

جنوری ۱۹۷۸ء کو تخت چھوڑنے اور ملک چھوڑنے سے قبل علی شریعتی کی ملک گیر انقلابی مہم کے نتیجہ میں ۱۰/۱۱ دسمبر کے روز جو یومِ عاشورہ تھے۔ لاکھوں افراد بادشاہ کے خلاف باہر نکل آئے تھے، جبکہ امام خمینی ملک سے باہر تھے اور علی شریعتی وفات پا چکے تھے۔ اگر آپ زندہ ہوتے، تو عین ممکن ہے، دونوں رہنماؤں کے پیروکاروں کے درمیان مخاصمت پیدا ہوتی کہ حکمران کون ہو، البتہ اِس کتاب میں دونوں ہم عصر شیعی لیڈروں کے حالاتِ زندگی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے، کہ جناب علی شریعتی شیعہ سنی فکر سے بالاتر تھے، جبکہ آیت اللہ خمینی غیر واضح شیعہ مسلک کے پیروکار۔ البتہ بعد از انقلاب تمام انقلابی عوام اور ایرانی علماء نے آپ کی ذات کو ''قائد انقلاب'' قرار دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

اِس کے ساتھ جناب علی شریعتی کے بارے میں ''تحریک احیائے اسلام کے درخشندہ ستارے'' کی اہم شخصیت پر مضمون ختم ہے۔ اُن کی عظمت کی سب سے بڑی وجہ شیعہ سنی افتراق سے بالاتر ہونا ہے، جبکہ اِس مضمون کی تیاری جناب علی رہنما مضمون نگار کے مطابق جناب علی شریعتی کی بیوہ پوران اور آپ کے بچوں احسان شریعتی اور سارہ شریعتی نے خاص تعاون کیا ہے، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس عظیم شخصیت کو اپنے خاص جوارِ رحمت میں جگہ دے کہ جب ساٹھ کے قریب اِسلامی ممالک کے حکمران مسلمان کہلانے کے دعوے کے ساتھ بلا استثناء اِسلام سے خوف زدہ اور اِسلام دُشمن امریکہ کی جھولی میں پڑے ہیں۔ یہ صرف ایران ہے جو امریکہ اور تمام کفار ممالک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا ہے۔

Marfat.com

ممتاز دانشور، صحافی اور مصنف جناب شفیق الاسلام فاروقی کی

ایک اور معلومات افروز، ولولہ انگیز کتاب

مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ

آج ہی آرڈر دیں اور گھر بیٹھے حاصل کریں!

اذان سحر پبلی کیشنز

منصورہ. ملتان روڈ لاہور

فون 042-35435667,0321-4708024

Marfat.com

تحریک احیائے اسلام کے آٹھ درخشندہ ستارے

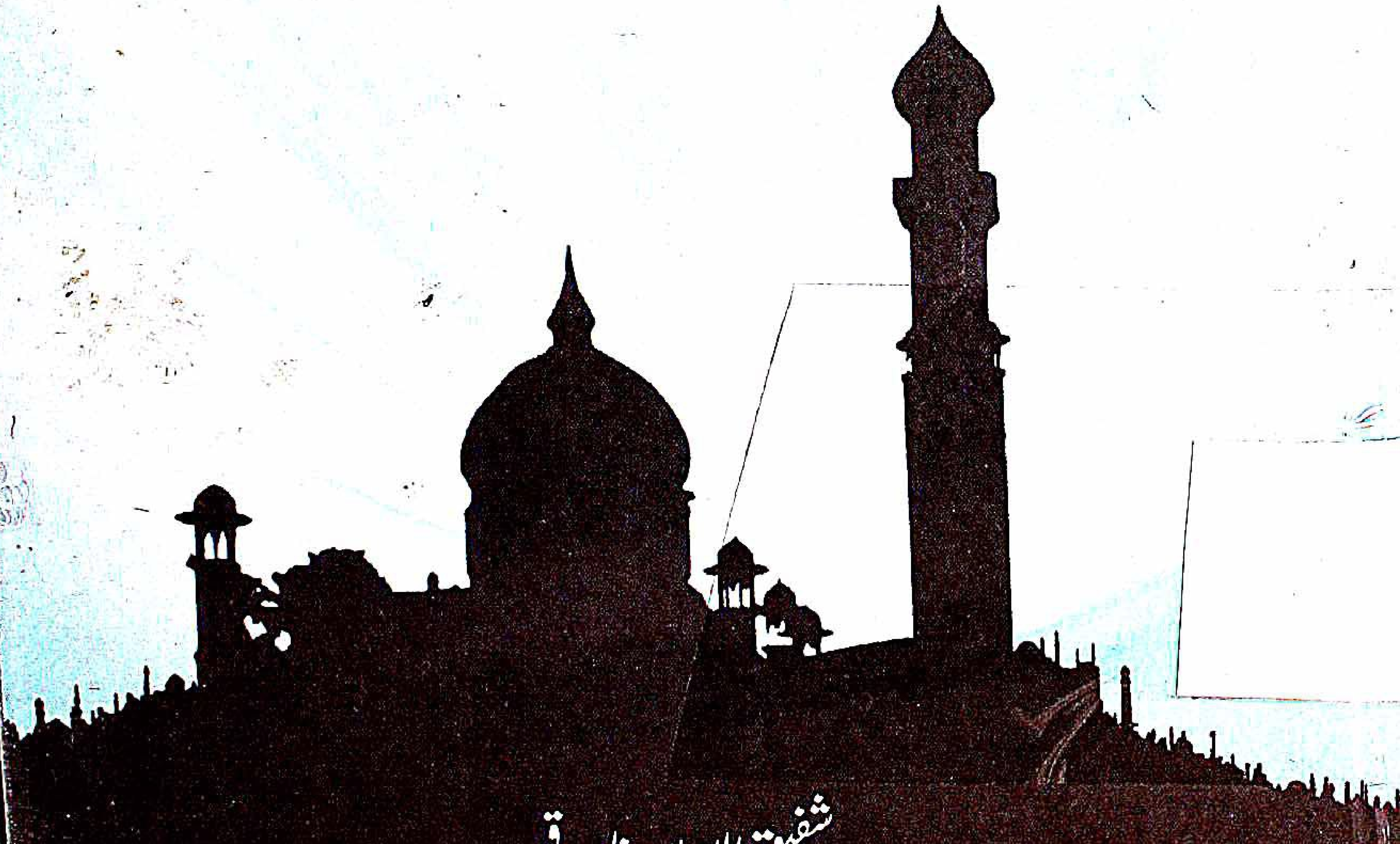

شفیق الاسلام فاروقی

Marfat.com